قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جون 2025 قیمت ₹25

ماھنامہ

اُردو دُنیَا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

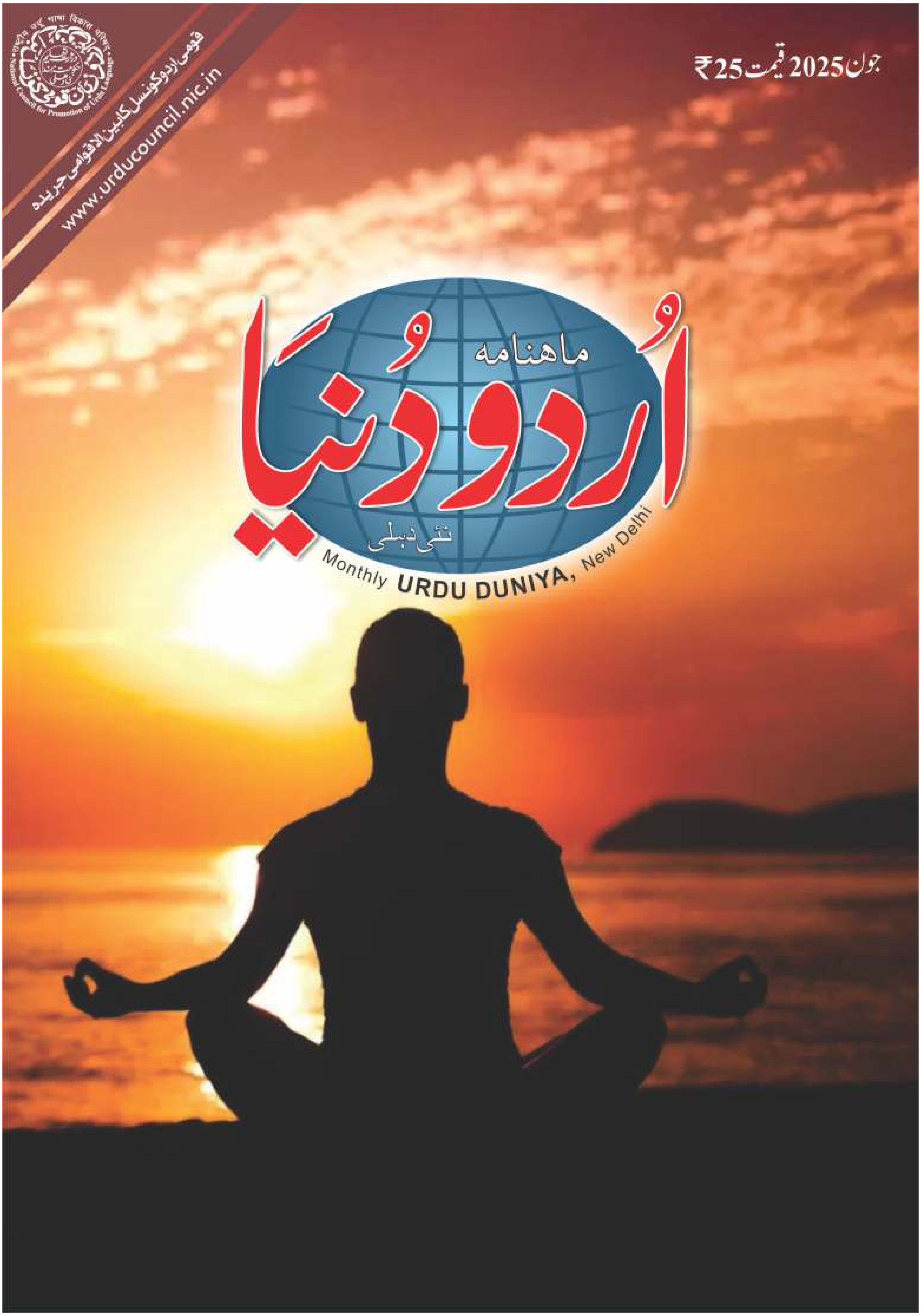

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

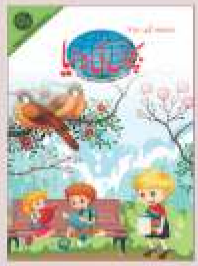
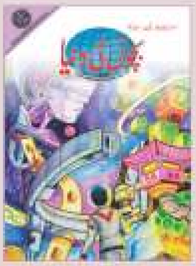

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے   سالانہ: 145 روپے

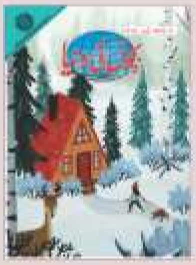

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِ تعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:27، شمارہ:6، جون 2025

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : شاداب شمیم، ثاقب فریدی، فیضان الحق

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
سالاسار امیجنگ سسٹمس
A-97، سیکٹر 58، نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے سالانہ -/240 روپے

Total Pages:100

• اس شمارے سے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPULاور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
• ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔ 500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

• ہماری بات 4

خطوط

• ربط والتفات — قارئین کے خطوط 5

زبان و تعلیم

• سماجی رویے اور معذور طلبا: ایک نئے نقطۂ نظر کی ضرورت — محمد جہانگیر عالم 7
• باہمی تدریسی طریقۂ کار — امتیاز احمد 11

یوگا: خصوصی پیشکش

• دائمی امراض میں یوگا کی افادیت — نازش احتشام اعظمی 14

• یوگ: شعور کی تہہ میں اترتا سکون — رئیس احمد 18
• یوگا کے روحانی فوائد — عبدالعلیم 23

شخصیات

• پروفیسر محمود الٰہی زخمی گورکھپوری حیات و خدمات — عباس رضا نیر 25
• اردو اور فارسی کے استاد شاعر کاہش جونپوری — محمد صادق اختر 30
• اختر الایمان کی چند اہم نظموں کا فکری و فنی تجزیہ — محمد وسیم رضا 35
• آسمان علم و ادب کا درخشندہ ستارہ کچھمی نرائن شفیق — محمد آصف 38
• بلراج مین را بطور افسانہ نگار — نثار احمد 41

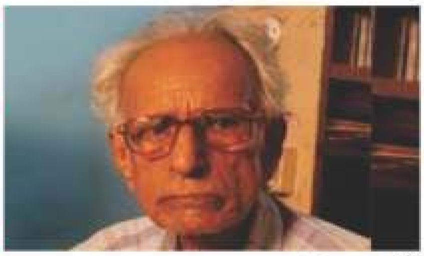

• شکیل الرحمن کی نظر میں پریم چند کے المیہ کردار — مناظر ارشد 44

ادب زاویے اور جہات

• بنارس کے غیر مسلم اردو شعرا — رفعت جمال 46
• اردو کے غیر مسلم مثنوی نگار — محمد شارب 51
• اردو ناولوں میں منفی کرداروں کی اہمیت و افادیت — محمد ابرار 54
• مصنوعی ذہانت (AI) اور اردو امکانات اور جدید رجحانات — راشد قادری 57

چراغ محبت

• تصوف اور بھکتی: ایک ناتمام مطالعہ — عبدالحی 60

نفسیات

• انسانی شخصیت کے تشکیلی عناصر — احسان حسن 62

عالمی ادبیات

• تالستائے بحیثیت انسان اور فنکار — محمد یٰسین 65

خصوصی گفتگو

• داستانوں نے اپنی بقا کے لیے اسٹیج کا رخ کیا: اسلم جمشید پوری — ارشاد سیانوی 67

نیا آسمان نئے ستارے

• بچوں کی تعلیم و تربیت میں والدین کا کردار — محمد وقار شبیر 70
• مولانا رومی کی جمالیات اور شکیل الرحمن — امانت اللہ 74

کتابوں کی دنیا

• تعارف و تبصرہ — ادارہ 77

خبر نامہ

• اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 86

ہماری بات

ہندوستان میں یوگا کی روایت کئی ہزار سال پرانی ہے۔ اس کا ذکر وید، بھگود گیتا، اپنشد وغیرہ میں بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ عظیم شخصیات میں گوتم بدھ، مہاویر، مہارشی پتنجلی، آدی شنکر آچاریہ، سوامی وویکا نند کی تعلیمات بھی یوگ کی اہمیت وافادیت کو بیان کرتی ہیں۔ البتہ قدیم ہندوستانی روایت میں یوگا کی صورت مختلف تھی لیکن رفتہ رفتہ اس کے اندر تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں۔ قدیم زمانے میں یوگا کا تعلق روحانی اور جسمانی دونوں قسم کی اصلاح سے تھا لیکن وقت بدلنے کے ساتھ یوگ محض جسمانی ورزش کے طور پر معروف ہوگیا جو کہ یوگ کی ایک غیر مکمل صورت ہے۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ یوگ مخصوص آسنوں کو وقت پر انجام دینے کا نام ہے۔ جب کہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔ یوگا اپنی اصل میں جسمانی اور ذہنی دونوں طرح کے سکون اور صحت کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ان دونوں پہلوؤں کو ذہن میں رکھتے ہوئے غور وفکر نہ کیا جائے اس کی معنویت کو نہیں سمجھا جاسکتا۔

یوگا سے حاصل ہونے والے فوائد کا اگر اجمالی جائزہ لیا جائے تو اس میں کئی طرح کے فوائد نظر آتے ہیں۔ یوگا ہمارے جسم کو چستی اور پھرتی عطا کرتا ہے۔ ہمارے ذہن کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور غور وفکر کی طاقت دیتا ہے۔ پابندی سے یوگا کرنے والا مشکل مسائل کو آسانی سے حل کرسکتا ہے۔ یوگا ہمارے معمول کو بہتر بناتا اور روزمرہ کے کاموں میں بہتری پیدا کرتا ہے۔ اس کے ذریعے مختلف بیماریوں سے بچا جاسکتا ہے۔ یوگا محض ایک ورزش نہیں بلکہ ایک طرز حیات ہے۔ اس کی معنویت کو عام کرنے کے لیے مختلف اسکولوں کالجوں کا قیام بھی عمل میں آچکا ہے۔ یوگ ایک ذریعہ معاش کے طور پر بھی اپنی شناخت مستحکم کر رہا ہے۔ یوگ کے ماہرین پابندی کے ساتھ کلاس لیتے ہیں، جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شامل ہوکر استفادہ کر رہے ہیں۔ یوگ کے ذریعے انسانی ہمدردی اخوت اور بھائی چارے کے جذبات کو عام کرنے کی بھی کوشش کی جارہی ہے۔ ملک کے باشندوں کو صحت مند رکھنے اور وکست بھارت کے مشن کو کامیاب بنانے میں یوگ اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ یوگا کی اہمیت صرف ہندوستان تک محدود نہیں بلکہ پوری دنیا میں اسے تسلیم کیا جاچکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 2014 میں یونائٹڈ اسٹیٹ کی جانب سے اعلان کے بعد 21 جون کو عالمی یوم یوگا کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس دن مختلف کالجوں، یونیورسٹیوں، دفاتر اور کیمپس میں یوگ کے متعلق پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ آسن سکھائے جاتے ہیں اور طرز زندگی میں بہتری لانے کی تلقین کی جاتی ہے۔ حکومت ہند یوگ کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس دن کو خاص اہمیت دیتی ہے۔

یوگا سے متعلق مختلف علوم وافکار کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کا تعلق کسی خطے، مذہب، یا ذات سے نہیں، بلکہ یوگ سب کے لیے ہے اور سبھی اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ یوگا سے متعلق مواد تقریباً ہر ترقی یافتہ زبان میں موجود ہے اور جس میں نہیں ہے اس میں تیزی سے منتقل بھی کیا جارہا ہے۔ اردو زبان میں بھی کثیر تعداد میں یوگا پر کتابیں اور مضامین شائع ہوچکے ہیں، جو اردو داں طبقے کو یوگ کی اہمیت و افادیت سے روشناس کرارہے ہیں۔ ہندوستان کے معروف صوفی شاہ محمد غوث گوالیاری نے 'بحرالحیات' کے نام سے ایک کتاب تحریر کی تھی۔ یہ سنسکرت کی کتاب 'امرت کنڈ' کا فارسی ترجمہ تھا۔ اس کتاب میں یوگا اور مراقبے سے متعلق بہت ساری اہم تفصیلات درج ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ 'اکسیر حیات' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر برج بھوشن گوئل کی 'قدرتی صحت اور یوگ'، ڈاکٹر کے ایس جوشی کی 'یوگا روزمرہ کی زندگی میں'، ہاورڈ کینٹ کی کتاب کا ترجمہ 'یوگا بنیادی گائڈ'، لوی لیڈل کی کتاب کا ترجمہ 'آسان یوگا' بہت مقبول ومشہور ہیں۔ فارسی جیسی زبان میں بھی یوگا سے متعلق کئی اہم کتابیں تحریر کی گئی ہیں جس سے یوگا کی عالمی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

عالمی یوم یوگا کی مناسبت سے ماہنامہ 'اردو دنیا' کا ایک گوشہ یوگا سے مختص کیا گیا ہے، جس میں شامل مضامین یوگا کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

شمس اقبال

ربط و التفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

اردو دنیا کا مئی 2025 کا شمارہ ملا، ہمیشہ کی طرح سرورق بے حد خوبصورت اور جاذب نظر ہے۔ مشمولات بے حد عمدہ اور مختلف النوع مضامین پر مشتمل ہے۔ اداریے میں ہماری بات کے تحت مادری زبان کی اہمیت وافادیت پر بڑی اہم گفتگو کی گئی ہے، اس کے علاوہ پہلا مضمون بھی مادری زبان میں درس وتدریس کے موضوع پر ہے اس مضمون میں بھی مختلف حوالوں سے اس پر گفتگو کی گئی ہے۔ مادری زبان کی اہمیت ہر زمانے میں مسلم رہی ہے۔ آج بھی جبکہ ہر طرف اور ہر میدان میں ٹیکنالوجی کا دوردورہ ہے۔ مادری زبان میں تعلیم بچوں کی سماجی اور ثقافتی شناخت کو مستحکم کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ابراہیم افسر کا مضمون بابا فرید گنج شکر اور ان کا کلام بھی اچھا مضمون ہے اور صوفیوں اور ولیوں نے اردو زبان کے فروغ میں کتنا اہم کردار ادا کیا ہے اس مضمون کے مطالعے سے اس کی بھی وضاحت ہوجاتی ہے۔ الطاف حسین حالی بہ حیثیت غزل گو محمد مستمر کا محنت سے لکھا ہوا مضمون ہے۔ حالی کا شمار اردو زبان وادب کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو زبان کی آبیاری کی ہے اور تنقید اور سوانح نگاری جیسی اصناف کے موجد بھی ہیں۔ عام طور پر شاعری میں ان کو ایک نظم نگار کے طور پر شہرت ملی ہے لیکن اس مضمون کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے غزل کی زبان و بیان رنگ و آہنگ اور موضوعات کو بھی اپنی نظموں کی طرح نیچرل بنایا ہے۔ ان کی غزلوں میں رنگینی، جمالیاتی اور رومانی فضا کم پائی جاتی ہے مگر کلام کی فصاحت، سلاست اور پختگی اور قادرالکلامی میں کوئی کمی نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ جو چیزیں ان کی نظموں کو اہم بناتی ہیں وہی خصوصیات ان کی غزلوں میں بھی ہیں۔ قسیم اختر کا مضمون اردو غزل میں کرداروں کی اہمیت ایک اچھا مضمون ہوسکتا تھا، عنوان بہت اچھا ہے لیکن مضمون بہت مختصر ہے اس پر اور تفصیلی گفتگو کی جاسکتی تھی۔ خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں میں ہندوستانی تہذیب وثقافت بے حد معلوماتی مضمون ہے۔ خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صوفیانہ عناصر کو اپنے انشائیوں میں براہ راست پیش کرتے ہیں، اس کے علاوہ ان کے انشائیے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بغیر کسی تمہید کے اصل موضوع کو بیان کرنے لگتے ہیں اور عموماً روزمرہ کی کسی مانوس شے کی ظاہری شکل وصورت کا جائزہ لیتے ہوئے اس میں گہری معنویت کا کوئی نہ کوئی پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ ان کے کئی انشائیے بے حد مشہور ہوئے ہیں اور وہ آج بھی اسی ذوق وشوق کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں جس طرح کہ اس وقت پڑھے جاتے تھے۔

اس کے علاوہ 'غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری'، 'خلیل علی خاں اشک'، 'مطالعہ واہی کی چند جہتیں'، 'نجمہ رحمانی: جو ہمیشہ یادوں میں زندہ رہیں گی'، 'مٹی کے اوراق'، 'علمیات کے نظریے اور امیر خسرو کی شاعری میں وطن دوستی وغیرہ بھی اچھے مضامین ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ نئی کتابوں پر تبصرے اور اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں اس رسالے کو دوسرے اہم رسالوں سے ممتاز بناتے ہیں۔ اردو کے ریسرچ اسکالرز کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

محمد شارب: بیتا، دربھنگہ، بہار

ماہنامہ 'اردو دنیا' بابت اپریل 2025 زیر مطالعہ ہے۔ اس شمارے میں حسبِ معمول تخلیقات اور تنقیدی تحریروں کا گلدستہ آباد ہے۔ فوری طور پر پروفیسر ابوبکر عباد کا مضمون 'اردو ناول نگاری میں خواتین کا حصہ' اور ڈاکٹر مخدوم محی الدین کا 'اردو ادب میں تنقیدی نظریات و رجحانات' میری توجہ کا مرکز بنے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر تابش مہدی پر جو تحریریں شامل شمارہ ہیں وہ انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتی ہیں۔

'ناول نگاری میں خواتین کا حصہ' میرے لیے معلوماتی مضمون ہے۔ رشید النسا، صغریٰ ہمایوں، طیبہ بیگم، فخر النسا کے تعلق سے بہت کم لکھا گیا ہے۔ ان کے ادبی کارناموں کو مزید ابھارنے کی ضرورت ہے۔ اس مضمون میں خواتین کے ناولوں میں فنی عناصر پر کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

'اردو ادب میں تنقیدی نظریات و رجحانات' میں تنقید کے مشرقی اور مغربی تناظر کو ضرورت سے زیادہ ابھارا گیا ہے اور اردو میں صرف جمالیاتی اور سائنٹفک تنقید تک آتے آتے مقالہ نگار خاموش ہو گیا ہے۔ واضح رہے کہ جمالیاتی تنقید کے بعد تنقید کے دریا میں بہت پانی بہا ہے لیکن مقالہ میں اس کا ذکر موجود نہیں۔ مقالہ نگار کو معاصر تنقیدی صورتِ حال پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر الطاف انجم: جامعہ کشمیر، سری نگر

رسالہ 'اردو دنیا' کا شمارہ ماہ اپریل 2025 علمی و ادبی مضامین، تحقیقی تحریروں اور ادبی تبصروں سے مزین ہے۔ رسالے کے مشمولات کا صفحہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس شمارے میں متنوع موضوعات کو شامل کیا گیا ہے جو نہ صرف اردو زبان کی ترویج میں معاون ہیں بلکہ قارئین کے ذوقِ مطالعہ کو بھی جلا بخشتے ہیں۔ مشمولات کا تجزیہ کرتے ہوئے چند باتیں قابلِ ذکر ہیں:

اداریہ اور خطوط قارئین سے رابطہ رکھنے کا یہ سلسلہ قابلِ تحسین ہے۔ یہ حصہ نہ صرف ادارے کے خیالات سے روشناس کراتا ہے بلکہ قارئین کی آراء کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ اس شمارے کی اہم خوبی عالمی اردو کانفرنس کی رپورٹ ہے۔ یہ رپورٹ اردو زبان کی عالمی سطح پر پذیرائی اور اس کے فروغ کے لیے ہونے والی کوششوں کی جھلک پیش کرتی ہے جو قابلِ تعریف ہے۔

زبان و تعلیم عنوان کے تحت قومی تعلیمی پالیسی 2020 پر گفتگو ایک اہم اور بروقت اقدام ہے۔ خاص طور محمد معمور علی کی تحریر اردو کے تعلیمی منظرنامے پر روشنی ڈالتی ہے۔ ادب زاویے اور جہات حصے میں مختلف جہتوں سے اردو ادب کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ کیا گیا ہے۔ جیسے ناز قادری نے 'ادب برائے اساطیر اور مہماتی قصوں کا اطلاق' میں اساطیر کی معنویت اور کہانیوں کی روایت پر گہری نظر ڈالی ہے۔ ابوبکر عباد صاحب نے 'اردو ناول نگاری میں خواتین کا حصہ' مضمون میں اردو ناول کی دنیا میں خواتین کے کردار اور ان کے ادبی کام کو سراہا ہے۔

سید اسرار الحق سبیلی نے مضمون 'پنچ تنتر کے اردو تراجم' میں بچوں کے ادب اور اخلاقی کہانیوں کے اردو ترجموں کی روایت کا احاطہ کیا ہے۔ محمد خواجہ محی الدین کا مضمون 'اردو ادب میں تنقیدی نظریات و رجحانات' اردو تنقید کے مختلف نظریاتی تناظرات پر علمی بحث فراہم کرتا ہے۔

شخصیات کے حصے میں اردو ادب، صحافت اور نشریات سے وابستہ معروف

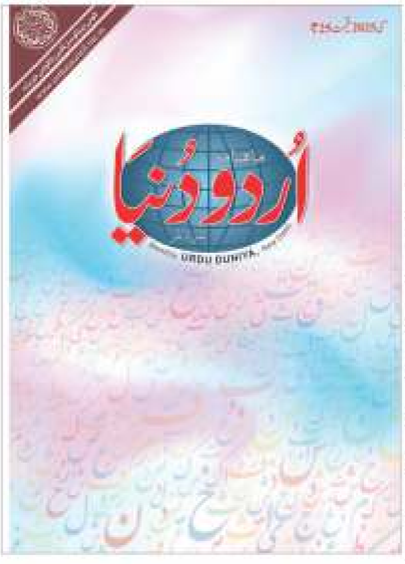

شخصیات کے تعارف اور کارناموں کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ ابوالقاسم محمد فضل رب عرشی ایک عالمِ دین، فارسی کے جید شاعر اور نثر و نظم کے ماہر ادیب تھے، جن کی کتاب ''کارنامۂ عبرت یادگار ہے۔ نندلال نیرنگ سرحدی نے اپنی گراں قدر شاعری سے اردو ادب میں ایک منفرد مقام پیدا کیا۔ آپ مختلف زبانوں کے عالم تھے۔ جگدیش سرسکینہ راز کریلوی نے غزلیہ شاعری میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ آپ نے رسالہ 'سلگتی لکیریں' کے ذریعے صحافت کے میدان میں بھی کامیابی حاصل کی۔ رفعت سروش پر مضمون اردو ریڈیو نشریات کی تاریخ اور اس کی آوازوں کو زندہ کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ یہ تمام شخصیات اردو ادب کی تابندہ روایات کی امین ہیں۔

کتاب دریچہ کے تحت رفیع الدین ناصر کا مضمون 'جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا' ادبی ذوق اور ذاتی مطالعے کی جھلک دیتا ہے جو قارئین کو نئی کتابوں کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ اس مضمون کے ذریعے ریاست مہاراشٹر مراٹھواڑہ کے مصنفین کی تصانیف سے روشناس کرایا گیا ہے۔ رسالے کے یادرفتگاں سیکشن مرحوم اہلِ قلم کے لیے ایک عالمی خراج ہے۔ منور حسن کمال اور ابوالبشر نے ڈاکٹر تابش مہدی پر بیش قیمتی مضامین تحریر کر کے ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کا بیان احسن طریقے سے کیا ہے۔ عبدالرحمٰن فیصل نے پروفیسر انور ظہیر انصاری کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

خصوصی گفتگو کے تحت غلام حیدر نقوی سے گفتگو، انٹرویو اردو زبان کے فروغ اور تدریس سے متعلق خیالات و تجربات کو سامنے لاتی ہے۔ جو اہلِ تدریس کے لیے سودمند ہے۔ 'نئے آسمان' کے تحت مضمون 'اردو اور بھوجپوری کا رشتہ' زبانوں کے باہمی رشتوں کو اجاگر کرتا ہے خاص طور پر اردو اور علاقائی زبانوں کے تعلق پر۔ رسالے میں کتابوں کی دنیا حصے میں تعارف و تبصرہ کے تحت کئی اہم کتب کا تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ حصہ قارئین کو نئے ادبی رجحانات سے روشناس کراتا ہے۔ اور ان کے مطالعے کی سمت متعین کرتا ہے۔

'اردو دنیا' کی خبریں نہ صرف رسالے کی مقبولیت کا ثبوت ہیں بلکہ اردو حلقے میں جاری سرگرمیوں کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ علم و ادب کے تمام پہلوؤں کو عمدگی سے سمیٹے ہوئے ہے۔ آپ کی ادارتی ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے۔ دعا گو ہوں کہ رسالہ 'اردو دنیا' کا یہ علمی و تخلیقی سفر مزید وسعت اختیار کرے اور اردو زبان و ادب کی خدمت کا یہ قافلہ نئے سنگِ میل طے کرتا رہے۔

فہیم الدین: اسسٹنٹ پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج جھالاواڑ (راجستھان)

محمد جہانگیر عالم

سماجی رویے اور معذور طلبا
ایک نئے نقطۂ نظر کی ضرورت

جب ہم معذوری کا لفظ سنتے ہیں تو ہمارے ذہن میں فوراً ایک مخصوص تصور آتا ہے— کوئی وہیل چیئر پر بیٹھا ہو، بیساکھیوں کا سہارا لے رہا ہو یا کسی مددگار کی ضرورت محسوس کر رہا ہو۔ لیکن معذوری صرف جسمانی رکاوٹ کا نام نہیں، بلکہ یہ اس طرزِ فکر کا بھی مسئلہ ہے جو ہم نے معذور افراد کے بارے میں اپنا رکھا ہے۔ اکثر، سب سے بڑی رکاوٹ جسمانی نہیں بلکہ معاشرتی اور نفسیاتی ہوتی ہے۔

معذور طلبہ کو درپیش مسائل کی بڑی وجہ ان کا جسمانی چیلنج نہیں بلکہ لوگوں کا رویہ ہے۔ انھیں اکثر محتاج، کمزور یا دوسروں کے سہارے پر جینے والا سمجھا جاتا ہے۔ اس رویے کے باعث ان کی صلاحیتوں، خوابوں اور عزائم کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ان کی قابلیت کو پرکھنے کے بجائے، معاشرہ ان کی کمزوریوں پر زور دیتا ہے۔

یہ سمجھنا ضروری ہے کہ معذوری کسی فرد کی ذہانت، تخلیقی صلاحیت یا کامیابی کی صلاحیت کو محدود نہیں کرتی۔ اگر انھیں مناسب سہولیات، حوصلہ افزائی اور دوستانہ تعلیمی ماحول فراہم کیا جائے، تو وہ بھی دوسروں کی طرح کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اصل مسئلہ ہمارے زاویۂ نظر کو بدلنے کا ہے۔

ہمیں ہمدردی کے بجائے اختیار دینے پر زور دینا ہوگا۔ اساتذہ، والدین اور معاشرہ مل کر ایک ایسا ماحول بنائیں جہاں معذور طلبہ خوداعتمادی محسوس کریں اور اپنے خوابوں کی تکمیل کر سکیں۔ جب ہم معذوری کے بجائے صلاحیت پر توجہ دیں گے، تب ہی ہم ایک ایسا معاشرہ تشکیل دے سکیں گے جہاں ہر طالب علم کو کامیابی کے یکساں مواقع میسر ہوں، چاہے اس کی جسمانی حالت جیسی بھی ہو۔

سماجی رکاوٹیں

جب ہم معذور طلبہ کو درپیش مشکلات کی بات کرتے ہیں تو زیادہ تر لوگ صرف جسمانی رکاوٹوں کے بارے میں سوچتے ہیں، جیسے اسکول میں ریمپ نہ ہونا یا مناسب سہولیات کی کمی۔ لیکن اصل میں سب سے بڑی رکاوٹیں وہ ہیں جو معاشرہ خود تخلیق کرتا ہے— نفسیاتی، تعلیمی، اور پیشہ ورانہ رکاوٹیں جو معذور طلبہ کے خوابوں کو محدود کر دیتی ہیں، چاہے ان میں صلاحیت موجود ہو۔

1. نفسیاتی رکاوٹیں: کم توقعات کا دباؤ: سب سے بڑی سماجی رکاوٹ معذور طلبہ سے کم توقعات رکھنا ہے۔ اکثر لوگ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ جسمانی معذوری رکھنے والے طلبہ زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس سوچ کی وجہ سے والدین ان کے تعلیمی مواقع محدود کر دیتے ہیں، اساتذہ انھیں مشکل مضامین پڑھانے سے گریز کرتے ہیں، اور معاشرہ انھیں کسی بڑے منصب یا کامیابی کے قابل نہیں سمجھتا۔

جب ایک بچہ بار بار یہ سنتا ہے کہ وہ زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتا، تو وہ خود بھی اس پر یقین کرنے لگتا ہے۔ بالآخر، وہ اپنی صلاحیتوں کو دریافت کرنے کے بجائے محدود خواب دیکھنے لگتا ہے، جس سے اس کی ترقی رک جاتی ہے۔

2. تعلیمی رکاوٹیں: شمولیتی تعلیمی نظام کی کمی: ہمارے تعلیمی نظام اکثر صرف عام طلبہ کو مدنظر رکھ کر بنائے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے معذور طلبہ کے لیے مساوی مواقع حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بہت سے اسکولوں میں بنیادی سہولتیں، جیسے ریمپ، لفٹ، یا آسانی سے قابلِ رسائی کمرہ، جماعت موجود نہیں ہوتے، جو معذور طلبہ کو تعلیم کے حق سے محروم کر دیتے ہیں۔

لیکن مسئلہ صرف انفراسٹرکچر تک محدود نہیں ہے۔ روایتی تدریسی طریقے اکثر معذور طلبہ کے لیے موزوں نہیں ہوتے۔ بیشتر اسکول جدید تدریسی وسائل جیسے اسسٹو ٹیکنالوجی، اسکرین ریڈرز، یا خصوصی تدریسی مواد فراہم نہیں کرتے۔ مزید برآں، اساتذہ کو عموماً شمولیتی تعلیم کے بارے میں تربیت نہیں دی جاتی، جس کی وجہ سے وہ نادانستہ طور پر معذور طلبہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اور وہ تعلیمی ماحول میں خود کو الگ تھلگ محسوس کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ، معذور طلبہ کو اکثر اعلیٰ تعلیمی اور پیشہ ورانہ اہداف حاصل کرنے سے روکا جاتا ہے۔ انھیں ڈاکٹر، انجینئر، کاروباری یا فنکار بننے کی ترغیب دینے کے بجائے 'آسان' پیشے چننے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ یہ محدود سوچ ان کے مواقع کو کم کر دیتی ہے اور اس غلط نظریے کو تقویت دیتی ہے کہ کچھ شعبے ان کے لیے موزوں نہیں ہیں، چاہے ان میں صلاحیتیں موجود ہوں۔

3. پیشہ ورانہ رکاوٹیں: مساوی مواقع کی جدوجہد: تعلیم مکمل کرنے کے بعد بھی، معذور طلبہ کو ملازمت کے مواقع میں امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا

ہے۔ بہت سے آجر (Employers) اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ معذور افراد کم اہل، کم محنتی، یا اضافی سہولتوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے، وہ اکثر میرٹ پر پورا اترنے کے باوجود ملازمتوں کے حصول میں ناکام رہتے ہیں۔

بہت سی کمپنیاں ایسی ورک پلیس پالیسیز اختیار نہیں کرتیں جو معذور افراد کے لیے مددگار ثابت ہو سکیں، جیسے لچکدار اوقاتِ کار یا قابلِ رسائی دفاتر۔ نتیجتاً، معذور طلبہ کو نہ صرف روزگار کے مواقع کم ملتے ہیں بلکہ وہ سماج میں برابر کے شہری کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں کو بھی ثابت نہیں کر پاتے۔

ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے اقدامات

ان سماجی رکاوٹوں کو ختم کرنے کے لیے سب سے ضروری قدم سوچ کی تبدیلی ہے۔ معذوری کو کمزوری سمجھنے کے بجائے، اسے ایک منفرد صلاحیت کے طور پر قبول کرنا چاہیے۔ اس مناسبت سے مندرجہ ذیل اقدامات قابل ذکر ہیں:

- **شمولیتی پالیسیوں کا نفاذ:** اسکولوں میں شمولیتی پالیسیوں کا نفاذ ضروری ہے، تاکہ معذور طلبہ کو بھی وہی معیاری تعلیم اور مواقع ملیں جو دوسرے طلبہ کو دیے جاتے ہیں۔
- **شعور بیداری:** آجروں اور کمپنیوں کو معذور افراد کے بارے میں آگاہی دی جانی چاہیے، تاکہ وہ انھیں ملازمتیں دینے میں ہچکچاہٹ کا شکار نہ ہوں۔
- **حوصلہ افزائی:** معذور طلبہ کو بڑے خواب دیکھنے اور انھیں پورا کرنے کے لیے حوصلہ افزائی ملنی چاہیے، نہ کہ ان کی صلاحیتوں کو شک کی نظر سے دیکھا جائے۔

جب معاشرہ ترس کھانے کے بجائے حوصلہ افزائی کو اپنائے گا اور خارج کرنے کے بجائے شامل کرنے کی سوچ پیدا کرے گا، تبھی حقیقی معنوں میں ایک ایسا ماحول بنے گا جہاں ہر طالب علم — چاہے وہ کسی بھی جسمانی حالت میں ہو — برابر کے مواقع حاصل کر سکے اور اپنی صلاحیتوں کو ثابت کر سکے۔

خاندانی اور سماجی تعاون

کسی بھی طالب علم کی کامیابی میں گھر اور معاشرے کا کردار بہت اہم ہوتا ہے، لیکن معذور طلبہ کے لیے یہ تعاون اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر خاندان اور سماج ان کی صلاحیتوں کو پہچانے اور انھیں حوصلہ دے، تو وہ کسی بھی میدان میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر انھیں کمزور سمجھا جائے، حدیں مقرر کی جائیں، یا ان پر غیر ضروری ہمدردی کی جائے، تو یہ ان کے اعتماد کو کمزور کر سکتا ہے۔

1. **والدین کا کردار: اعتماد اور حوصلہ افزائی:** اکثر والدین اپنے معذور بچوں کے بارے میں زیادہ فکرمند ہوتے ہیں، اس لیے وہ:

- زیادہ تحفظ دینے کی کوشش کرتے ہیں، جس سے بچے کی خودمختاری متاثر ہوتی ہے۔
- مشکل کیریئر کے انتخاب سے روکتے ہیں، یہ سوچ کر کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔
- دوسروں سے موازنہ کر کے ان کا حوصلہ پست کر دیتے ہیں۔

حالانکہ، والدین کو چاہیے کہ وہ:

- بچوں کو خودمختار بننے دیں اور خوداعتمادی پیدا کریں۔
- ان کی دلچسپیوں اور صلاحیتوں کے مطابق کیریئر میں آگے بڑھنے میں مدد کریں۔
- معذوری کو رکاوٹ نہیں، بلکہ منفرد صلاحیت کے طور پر دیکھیں۔

2. **بہن بھائی اور خاندان: برابر کا سلوک ضروری:** گھر کے ماحول میں اگر معذور بچوں کو برابر کا فرد سمجھا جائے، تو ان کا اعتماد بڑھتا ہے۔ بہن بھائی اور رشتہ دار اگر انھیں غیر ضروری مدد دیں یا ہمدردی کا اظہار کریں، تو وہ خود کو بوجھ محسوس کر سکتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ:

- ان سے روزمرہ کے کاموں میں شامل ہونے کو کہا جائے۔
- انھیں بھی فیصلہ سازی اور تفریحی سرگرمیوں میں حصہ لینے دیا جائے۔
- خاندان کے افراد معذوری کے حوالے سے مثبت رویہ اپنائیں۔

3. **سماج کا کردار: مکمل شمولیت کی ضرورت:** بہت سے معاشروں میں معذور افراد کو مکمل طور پر قبول نہیں کیا جاتا، جس کی وجہ سے:

- وہ سماجی تقریبات میں شامل نہیں ہو پاتے۔
- عوامی مقامات اور تفریحی مراکز میں سہولتیں فراہم نہیں کی جاتیں۔
- انھیں کمزور سمجھ کر ان کی صلاحیتوں کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔

معاشرہ اگر انھیں مکمل شمولیت کا موقع دے، تو وہ زیادہ پُراعتماد اور کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ:

- عوامی مقامات کو معذور افراد کے لیے قابلِ رسائی بنایا جائے۔
- لوگوں کو معذوری کے بارے میں شعور دیا جائے تاکہ وہ بہتر رویہ اپنا سکیں۔
- معذور افراد کی کامیابیوں کو تسلیم کیا جائے تاکہ معاشرے میں مثبت سوچ پروان چڑھے۔

4. **دوست اور ہم عمر ساتھی: مضبوط سماجی دائرہ بنانا:** دوستوں اور ہم جماعت ساتھیوں کا رویہ بھی معذور طلبہ کی زندگی پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ اکثر:

- لوگ ان سے میل جول کم رکھتے ہیں، کیونکہ انھیں معذوری کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہوتا۔
- انھیں یا تو مکمل نظرانداز کر دیا جاتا ہے یا ضرورت سے زیادہ ہمدردی دی جاتی ہے۔
- گروپ سرگرمیوں میں انھیں شامل نہیں کیا جاتا۔

اسے بدلنے کے لیے:

- اسکولز میں معذوری سے متعلق آگاہی سیشنز کرائے جائیں۔
- گروپ ایکٹیویٹیز میں سب کو برابر موقع دیا جائے۔
- سینئر طلبہ، معذور ساتھیوں کی مدد کے لیے رہنمائی پروگرامز کا حصہ بنیں۔

معذور طلبہ کی کامیابی صرف تعلیم پر منحصر نہیں، بلکہ ایک مضبوط سپورٹ سسٹم پر بھی ہے۔ اگر خاندان، دوست، اساتذہ، اور سماج مل کر انھیں مکمل شمولیت اور مواقع فراہم کریں، تو وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتے ہیں اور زندگی میں کسی بھی مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔

میڈیا اور معذور طلبہ کی نمائندگی

میڈیا ایک طاقتور ذریعہ ہے جو عوامی رائے کو تشکیل دیتا ہے اور معاشرے کے نظریات پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ بدقسمتی سے، فلموں، ڈراموں، خبروں اور سوشل میڈیا میں معذور طلبہ کی تصویرکشی اکثر غلط فہمیوں اور دقیانوسی تصورات کو فروغ دیتی ہے، بجائے اس کے کہ حقیقی معنوں میں شمولیت کو اجاگر کیا جائے۔

1. **انتہا پسندانہ پیشکش کا مسئلہ:** زیادہ تر میڈیا میں معذوری کو دو انتہائی طریقوں سے پیش کیا

جاتا ہے:

- **المیہ اور بے بسی کی کہانی:** معذور افراد کو کمزور، لاچار اور ہمدردی کے محتاج دکھایا جاتا ہے۔ اس سے لوگوں میں یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ معذوری ایک بدقسمتی ہے، نہ کہ ایک مختلف طرزِ زندگی۔ اس کا اثر معذور طلبہ کی خود اعتمادی پر بھی پڑتا ہے، اور وہ خود کو ایک بوجھ سمجھنے لگتے ہیں۔
- **غیر معمولی ہیرو کی کہانی:** دوسری طرف، بعض اوقات معذور افراد کو 'سپر ہیومن' دکھایا جاتا ہے، جو صرف اس وقت قابلِ قدر سمجھے جاتے ہیں جب وہ کوئی غیر معمولی کامیابی حاصل کریں۔ حالانکہ کامیابیوں کو سراہنا ضروری ہے، لیکن یہ تاثر معذور طلبہ پر غیر ضروری دباؤ ڈال دیتا ہے کہ انھیں مسلسل کچھ ثابت کرنا ہوگا۔

یہ دونوں طریقے معذور طلبہ کو ایک عام انسان کی طرح پیش کرنے میں ناکام رہتے ہیں، جن کی بھی اپنی خوبیاں، کمزوریاں، خواب اور چیلنجز ہوتے ہیں۔

2. حقیقت پسندانہ اور متنوع نمائندگی کی کمی: ایک بڑا مسئلہ میڈیا میں معذور کرداروں کی کمی ہے۔ زیادہ تر فلموں اور ڈراموں میں معذور افراد یا تو بالکل نظر نہیں آتے، یا پھر انھیں ایسے اداکار ادا کرتے ہیں جو خود معذوری کے تجربے سے ناواقف ہوتے ہیں۔ جب معذور طلبہ کو اپنے جیسے لوگ کامیاب کرداروں میں نظر نہیں آتے، تو اس سے ان کی خود اعتمادی اور مستقبل کے خواب متاثر ہو سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ، جب میڈیا معذور افراد کو شامل کرتا بھی ہے تو زیادہ تر توجہ صرف ان کی معذوری پر ہوتی ہے، بجائے اس کے کہ ان کی صلاحیتوں، شخصیت اور خدمات کو اجاگر کیا جائے۔ اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ معذوری کسی فرد کی پوری شناخت ہے، حالانکہ یہ صرف زندگی کا ایک پہلو ہے۔

3. خبروں اور سوشل میڈیا کا کردار: خبروں اور سوشل میڈیا میں معذوری پر بات کرنے کا انداز بھی عوامی رائے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ زیادہ تر خبریں 'معذوری پر قابو پانے' کی کہانیاں دکھاتی ہیں، بجائے اس کے کہ وہ معاشرتی رکاوٹوں پر بات کریں جو معذور طلبہ کی زندگی کو مشکل بناتی ہیں۔

دوسری جانب، سوشل میڈیا معذور افراد کو اپنی کہانی خود سنانے کا موقع فراہم کر رہا ہے۔ یوٹیوب، انسٹاگرام اور ٹک ٹاک جیسے پلیٹ فارمز پر کئی معذور افراد اپنی زندگی کے تجربات شیئر کر رہے ہیں، دقیانوسی تصورات کو چیلنج کر رہے ہیں، اور معاشرتی آگاہی بڑھا رہے ہیں۔ یہ آوازیں مرکزی دھارے کے میڈیا میں بھی شامل کی جانی چاہئیں تاکہ معاشرہ معذوری کی حقیقت کو بہتر طور پر سمجھ سکے۔

4. میڈیا کس طرح مثبت کردار ادا کر سکتا ہے؟: حقیقی تبدیلی لانے کے لیے میڈیا کو درج ذیل اقدامات کرنے کی ضرورت ہے:

- زیادہ حقیقت پسندانہ اور متنوع معذور کردار فلموں، ڈراموں اور کتابوں میں شامل کیے جائیں۔
- معذوری کے بجائے صلاحیتوں پر توجہ دی جائے، اور معذور طلبہ کو تعلیم، کھیل، کیریئر اور سماجی سرگرمیوں میں متحرک دکھایا جائے۔
- معذور افراد کو اپنی کہانی خود بیان کرنے کا موقع دیا جائے، تاکہ دوسرے لوگ ان کی زندگی کے تجربات براہِ راست سمجھ سکیں۔
- معاشرتی رکاوٹوں اور سہولتوں کی کمی پر بات کی جائے تاکہ لوگ صرف ذاتی جدوجہد پر نہیں بلکہ مجموعی طور پر شمولیت اور رسائی کے مسائل پر بھی غور کریں۔

جب میڈیا معذور طلبہ کو صحیح اور مثبت انداز میں پیش کرے گا، تو نہ صرف معاشرتی رویے تبدیل ہوں گے، بلکہ یہ طلبہ خود کو زیادہ قابل، بااعتماد اور معاشرے کا برابر کا حصہ محسوس کریں گے۔

ہندوستان میں معذور طلبہ کے لیے سرکاری پالیسیاں اور قانونی تحفظ

ہندوستانی حکومت نے حالیہ برسوں میں معذور طلبہ کو مساوی تعلیمی مواقع فراہم کرنے کے لیے متعدد مثبت اقدامات کیے ہیں۔ مختلف پالیسیوں اور قوانین کے ذریعے ایسی رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو معذور طلبہ کی ترقی میں حائل ہیں۔ لیکن ان اقدامات کے باوجود عملی سطح پر کئی چیلنجز باقی ہیں، جنھیں بہتر پالیسیوں اور سخت عمل درآمد کے ذریعے حل کرنا ضروری ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

1. تعلیم کا حق اور شمولیتی اسکولنگ: رائٹ ٹو ایجوکیشن (RTE) ایکٹ 2009 نے تعلیم کو تمام بچوں کا بنیادی حق قرار دیا، جس میں معذور طلبہ بھی شامل ہیں۔ اس کے بعد رائٹس آف پرسنز وِد ڈِس ایبلٹیز (RPWD) ایکٹ 2016 کے ذریعے تمام عام اسکولوں کو معذور بچوں کے لیے شمولیتی بنانے کا حکم دیا گیا۔ حکومت نے سمگر شکشا ابھیان جیسے پروگرام بھی متعارف کرائے، جن کا مقصد معذور طلبہ کے لیے سہولیات فراہم کرنا ہے، جیسے کہ خصوصی اساتذہ، معاون آلات، اور آسان رسائی والا انفراسٹرکچر۔

چیلنجز

- کئی اسکولوں میں وہیل چیئر ریمپ، لفٹ، اور دیگر بنیادی سہولتیں موجود نہیں۔
- خصوصی تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی کی وجہ سے معذور طلبہ کو ذاتی تعلیمی مدد نہیں مل پاتی۔
- کچھ اسکول معذور طلبہ کو داخلہ دینے سے ہچکچاتے ہیں، کیونکہ ان کے پاس وسائل اور آگاہی کی کمی ہے۔

2. اعلیٰ تعلیم اور ملازمت میں ریزرویشن: معذور طلبہ کو مزید مواقع دینے کے لیے حکومت نے اعلیٰ تعلیم اور سرکاری نوکریوں میں ریزرویشن کا نظام متعارف کرایا۔ RPWD ایکٹ کے تحت کالجوں میں 5% اور سرکاری ملازمتوں میں 4% کوٹہ مقرر کیا گیا ہے، جس سے معذور طلبہ کو بہتر تعلیمی اور پیشہ ورانہ مواقع میسر آئے ہیں۔

چیلنجز

- بہت سے معذور طلبہ کو ریزرویشن کے بارے میں آگاہی نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے وہ ان مواقع سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔
- کئی یونیورسٹیاں اور کالج معذور طلبہ کے لیے سازگار ماحول فراہم کرنے میں ناکام ہیں، جیسے کہ قابلِ رسائی ہاسٹل اور امتحانی سہولتیں۔
- نجی شعبے میں معذور افراد کے لیے نوکریوں کے مواقع محدود ہیں کیونکہ وہاں شمولیتی پالیسیوں پر سخت عمل درآمد نہیں کیا جاتا۔

3. مالی معاونت اور وظائف: حکومت نے معذور طلبہ کے لیے متعدد اسکالرشپ اور مالی مدد کے پروگرام متعارف کرائے ہیں، جیسے کہ:

- پری-میٹرک اور پوسٹ-میٹرک اسکالرشپ، جو اسکول اور کالج کے طلبہ کے لیے ہیں۔
- نیشنل ہینڈی کیپڈ فنانس اینڈ ڈیولپمنٹ کارپوریشن (NHFDC) کے ذریعے تعلیمی قرضے۔
- سرکاری اداروں میں مفت یا رعایتی تعلیم۔

چیلنجز

- اسکالرشپ کے لیے درخواست کا عمل اکثر پیچیدہ اور وقت طلب ہوتا ہے۔
- دیہی علاقوں میں طلبہ کو ان وظائف کے بارے میں معلومات نہیں ہوتیں۔
- بعض اوقات مالی مدد کی رقم وقت پر جاری نہیں کی جاتی یا نا کافی ہوتی ہے۔

4. **ڈیجیٹل تعلیم اور معذور طلبہ :** آن لائن تعلیم کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر، حکومت نے دکشا اور سویم (Diksha & Swayam) جیسے پلیٹ فارمز متعارف کرائے ہیں، جہاں معذور طلبہ کے لیے آڈیو بکس، سائن لینگویج ویڈیوز، اور دیگر معاون مواد فراہم کیا جاتا ہے۔

چیلنجز

- دیہی علاقوں میں انٹرنیٹ اور ڈیجیٹل مہارتوں کی کمی کی وجہ سے یہ پلیٹ فارمز سب تک نہیں پہنچ پاتے۔
- کچھ آن لائن تعلیمی پلیٹ فارمز نابینا اور بہرے طلبہ کے لیے پوری طرح موافق نہیں۔
- اساتذہ کی آن لائن تدریس کے حوالے سے خصوصی تربیت کی کمی ہے۔

معذور طلبہ کو بااختیار بنانے میں ٹیکنالوجی کا کردار

ٹیکنالوجی نے معذور طلبہ کے لیے تعلیم کو زیادہ آسان اور قابلِ رسائی بنا دیا ہے۔ جدید آلات اور ڈیجیٹل وسائل کی مدد سے وہ تعلیمی رکاوٹوں کو عبور کر سکتے ہیں اور دوسرے طلبہ کے برابر تعلیمی مواقع حاصل کر سکتے ہیں۔ اسمارٹ ڈیوائسز سے لے کر آن لائن لرننگ پلیٹ فارمز تک، ٹیکنالوجی نے ان طلبہ کو زیادہ خودمختار اور پراعتماد بنایا ہے، ان کی ایک مختصر تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

1. **معذور طلبہ کے لیے مددگار آلات:** حرکت میں مشکلات کا سامنا کرنے والے طلبہ کے لیے اسکول میں آنا اور پڑھائی کرنا ایک چیلنج ہو سکتا ہے۔ مگر جدید مددگار آلات جیسے کہ:

- اسمارٹ وہیل چیئرز جو نقل و حرکت کو آسان بناتی ہیں۔
- وائس کنٹرول کمپیوٹرز اور ٹیبلٹس جو ہاتھوں کے بغیر بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔
- ارگونومک کی بورڈز اور اسپیشل تحریری آلات جو امتحانات اور ہوم ورک میں مدد دیتے ہیں۔

یہ ٹیکنالوجی یقینی بناتی ہے کہ جسمانی مشکلات طلبہ کی تعلیمی ترقی میں رکاوٹ نہ بنیں۔

2. **ڈیجیٹل لرننگ اور آن لائن تعلیم:** ڈیجیٹل پلیٹ فارمز جیسے دکشا (Diksha)، سویم (Swayam) اور ای-پاٹھ شالا نے معذور طلبہ کے لیے تعلیم کو مزید لچکدار بنا دیا ہے۔ اب وہ:

- گھر بیٹھ کر آن لائن کلاسز لے سکتے ہیں اور اسکول آنے کی مشکلات کم ہو گئی ہیں۔
- اسکرین ریڈرز اور وائس اسسٹنٹس کی مدد سے کتابیں اور نوٹس سن سکتے ہیں۔
- ریکارڈ شدہ لیکچرز تک رسائی حاصل کر کے اپنی رفتار سے سیکھ سکتے ہیں۔

یہ خاص طور پر ان طلبہ کے لیے فائدہ مند ہے جو سفر یا اسکول کے بنیادی ڈھانچے کی مشکلات کی وجہ سے مسائل کا سامنا کرتے ہیں۔

3. **مصنوعی ذہانت (AI) اور اسمارٹ اسسٹنٹس:** مصنوعی ذہانت نے تعلیم کو زیادہ قابلِ رسائی اور آسان بنا دیا ہے۔ گوگل اسسٹنٹ، سری اور الیکسا جیسے اسمارٹ اسسٹنٹس معذور طلبہ کو درج ذیل طریقوں سے مدد دیتے ہیں:

- آواز کی مدد سے معلومات تلاش کرنا اور ہوم ورک کی یاد دہانی۔
- ٹیکسٹ ٹو اسپیچ ٹولز جو کتابیں اور نوٹس بلند آواز میں پڑھ کر سناتے ہیں۔
- ایسا لرننگ سسٹم جو ہر طالب علم کی ضروریات کے مطابق سبق کو ایڈجسٹ کرے۔

یہ جدید سہولتیں طلبہ کی دوسروں پر انحصار کم کرتی ہیں اور انھیں مزید خودمختار بناتی ہیں۔

4. **درپیش چیلنجز اور بہتری کے مواقع:** اگرچہ ٹیکنالوجی نے تعلیم کو مزید آسان بنایا ہے، مگر اب بھی کچھ مسائل موجود ہیں:

- بہت سے اسکولوں میں مددگار ٹیکنالوجی دستیاب نہیں۔
- معذور طلبہ کے لیے جدید آلات مہنگے ہیں اور ہر کوئی انھیں خرید نہیں سکتا۔
- اساتذہ کو ان ٹیکنالوجیز کے استعمال کی مناسب تربیت نہیں دی جاتی۔
- دیہی علاقوں میں انٹرنیٹ کی سہولت ناکافی ہے جس کی وجہ سے آن لائن لرننگ مشکل ہو جاتی ہے۔

ان چیلنجز سے نمٹنے کے لیے حکومت اور نجی اداروں کو مل کر ٹیکنالوجی کو مزید سستا اور عام کرنا ہوگا، اساتذہ کو تربیت دینی ہوگی، اور انٹرنیٹ کی سہولیات بہتر بنانی ہوں گی۔

اگر صحیح اقدامات کیے جائیں تو ٹیکنالوجی معذوری اور مواقع کے درمیان فاصلے کو کم کر سکتی ہے اور ہر طالب علم کو مساوی تعلیمی مواقع فراہم کر سکتی ہے۔

الغرض معذور طلبہ کے لیے ایک جامع اور معاون تعلیمی ماحول فراہم کرنا صرف ایک ذمہ داری نہیں، بلکہ ایک منصفانہ اور ترقی پسند معاشرے کی ضرورت ہے۔ حکومت، تعلیمی ادارے، خاندان، اور معاشرہ معذور طلبہ کی شمولیت کے لیے مختلف اقدامات کر رہے ہیں، لیکن ابھی بھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ طلبہ مساوی مواقع اور عزت حاصل کر سکیں۔

حقیقی شمولیت صرف اسکولوں میں ریمپ اور سہولیات فراہم کرنے تک محدود نہیں، بلکہ سوچ کا بدلنا ضروری ہے— معذوری کو کمزوری سمجھنے کے بجائے، ہر فرد کی صلاحیتوں کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اسکولوں میں جامع تعلیم کو فروغ دینا چاہیے، اساتذہ کو خصوصی تربیت دینی چاہیے، خاندانوں کو بچوں کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنی چاہیے، اور میڈیا کو معذوری کی حقیقت پسندانہ اور مثبت تصویر پیش کرنی چاہیے۔

ٹیکنالوجی نے معذور طلبہ کے لیے نئے دروازے کھول دیے ہیں، انھیں وہ رکاوٹیں عبور کرنے میں مدد دی ہے جو پہلے ناممکن لگتی تھیں۔ لیکن، ان وسائل تک رسائی کو مزید وسیع کرنا ہوگا تاکہ تمام طلبہ، چاہے وہ کسی بھی پس منظر سے ہوں، ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔

سب سے بڑھ کر، معاشرے میں برابری اور عزت کا کلچر فروغ دینا ہوگا، جہاں معذور طلبہ کو کسی رعایت کے مستحق نہیں بلکہ معاشرے کے اہم رکن کے طور پر دیکھا جائے۔ جب ہم معذوری کو ایک رکاوٹ کے بجائے ایک منفرد پہچان سمجھیں گے، تبھی ہر طالب علم اپنی صلاحیتوں کو بغیر کسی حد کے استعمال کر سکے گا۔

■

Md. Jahangeer Alam
Ph. D Scholar
MANUU, College of Teacher Education
CTE, Darbhanga- 946001 (Bihar)
Mob.:8885485920
20phed002db@manuu.edu.in

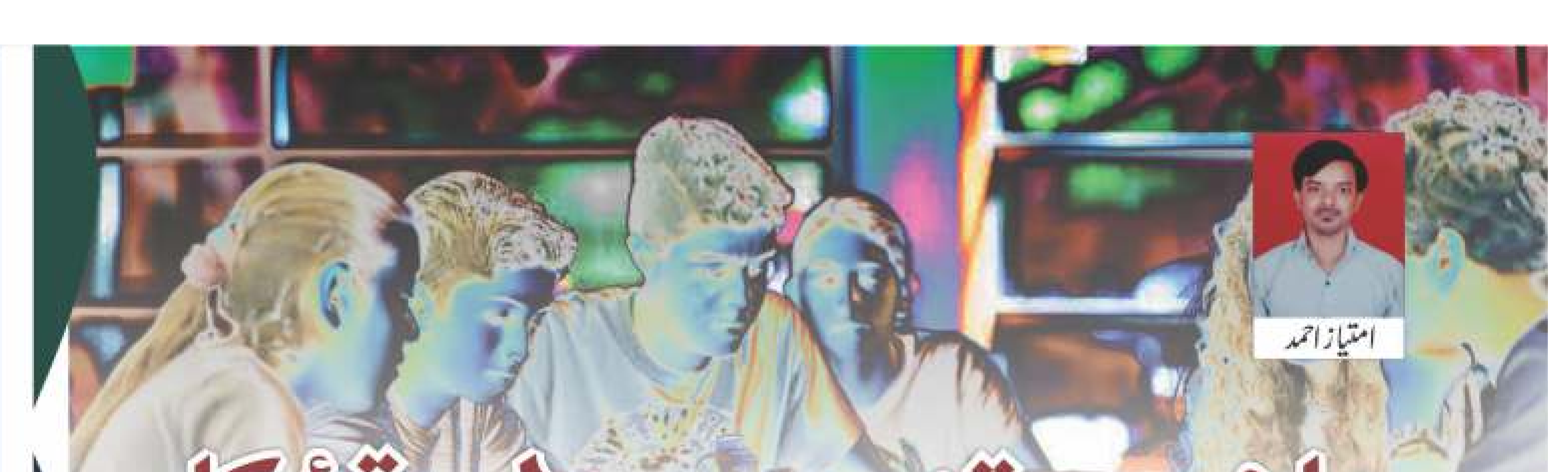

امتیاز احمد

باہمی تدریسی طریقۂ کار

بیسویں صدی کا نصف آخر زبان کی تعلیم و تدریس کے لیے نت نئے طریقہ کار اور تدابیر کے تعارف اور تشکیل کا زمانہ رہا ہے۔ ایک طرف جہاں زبان کی ساخت اور نوعیت، لسانی مباحث اور تصورات کو موضوع بحث بنایا گیا وہیں زبان کی بنیادی مہارتوں کی آموزش و اکتساب کے طریقوں اور حکمت عملیوں پر از سر نو غور وفکر کیا گیا۔ زبان کی بنیادی ساخت صوتیات و صرفیات اور نحویات و معنیات کی تفہیم و تعبیر کے نئے دریچے منکشف ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی لسانی مہارتوں جیسے سماعت، قرأت، گفتگو اور تحریر کی تدریسی تدابیر اور طریقہ کار کے بہتر فروغ پر زور دیا گیا۔ ان مہارتوں کی تدریسی خامیوں کو دور کرنے کے لیے مختلف نظریات اور تصورات پیش کیے گئے۔

زبان کی بنیادی چاروں مہارتیں جہاں اپنی علاحدہ خصوصیات اور امتیازات رکھتی ہیں وہیں یہ چاروں آپس میں ایک دوسرے سے منسلک بھی ہیں۔ کسی ایک مہارت کی خامی دوسری مہارت کی آموزش کو متاثر کرسکتی ہے۔ لہٰذا ان مہارتوں کی تدریس کے وقت استاد کو ان کی انفرادی خصوصیات کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے اور ان کے مشترکہ امتیازات کو بھی۔ لسانی مہارتوں کی تدریسی و آموزشی خامیوں سے بچنے کے لیے مختلف طریقۂ کار اور حکمتِ عملیاں متعارف کی گئی ہیں۔ برطانوی ماہر نفسیات و تعلیم اَن لیسلی براؤن (Ann Lesley Brown) اور امریکی ماہر تعلیم اینّمرے سلوَن پلنسار (Annemarie Sullivan Palincsar) نے زبان کے تدریسی عمل کو بہتر بنانے اور زبان کی قرأت یعنی مطالعہ کی سمجھ کو مؤثر بنانے کے لیے ریسی پروکل تدریس کا نظریہ پیش کیا۔ ریسی پروکل تدریس زبان کے تدریسی مواد کی قرأت کی تفہیم کے لیے ایک باہمی تدریسی حکمت عملی کے طور پر پیش کی گئی تھی جو ابتدا میں محض قرأت کی تفہیم کو بہتر بنانے کے لیے اختیار کی جاتی تھی لیکن رفتہ رفتہ اسے زبان کی باقی مہارتوں کی تدریس کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ کارٹر (Carter, 1997) نے ریسی پروکل تدریس کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے:

''باہمی تدریس قرأت کے عمل کو ایک باہمی تعامل کے طور پر بیان کرتی ہے جس میں قارئین اپنے سابقہ تجربات کو متحرک کرتے ہوئے متن کے ساتھ تعامل کرتے ہیں۔ قارئین سابقہ تجربات کو ایک چینل کے طور پر استعمال کرتے ہوئے نئی معلومات، اہم خیالات اور دلائل سیکھتے ہیں۔ اس طرح قارئین متن سے معنی اخذ کرتے ہیں اور سابقہ تجربات کی روشنی میں مصنف کی تجویز کردہ باتوں کی تصدیق یا توسیع کرتے ہیں۔ اگر قارئین سابقہ تجربات کے استعمال سے متن کی تحلیل اور اس کے معنی اخذ نہ کر پائیں تو مواد کی حیثیت ایک بے معنی اور صوتیاتی ٹکڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں رہے گی۔ باہمی تدریس تعمیراتی آموزش کا ایک ماڈل ہے جس میں باہمی تعامل سے قرأت کی تفہیم کرائی جاتی ہے۔''

کلنگنر اور واگن (Klingner and Vaughn, 1996) نے پلنسار اور براؤن کے حوالے سے باہمی تدریس کی مندرجہ ذیل تعریف کی ہے:

''باہمی تدریس کا ماڈل ان طلبہ کی سمجھ بوجھ کو بہتر بنانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو الفاظ کو پڑھنے میں تو ماہر ہیں لیکن متن کی تفہیم میں مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔''

ہیکر اور ٹینٹ (Hacker and Tenent, 2002) نے پلنسار اور براؤن کا حوالہ دیتے ہوئے باہمی تدریس کی وضاحت اس طرح کی:

''باہمی تدریس ایک تدریسی طریقہ کار ہے جس میں طلبہ کی چھوٹی تعداد/ جماعت تفہیمی مانیٹرنگ تدابیر کی 'معاون ہدایت' کی مدد سے اپنی قرأت کی فہم و ادراک کو بہتر بناتے ہیں۔''

باہمی تدریس کے بنیادی مراحل

ریسی پروکل تدریس مندرجہ ذیل چار بنیادی مراحل پر مشتمل ہے جس کی عمل آوری میں استاد ایک سہولت کار کے طور پر اور طلبہ ایک متحرک کردار کے طور پر کام کرتے ہیں۔

پیش گوئی کرنا

استاد کو کمرۂ جماعت میں سبق کے اعلان سے قبل مختلف طرح کے اشارات، سرخیوں یا تصاویر کا استعمال کرنا چاہیے تاکہ طلبہ ان کے ذریعے سبق کے عنوان کا اندازہ لگا سکیں اور اپنی سابقہ معلومات کو متحرک کرسکیں۔ اس سے طلبہ نہ صرف سبق کی جانب متوجہ ہوسکتے ہیں بلکہ ان میں سبق کی آموزش کی تحریک بھی پیدا ہوسکتی ہے۔

سوالات کرنا

طلبہ متن کی قرأت کے بعد سوالات قائم کرتے ہیں اور استاد سے جواب طلب کرتے ہیں تاکہ وہ متن سے کلیدی معلومات اخذ کرسکیں اور اپنی قرأت کی تفہیم کو فروغ دے سکیں۔

وضاحت کرنا

طلبہ صوتی تجزیاتی مہارت کے ذریعے مشکل الفاظ، جملے اور تصورات کی توضیح و تحلیل کرتے ہیں۔ وہ ذاتی اصلاح اور یقین کے لیے متن کے سیاق و سباق کا سہارا بھی لے سکتے ہیں۔ اس منزل پر استاد ایک سہولت کار کے طور پر طلبہ کو مدد بہم پہنچاتے ہیں۔

تلخیص بیان کرنا

طلبہ متن کے کلیدی نکات، بنیادی معلومات اور اہم خیالات و تصورات کا خلاصہ بیان کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ طلبہ متن کی مجموعی ساخت اور ترتیب کا موازنہ اور تقابل بھی کرتے ہیں۔

درج بالا چاروں مراحل کی انجام دہی میں طلبہ بنیادی رول ادا کرتے ہیں۔ اگر طلبہ دورانِ آموزش کسی قسم کی پریشانی سے دوچار ہوتے ہیں تو استاد ان کی مدد کرے گا اور انھیں متحرک کر کے ذاتی اکتساب اور آموزش پر آمادہ کرے گا۔ ایلین (Allen, 2003) نے پلنسار اور براؤن کے حوالے سے باہمی تدریس کے عمل کے چار اہم نکات کی وضاحت کی ہے:

''پہلا؛ حکمت عملیوں کا حصول ایک مشترکہ عمل ہے جس کی ذمہ داری استاد اور طلبہ پر یکساں ہے۔ دوسرا؛ اگرچہ استاد تدریس اور تدابیر کے ابتدائی تعارف میں بڑی ذمہ داری نبھاتا ہے البتہ وہ یہ ذمہ داری بتدریج طلبہ کو منتقل کر دیتا ہے۔ تیسرا؛ تمام طلبہ سے بحث و مباحثہ میں شریک ہونے کی توقع کی جاتی ہے۔ استاد معاون بیانات، اشارات اور مطالبات کی شکل میں تمام طلبہ کو معاون ہدایات فراہم کر کے ان کی شرکت کو یقینی بناتا ہے۔ چوتھا؛ طلبہ کو مسلسل یاد دلایا جاتا ہے کہ یہ تدابیر متن کی سمجھ بوجھ کو بہتر بنانے میں مدد فراہم کریں گی۔ طلبہ متن سے معنی اخذ کرتے وقت محسوس کرنے لگتے ہیں کہ جامع اور مؤثر قرأت کے لیے صرف الفاظ کو پڑھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ ایسی مابعد وقوفی حکمت عملیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو تعمیراتی اور تجزیاتی سرگرمیوں کو سہولت فراہم کریں۔''

ریسی پروکل طریقہ کے ذریعے قرأت کی تدریس

قرأت کی سطح	استاد کی سرگرمیاں	طلبہ کی سرگرمیاں
ماقبل قرأت طلبہ کی سابقہ معلومات کو متحرک کرنا	تمہیدی گفتگو مواد کا تعارف طلبہ کو مواد سے متعلق تصاویر دکھانا تصاویر کے متعلق چند سوالات دریافت کر کے انھیں طلبہ کی سابقہ معلومات سے منسلک کرنا ریسی پروکل تدریس اور اس کے مقاصد کا تعارف	مواد کو بغور سننا تصاویر کی طرف دھیان دینا تصاویر سے متعلق سوالات کا جواب دینا استاد کے ذریعے ریسی پروکل تدریسی حکمت عملی کے مقاصد کی وضاحت دھیان سے سننا
پیش گوئی مرحلہ	مواد/مضمون کو طلبہ کے درمیان تقسیم کرنا ریسی پروکل تدریس کے ورک شیٹ کو طلبہ میں تقسیم کرنا طلبہ کو ہدایت دینا کہ وہ سبق سے متعلق مواد یا تصاویر دیکھ کر عنوان کا پتا لگائیں/اندازہ کریں طلبہ سے اپنے قیاس کو ورک شیٹ پر لکھنے کے لیے کہنا	متن اور ریسی پروکل ورک شیٹ کا مشاہدہ کرنا مواد، مضمون اور تصاویر کو دیکھ کر عنوان کا اندازہ لگانا اپنے قیاس کو ریسی پروکل ورک شیٹ پر لکھنا
سوالات کا مرحلہ	طلبہ کو جواب مطلوب سوالات کو لکھنے کی ہدایت دینا طلبہ کو سوالات قائم کرنے کا موقع دینا طلبہ سے اپنے سوالات ورک شیٹ پر لکھنے کے لیے کہنا	جواب مطلوب سوالات کی فہرست تیار کرنا ورک شیٹ پر سوالات لکھنا
دورانِ قرأت توضیحی مرحلہ	طلبہ کو سوالات کے جوابات کے لیے متن کو گہرائی سے پڑھنے کی ہدایت دینا طلبہ سے مشکل الفاظ کے معانی کے لیے لغت دیکھنے کی تاکید کرنا طلبہ سے متن کی قرأت پر مبنی سوالات کی وضاحت کرنے اور انھیں ورک شیٹ پر لکھنے کے لیے کہنا طلبہ سے مشکل الفاظ اور جملے کے معانی ورک شیٹ پر لکھنے کے لیے کہنا	متن کو خاموشی کے ساتھ پڑھنا متن پر مبنی سوالات کے جوابات تلاش کرنا مشکل الفاظ کے معانی لغت میں تلاش کرنا ریسی پروکل ورک شیٹ پر مشکل الفاظ و جملے کے معانی اور سوالات کے جوابات لکھنا
مابعد قرأت تلخیصی مرحلہ	طلبہ سے اپنے سوالات کی وضاحت کرنے کے لیے کہنا طلبہ سے اپنے الفاظ میں متن کی تشریح کرنے کے لیے کہنا طلبہ سے اپنی تلخیص ورک شیٹ پر لکھنے کے لیے کہنا طلبہ سے اپنی تلخیص پیش کرنے کے لیے کہنا طلبہ سے اپنی سرگرمیاں جمع کرنے کے لیے کہنا	اپنے سوالات کا تجزیہ کرنا متن کا خلاصہ بیان کرنا اپنی تلخیص کو ورک شیٹ پر لکھنا کمرۂ جماعت کے سامنے اپنی تلخیص پیش کرنا استاد کے پاس اپنی سرگرمیاں جمع کرنا

باہمی تدریس کا کمرۂ جماعت میں اطلاق

ایک استاد زبان کی مختلف مہارتوں کی تعلیم و تدریس میں اس طریقۂ کار کو استعمال کر سکتا ہے اور اپنے تدریسی عمل کو مؤثر بنا سکتا ہے۔

قرأت کی تفہیم: استاد مختصر کہانیوں، نظموں یا مضامین کی تدریس کے لیے اس طریقۂ کار کو اختیار کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر طلبہ کو مختلف گروپوں میں تقسیم کر کے ان سے باری باری کہانی پڑھوا سکتا ہے۔ طلبہ باری باری کہانی کے بنیادی خیالات کا قیاس لگا سکتے ہیں، سوالات قائم کر سکتے ہیں، وضاحت کر سکتے ہیں اور کہانی کا خلاصہ پیش کر سکتے ہیں۔

سماعت کی تفہیم: استاد کہانی، نظم اور تدریسی مواد پر مبنی آڈیو کلپس طلبہ کو سنا سکتا ہے اور ان سے باری باری اندازہ لگانے، سوالات قائم کرنے، وضاحت کرنے اور خلاصہ بیان کرنے کے لیے کہہ سکتا ہے۔

گفتگو کی تفہیم: استاد طلبہ کو مختلف گروپوں میں تقسیم کر کے ان سے بحث و مباحثہ کرا سکتا ہے۔ ہر گروپ کا ایک طالب علم اپنے باقی ساتھی کی قیادت کر سکتا ہے، سوالات کر سکتا، وضاحت اور خلاصہ بیان کر سکتا ہے۔ اس طرح طلبہ میں تعاملی مہارتوں کی نشو و نما بھی ممکن ہے اور طلبہ کی قرأت کی ہچکچاہٹ بھی دور ہو سکتی ہے۔

ریسی پروکل تدریس کی خصوصیات

مؤثر آموزشی ماحول کا قیام: یہ تدریسی طریقہ طلبہ کو آپسی تعامل، خود انعکاس، ذاتی تلاش وجستجو اور سعی وخطا کے مواقع فراہم کرکے آموزش واکتساب کو ممکن بنا سکتا ہے اور ان میں سبق کے تئیں دلچسپی اور محرکہ پیدا کرسکتا ہے۔

اعلیٰ سطحی غور و فکر کی ترویج: یہ طریقہ طلبہ میں اعلیٰ سطح کی سوچ، تجزیاتی مہارت، سوالات قائم کرنے کی صلاحیت اور وضاحت کرنے کی استعداد کو فروغ دے سکتا ہے۔

اشتراکی صلاحیت کی نشو و نما: یہ طریقہ طلبہ میں اجتماعی سرگرمی، باہمی تعاون اور آپسی بحث ومباحثہ کی مہارتوں کو پروان چڑھتا ہے جو زبان کی آموزش و اکتساب میں کلیدی رول ادا کرتی ہیں۔

حوصلہ افزائی اور مشغولیت: ریسی پروکل طریقہ تدریس کی انفعالی فطرت طلبہ کو تدریس و آموزش میں زیادہ متحرک اور منہمک رکھتی ہے اور آموزشی عمل میں کامیاب ہونے پر ان میں نئی تحریک پیدا کرتی ہے۔

ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ: طلبہ وضاحت کے مرحلے میں مشکل الفاظ کے معانی تلاش کرتے ہیں، ان کے ممکنہ معنی پر بحث کرتے ہیں اور مترادفات یا متضاد الفاظ دریافت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر دورانِ قرأت طلبہ لفظ 'آشنا' سے روبرو ہوتے ہیں۔ اب وہ سیاق وسباق میں اس کے معنی تلاش کرسکتے ہیں، اس پر گفتگو کرسکتے ہیں اور اس سے ملتے جلتے الفاظ جیسے 'واقف'، 'باخبر'، 'روشناس' پر غور وفکر کرسکتے ہیں۔ یہ سرگرمیاں ان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کے ساتھ انھیں لفظ شناسی اور اخذِ معنی پر بھی آمادہ کرتی ہیں۔

قواعد کا شعور: طلبہ متن کی قرأت کے دوران مشکل جملوں اور ان کی تراکیب کو نشان زد کرتے ہیں اور سوالات کا تجزیہ کرکے یہ سمجھ جاتے ہیں کہ جملہ کی نوعیت کیا ہے۔ اسی طرح طلبہ ان جملوں کو دوبارہ لکھ کر ان کی متبادل صورتیں استعمال کرسکتے ہیں۔

ثقافتی سیاق و سباق کی تفہیم: زبان کی تعلیم و تدریس اور آموزش و اکتساب میں ثقافتی سیاق وسباق کا بکثرت استعمال ہوتا ہے جو بعض دفعہ طلبہ کے لیے وقت طلب ہوجاتے ہیں۔ وضاحت کا مرحلہ ان عناصر پر بحث ومباحثہ کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ مثلاً، اگر کوئی متن کسی تہوار یا سماجی رسم پر مشتمل ہو تو طلبہ کو اس کے سیاق وسباق اور اہمیت پر بحث کرنے کے مواقع دینے چاہیے تاکہ زبان کی سمجھ کے ساتھ ثقافتی سیاق وسباق کی تفہیم بھی ہوجائے۔

تحریری مشق کی تربیت: اس تدریسی طریقہ میں طلبہ مشکل الفاظ و جملے، قیاس، سوالات، وضاحت اور خلاصہ کو ورک شیٹ پر لکھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تحریری صلاحیت بھی فروغ پاتی ہے۔ متن کی قرأت اور سوال و وضاحت کے بعد طلبہ کو اپنی زبان میں خلاصہ لکھنے کی تاکید کی جاتی ہے جو فہم اور اظہار دونوں مہارتوں کو فروغ دیتا ہے۔

ریسی پروکل تدریس کے اطلاقی مسائل

اساتذہ کی تربیت: ریسی پروکل تدریسی طریقہ کے مؤثر اطلاق کے لیے ضروری ہے کہ استاد اس طریقے کے مقاصد اور اس کے مراحل سے اچھی طرح واقف ہو اور ہر ایک مرحلہ کو مؤثر ڈھنگ سے بروئے کار لانے کی مہارت رکھتا ہو۔ استاد کو چاہیے کہ اس طریقہ کو اپنے تدریسی عمل میں شامل کرنے سے پہلے اس کی بہتر تیاری کرے۔

مطابقت پذیری: زبان کی مختلف مہارتوں کی تدریس میں کچھ تدابیر طلبہ کے لیے ابتداً مشکل ہوتی ہیں جیسے سوالات کرنا، وضاحت کرنا اور خلاصہ بیان کرنا۔ لہٰذا استاد کو چاہیے کہ وہ ہر مراحل کو اچھی طرح واضح کردے اور طلبہ کو جہاں کہیں دقت پیش آتی ہو وہاں ان کی مدد کرے۔

وقت کی ترتیب: ریسی پروکل تدریسی طریقہ میں وقت بہت اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس لیے استاد کو وقت کے حساب سے مناسب مواد کا انتخاب اور منصوبہ بندی پہلے کرلینا چاہیے۔

استاد کمرۂ جماعت میں کسی کہانی کا اشارہ دے کر طلبہ سے اندازہ لگانے، سوالات کرنے، وضاحت کرنے اور تلخیص پیش کرنے کے لیے کہتا ہے۔ طلبہ متن کی قرأت سے پہلے مضمون کے مواد کا اندازہ لگاتے ہیں اور دورانِ قرأت غور وفکر کرتے ہیں تاکہ وہ پلاٹ یا کرداروں کے متعلق سوالات کرسکے، الفاظ کی وضاحت کرسکے اور خلاصہ بیان کرسکے۔ اس طرح طلبہ ایک دوسرے کے باہمی تعاون اور اشتراک سے زبان کی آموزش کرتے ہیں۔

ریسی پروکل تدریس کو مؤثر بنانے کی اضافی حکمت عملیاں

اسکاف فولڈنگ (حمایتی تعاون): استاد ریسی پروکل تدریس کے مؤثر اور نتیجہ خیز استعمال کے لیے ہر ایک مرحلہ کا ابتدائی خاکہ پیش کرسکتا ہے تاکہ طلبہ خود سے ان مراحل کے استعمال کے قابل ہوسکیں۔ مثلاً استاد سبق سے متعلق مواد یا تصاویر دکھا کر سوالات جیسے کیا ہوسکتا ہے؟ کیوں، کیا ہوگا کی مثالیں دے سکتا ہے تاکہ طلبہ کو تنقیدی انداز میں سوچنے اور سوالات بنانے میں مدد مل سکے۔

کردار کی تبدیلی: استاد طلبہ کو مختلف جماعتوں میں تقسیم کرکے ہر جماعت سے باری باری سرگرمی کراسکتا ہے۔ ہر جماعت سے ایک طالب علم پیشن گوئی کرے گا اور دوسرا سوالات کرے گا وغیرہ۔ کردار کی یہ تبدیلی ہر طالب علم کو مختلف مراحل کی قیادت کرنے اور ان میں فعال شرکت کرنے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔

زبان کی تعلیم میں ریسی پروکل تدریس کا کردار: ریسی پروکل تدریس ایک ایسا آموزشی ماحول فراہم کرتی ہے جو غیر فعال اکتسابی فضا سے کہیں زیادہ مؤثر، نتیجہ خیز اور سرگرم ہوتا ہے۔ طلبہ پیش گوئی، سوالات کی تشکیل، وضاحت اور خلاصہ کے اظہار پر دھیان دے کر مستحکم تجزیاتی اور مواصلاتی صلاحیتیں حاصل کرسکتے ہیں۔ یہ مہارتیں زبان کی آموزش اور تدریسی مقاصد کے حصول میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ریسی پروکل تدریس طلبہ میں نہ صرف فہم وادراک کی مہارت میں اضافہ کرتی ہے بلکہ ان میں خود آموزش، خود مختاری، تنقیدی سوچ اور تعاون کی صلاحیتوں کو بھی فروغ دیتی ہے۔

■

Imtiyaz Ahmad
Asst. Professor, Dept of Teacher Training & Semi Modern Education
Faculty of Education
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.:9911752717
imtiyaz7262@gmail.com

نازش احتشام اعظمی

دائمی امراض میں یوگا کی افادیت

یوگا جو انسانیت کی قدیم ترین خود آگہی اور شفایابی کی روایات میں سے ایک ہے، ہزاروں برسوں سے جسمانی صحت، ذہنی توازن اور روحانی بیداری کا ذریعہ رہا ہے۔ اس کی جڑیں قدیم ہندوستانی فلسفوں، بشمول ویدک، بدھسٹ، اور جین تعلیمات، نیز طب یونانی کے اصولوں جیسے کہ ریاضت (جسمانی نظم و مشق) اور تدبیر (انفرادی علاج) سے ملتی ہیں۔ یوگا جسم، ذہن اور روح کے اتحاد پر زور دیتا ہے، جو صحت کو محض بیماری کی غیر موجودگی سے کہیں زیادہ، ایک متحرک توازن اور خود اختیاری کی حالت سمجھتا ہے۔ آج، جب عالمی سطح پر دائمی بیماریاں، جیسے ذیابیطس، بلند فشار خون، گٹھیا، دائمی درد اور ذہنی صحت کے مسائل، تیزی سے بڑھ رہے ہیں، علاجی یوگا ایک ہمہ جہت، سائنسی طور پر توثیق شدہ، اور قابل رسائی شفایابی کے طریقے کے طور پر ابھرا ہے۔

علاجی یوگا کوئی محض جسمانی مشق نہیں، بلکہ نرم حرکات، سانس کی منظم تکنیکوں (پرانایاما)، اور شعوری آگہی (مراقبہ اور ہوشیاری) کا ایک مربوط نظام ہے، جو جسم و ذہن کے درمیان گہری ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ یہ قدیم یوگک حکمت کو جدید سائنسی علوم، جیسے نیورو پلاسٹیسٹی، ہارمونی توازن، اور نفسیاتی فزیالوجی کے ساتھ جوڑتا ہے، جس سے دائمی بیماریوں کے نظم و نسق میں اس کی اہمیت مسلسل بڑھ رہی ہے۔ اس مضمون میں علاجی یوگا کے اصول، اس کے سائنسی ثبوت، دائمی بیماریوں میں اس کے فوائد، اور اس کے عملی اطلاقات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا، جو جدید تحقیقات اور قدیم روایات کے امتزاج سے مزید تقویت یافتہ ہے۔

علاجی یوگا: ایک ہمہ جہت اور سائنسی بنیادوں پر قائم نظام

علاجی یوگا روایتی یوگا کی ایک نرم شکل سے کہیں زیادہ ہے؛ یہ ایک شعوری طور پر تیار کردہ، تحقیق پر مبنی، اور انفرادی ضروریات کے مطابق ڈھالا گیا طریقہ ہے، جو شفایابی اور صحت کے نظم و نسق پر مرکوز ہے۔ جہاں روایتی یوگا کا بنیادی مقصد اکثر روحانی بیداری یا جسمانی فٹنس ہوتا ہے، وہیں علاجی یوگا فوری طور پر جسمانی، نفسیاتی، اور جذباتی استحکام کو فروغ دینے پر زور دیتا ہے۔ یہ نظام قدیم یوگک فلسفوں، جیسے کہ پتنجلی کے یوگ سوتر میں بیان کردہ آشتانگ یوگا (جس میں یم، نیام، آسن، پرانایاما، اور دھیان شامل ہیں)، اور جدید سائنسی اصولوں، جیسے کہ نیورواینڈوکرائن توازن، سوزش کے ردعمل کی کمی، اور دماغی لچک (neuroplasticity)، کو یکجا کرتا ہے۔

علاجی یوگا کی تاثیر کو متعدد سائنسی مطالعات نے تسلیم کیا ہے، جن میں گٹھیا، ذیابیطس، بلند فشار خون، دائمی درد، اور ذہنی صحت کے امراض جیسے ڈپریشن اور اینگزائٹی کے نظم و نسق میں اس کے مثبت اثرات شامل ہیں۔ مثال کے طور پر، جرنل آف ریمیٹولوجی (2023) میں شائع ایک میٹا تجزیہ نے ثابت کیا کہ علاجی یوگا گٹھیا کے مریضوں میں درد کی شدت کو 30-40% تک کم کر سکتا ہے، جبکہ امریکن جرنل آف سائیکاٹری (2024) نے اسے ڈپریشن کے علاج میں ایک مؤثر معاون تھراپی قرار دیا۔ یہ نتائج یوگا کی لازوال حکمت اور جدید سائنسی تصدیق کے درمیان ایک پل کی مانند ہیں، جو اسے ایک ہمہ جہت شفایابی کا نظام بناتے ہیں۔

دائمی بیماریوں کے نظم و نسق میں عالمی اہمیت

دائمی بیماریاں، جیسے کہ قلبی امراض، ذیابیطس، اور کینسر، عالمی اموات کی سب سے بڑی وجہ ہیں۔ عالمی ادارہ صحت (WHO) کے مطابق، دائمی بیماریاں سالانہ 41 ملین اموات کا سبب بنتی ہیں، جو عالمی اموات کا 74% ہیں۔ روایتی طب، اگرچہ علامات کے علاج میں مؤثر ہے، لیکن اکثر پائیدار حل یا مضر اثرات سے پاک نظم و نسق فراہم کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ اس خلا نے متبادل اور تکمیلی علاج، بالخصوص علاجی یوگا، کی مانگ کو بڑھایا ہے۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ (NIH) اور WHO جیسے اداروں نے یوگا کو دائمی بیماریوں کے لیے ایک معاون تھراپی کے طور پر تسلیم کیا ہے، جو نہ صرف معیارِ زندگی کو بہتر بناتا ہے بلکہ ادویات پر انحصار کو کم کرتا ہے اور مریضوں کو اپنی صحت یابی کے عمل میں فعال کردار ادا کرنے کی صلاحیت دیتا ہے۔

یہ رجحان قدیم یوگک اور طب یونانی کے تصورات کی عکاسی کرتا ہے، جہاں صحت کو محض بیماری کی عدم موجودگی کے بجائے جسم، ذہن، اور ماحول کے درمیان ایک متحرک توازن کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ علاجی یوگا اس توازن کو بحال کرنے کے لیے ایک قابل عمل، کم لاگت، اور عالمی طور پر قابل اطلاق ذریعہ پیش کرتا ہے۔

نرم حرکات، سانس کی مشق، اور شعوری آگہی کا امتزاج

علاجی یوگا تین بنیادی ستونوں پر قائم ہے: نرم حرکات،

سانس کی منظم مشقیں (پرانایاما)، اور شعوری آگہی (مراقبہ اور ہوشیاری)۔ یہ عناصر مل کر ایک طاقتور شفایابی کا مثلث تشکیل دیتے ہیں، جو جسم و ذہن کے درمیان گہری ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔

1. **نرم حرکات:** یہ حرکات جوڑوں، عضلات، اور بافتوں کو بغیر دباؤ کے فعال اور غذائیت یافتہ رکھتی ہیں۔ یہ کم اثر والی مشقیں، جیسے کہ سوکھشما یوگا یا کرسی پر مبنی آسن، خاص طور پر محدود حرکات رکھنے والوں کے لیے ڈیزائن کی جاتی ہیں۔ یہ حرکات خون کے بہاؤ، لمفی نکاسی، اور اعصابی وعضلاتی انضمام کو فروغ دیتی ہیں، جو دائمی بیماریوں کے نظم و نسق میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

2. **سانس کی مشقیں (پرانا یاما):** سانس کو یوگک روایات میں زندگی کی توانائی (پرانا) سمجھا جاتا ہے۔ پرانایاما تکنیکیں، جیسے کہ ڈایافرامی سانس لینا، انولیما ولوما (متبادل نتھنوں سے سانس)، اور بھرامری (ہمنگ بی سانس)، خودکار اعصابی نظام کو متوازن کرتی ہیں، تناؤ کے ہارمونز (کورٹیسول) کو کم کرتی ہیں، اور پیرا اسیمپیتھیٹک اعصابی نظام (آرام اور ہضم کا نظام) کو متحرک کرتی ہیں۔ یہ تکنیکیں قلبی صحت، آکسیجن کی سطح، اور جذباتی استحکام کو بہتر بناتی ہیں۔

3. **شعوری آگہی (مراقبہ اور ہوشیاری):** مراقبہ اور ہوشیاری فرد کو اپنی داخلی حالت سے گہرا تعلق استوار کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ یہ مشقیں ذہنی انتشار کو کم کرتی ہیں، جذباتی لچک کو فروغ دیتی ہیں، اور نیوروکیمیکل توازن (جیسے سیروٹونن اور گابا کی سطح میں اضافہ) کو بہتر بناتی ہیں۔ ہوشیاری کی تکنیکیں جیسے کہ باڈی اسکین یا رہنمائی یافتہ دھیان، دائمی درد اور ذہنی صحت کے مسائل کے نظم و نسق میں خاص طور پر مؤثر ہیں۔

یہ امتزاج طب یونانی کے اصول علاج بالریاضت سے مماثلت رکھتا ہے، جو جسم کی داخلی قوتوں کو نظم و ضبط اور اعتدال کے ذریعے شفایابی کے لیے استعمال کرنے پر زور دیتا ہے۔ علاجی یوگا اسی طرح جسم کی فطری شفایابی کی صلاحیت کو بیدار کرتا ہے، جو جدید نیوروسائنس اور فزیالوجی کے مطابق دماغ-جسم کے رابطے کو تقویت دیتا ہے۔

علاجی یوگا کیا ہے؟

علاجی یوگا یوگک اصولوں اور تکنیکوں کا ایک خاص طور پر ڈھالا گیا اطلاق ہے، جو صحت کے مخصوص مسائل کی شفایابی اور نظم و نسق کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ ایک انفرادی، ہمدرد، اور صبر پر مبنی طریقہ ہے، جو فرد کی جسمانی حدود، نفسیاتی ضروریات، اور طرزِ زندگی کو مدنظر رکھتا ہے۔ اس کا مقصد پیچیدہ آسنوں میں مہارت حاصل کرنا نہیں، بلکہ ایک قابل رسائی، پائیدار، اور مؤثر شفایابی کا عمل تخلیق کرنا ہے۔

علاجی یوگا میں شامل ہیں:

آسان آسن: جو خاص حالتوں کے لیے ترمیم شدہ ہوتے ہیں، جیسے کہ گٹھیا کے مریضوں کے لیے جوڑوں کے تحفظ والے آسن۔

❖ **سانس کی مشقیں:** جو تناؤ کے ردعمل کو کم کرتی ہیں اور توانائی کی سطح کو متوازن کرتی ہیں۔

❖ **آرام دہ تکنیکیں:** جیسے کہ یوگ ندرا یا پروگریسیو مسل ریلیکسیشن، جو گہری بحالی کو فروغ دیتی ہیں۔

❖ **رہنمائی یافتہ مراقبہ:** جو ذہنی وضاحت اور جذباتی استحکام کو بڑھاتا ہے۔

❖ **طرز زندگی کی تعلیم:** جو غذا، نیند، اور روزمرہ کی عادات کو بہتر بنانے پر زور دیتی ہے، جو طب یونانی کے تدبیری اصولوں سے ہم آہنگ ہے۔

علاجی یوگا کے اصول ہمدردی، موافقت، اور خود اختیاری پر مبنی ہیں، جو اسے ایک عالمگیر اور شامل نظام بناتے ہیں۔

انفرادی اور قابل رسائی مشقوں پر توجہ

علاجی یوگا عام فٹنس کلاسوں سے مختلف ہے، کیونکہ یہ انفرادی صحت کی حالتوں، حرکات کی حدود، درد کی سطح، اور ذاتی اہداف کے تفصیلی جائزے پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کی مشقیں سہارا دینے والے اوزار، جیسے کہ بولسٹرز، بلاکس، یا کرسیوں، کے استعمال سے قابل رسائی بنائی جاتی ہیں، تاکہ ہر فرد، چاہے وہ شدید جسمانی حدود رکھتا ہو، محفوظ اور فائدہ مند طریقے سے حصہ لے سکے۔ مثال کے طور پر، ایک ویل چیئر پر منحصر شخص کے لیے کرسی پر مبنی یوگا پروگرام تیار کیا جا سکتا ہے، جو اس کی مخصوص ضروریات کے مطابق ہو۔

یہ انفرادی نقطہ نظر طب یونانی کے تصور 'مزاج' سے گہری مماثلت رکھتا ہے، جہاں علاج کو مریض کی منفرد جسمانی اور نفسیاتی خصوصیات کے مطابق ڈھالا جاتا ہے۔ علاجی یوگا اسی طرح ہر فرد کے لیے ایک منفرد شفایابی کا راستہ تخلیق کرتا ہے۔

روایتی یوگا سے تفاوت

روایتی یوگا، جیسا کہ آج کل بہت سے اسٹوڈیوز میں سکھایا جاتا ہے، اکثر جسمانی فٹنس، لچک، یا روحانی ترقی پر مرکوز ہوتا ہے۔ اس کی کلاسیں تیز رفتار، مسابقتی، یا جسمانی طور پر سخت ہو سکتی ہیں، جو دائمی بیماریوں کے شکار افراد کے لیے غیر موزوں ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس، علاجی یوگا شفایابی کو اولین ترجیح دیتا ہے۔ اس کی مشقیں دھیمی، باشعور، اور طبی حالتوں کے مطابق ترمیم شدہ ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر، بلند فشار خون کے مریضوں کے لیے ایسی سانس کی مشقیں تجویز کی جاتی ہیں جو پیرا اسیمپیتھیٹک نظام کو متحرک کریں، جبکہ گٹھیا کے مریضوں کے لیے ایسی حرکات جو جوڑوں پر دباؤ نہ ڈالیں۔

علاجی یوگا 'اہنسا' (غیر تشدد) کے یوگک اصول پر عمل کرتا ہے، جس کے تحت جسم پر غیر ضروری دباؤ ڈالنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ یہ نقطہ نظر اسے روایتی یوگا سے منفرد بناتا ہے اور اسے ایک محفوظ، شامل، اور شفابخش عمل کے طور پر پیش کرتا ہے۔

دائمی بیماریوں میں علاجی یوگا کے فوائد

علاجی یوگا دائمی بیماریوں کے نظم و نسق میں متعدد جسمانی، نفسیاتی، اور جذباتی فوائد پیش کرتا ہے۔ ذیل میں چند اہم حالات اور ان کے لیے علاجی یوگا کے اثرات کا جائزہ دیا گیا ہے، جو جدید تحقیقات سے تقویت یافتہ ہیں۔

1. **گٹھیا (Arthritis):** گٹھیا جوڑوں کی سوزش، اکڑن، اور درد کا سبب بنتا ہے، جو معیارِ زندگی کو شدید متاثر کرتا ہے۔ علاجی یوگا اس کے نظم و نسق میں مندرجہ ذیل طریقوں سے مدد دیتا ہے:

جوڑوں کی حرکت پذیری: نرم کھنچاؤ اور حرکات، جیسے کہ سوپتا پادانگھوشتھاسن (ریکلائنڈ بگ ٹو پوز)، جوڑوں کو چکناہٹ فراہم کرتی ہیں اور اکڑن کو کم کرتی ہیں۔

عضلاتی مضبوطی: گردونواح کے پٹھوں کو مضبوط کر کے جوڑوں پر دباؤ کم کیا جاتا ہے، جیسے کہ تڑاسان (ماؤنٹین پوز) کی ترمیم شدہ شکل۔

درد کا نظم: ہوشیاری کی تکنیکیں درد کے احساس کو تبدیل کرتی ہیں، جبکہ آرام دہ مشقیں، جیسے کہ یوگ ندرا، تناؤ کو کم کرتی ہیں۔

جرنل آف کلینیکل ریمیٹولوجی (2024) کی ایک تحقیق کے مطابق، 12 ہفتوں تک علاجی یوگا کی باقاعدہ مشق کرنے والے گٹھیا کے مریضوں میں درد کے اسکور میں 35% کمی اور معذوری کی سطح میں 20% بہتری

دیکھی گئی۔ یہ نتائج مریضوں کو خود نگہداشت کی حکمت عملیوں سے بااختیار بناتے ہیں، جس سے غیر سٹیرائیڈل اینٹی انفلیمیٹری ادویات (NSAIDs) پر انحصار کم ہوتا ہے۔

2. **ذیابیطس:** ذیابیطس، جو میٹابولک عدم توازن کی وجہ سے خون میں شکر کی بلند سطح کا باعث بنتا ہے، علاجی یوگا کے جامع فریم ورک سے گہرا فائدہ اٹھاتا ہے:

گلیسیمک کنٹرول: آسن جیسے کہ داندھاسن (اسٹاف پوز) اور پشچمو تاسن (سیٹڈ فورورڈ بینڈ) لبلبے کو متحرک کرتے ہیں اور انسولین حساسیت کو بہتر بناتے ہیں۔

تناؤ میں کمی: سانس کی مشقیں اور مراقبہ کورٹیسول کی سطح کو کم کرتے ہیں، جو خون میں شکر کے توازن کو مستحکم کرتا ہے۔

وزن کا نظم: نرم حرکات میٹابولزم کو بہتر بناتی ہیں اور وزن کے انتظام میں مدد دیتی ہیں، جو ٹائپ 2 ذیابیطس کے لیے اہم ہے۔

ایک 2023 کی تحقیق، جو ڈایابیٹس کیئر جرنل میں شائع ہوئی، نے ثابت کیا کہ علاجی یوگا کرنے والے افراد میں HbA1c کی سطح میں 0.8-12% کمی ہوئی، جو دوائیوں کے مقابلے میں ایک نمایاں بہتری ہے۔ یہ نتائج قدیم یوگک مشقوں کی جدید میٹابولک علاج کے ساتھ ہم آہنگی کو ظاہر کرتے ہیں۔

3. **بلند فشار خون (Hypertension):** بلند فشار خون، جو قلبی امراض کا ایک بڑا خطرہ ہے، علاجی یوگا کے ذریعے مؤثر طریقے سے منظم کیا جا سکتا ہے:

آرام دہ تکنیکیں: پروگریسیو مسل ریلیکسیشن اور رہنمائی یافتہ مراقبہ خون کے دباؤ کو کم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ایک 10 منٹ کی شاواسان (کارپس پوز) سیشن سسٹولک بلڈ پریشر کو 5-10mmHg تک کم کر سکتا ہے۔

سانس کا نظم: انولیما ولوما اور بھرامری پراناياما بارو ریفلیکس حساسیت کو بہتر بناتے ہیں اور رگوں کی مزاحمت کو کم کرتے ہیں۔

قلبی صحت: نرم حرکات، جیسے کہ ترمیم شدہ سوریہ نمسکار، دل کی دھڑکن کے تغیر (HRV) کو بہتر بناتی ہیں۔

جرنل آف ہائپرٹینشن (2024) کی ایک تحقیق نے ثابت کیا کہ 8 ہفتوں تک علاجی یوگا کی مشق کرنے والوں میں سسٹولک بلڈ پریشر میں اوسطاً 12mmHg اور ڈائیسٹولک پریشر میں 8mmHg کمی ہوئی۔ یہ اثرات یوگک فلسفے کے اس اصول کی تصدیق کرتے ہیں کہ سانس جسم اور ذہن کے درمیان ایک پل ہے۔

4. **دائمی درد:** دائمی درد، چاہے وہ فائبرو مائلجیا، کمر درد، یا مائگرین کی شکل میں ہو، جسمانی اور جذباتی صحت کو متاثر کرتا ہے۔ علاجی یوگا اسے درج ذیل طریقوں سے حل کرتا ہے:

درد کے احساس کا نظم: ہوشیاری کی تکنیکیں، جیسے کہ باڈی اسکین، دماغ کے درد سے متعلق مراکز (جیسے انسولا اور ایمیگڈالا) کی سرگرمی کو کم کرتی ہیں۔

جسمانی اصلاح: آسن جیسے کہ بالاسان (چائلڈ پوز) یا سوپتا بادھا کوناسان (ریکلائنڈ باؤنڈ اینگل پوز) تناؤ کے نمونوں کو درست کرتے ہیں اور معاون پٹھوں کو مضبوط کرتے ہیں۔

نفسیاتی فوائد: مراقبہ موڈ کو بہتر بناتا ہے اور درد سے متعلق بے چینی کو کم کرتا ہے۔

ایک 2023 کی تحقیق، جو پین مینجمنٹ جرنل میں شائع ہوئی، نے ثابت کیا کہ علاجی یوگا دائمی کمر درد کے مریضوں میں درد کی شدت کو 40% تک کم کرتا ہے اور فعالیت کے اسکورز میں 25% بہتری لاتا ہے۔ یہ نتائج غیر دوائی علاج کے طور پر یوگا کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

5. **ذہنی صحت کے مسائل:** ذہنی صحت، جو جسمانی بہبود سے گہرائی سے جڑی ہے، علاجی یوگا کے ذریعے نمایاں طور پر بہتر ہوتی ہے:

بے چینی اور ڈپریشن: سانس کی مشقیں اور مراقبہ پیراسیمپیتھیٹک نظام کو متحرک کرتے ہیں، جو تناؤ کے ردعمل کو کم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، بھرامری پراناياما واگس اعصاب کی سرگرمی کو بڑھاتا ہے، جو آرام کی حالت کو فروغ دیتا ہے۔

جذباتی نظم: ہوشیاری کی مشقیں افراد کو اپنے جذبات کو بغیر ردعمل کے مشاہدہ کرنے کی صلاحیت دیتی ہیں، جو پی ٹی ایس ڈی اور منشیات کی لت سے صحت یابی میں مددگار ہے۔

ادراکی لچک: مراقبہ دماغ کے پریفرنٹل کورٹیکس میں سرمئی مادے کی مقدار کو بڑھاتا ہے، جو فیصلہ سازی اور جذباتی توازن کو بہتر بناتا ہے۔

ایک 2024 کی میٹا تجزیہ، جو فرنٹیئرز ان سائیکاٹری میں شائع ہوئی، نے ثابت کیا کہ علاجی یوگا ڈپریشن کے شکار افراد میں علامات کو 50% تک کم کرتا ہے اور اینگزائٹی کے اسکورز میں 40% بہتری لاتا ہے۔ یہ نتائج یوگک اور یونانی روایات کے اس اصول کی تصدیق کرتے ہیں کہ ذہن اور جسم ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔

علاجی یوگا کے سائنسی پہلو

علاجی یوگا کی تاثیر اب ایک وسیع تحقیقی مواد سے ثابت ہوتی ہے، جو اس کے فزیولوجیکل، نفسیاتی، اور اعصابی اثرات کو اجاگر کرتا ہے۔ اہم نتائج میں شامل ہیں:

فزیولوجیکل فوائد: یوگا دل کی دھڑکن کے تغیر (HRV) کو بہتر بناتا ہے، سوزش کے نشانات (جیسے CRP اور IL-6) کو کم کرتا ہے، اور قوت مدافعت کے نظام کو مضبوط کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، ایک 2023 کی تحقیق نے ثابت کیا کہ یوگا ٹی سیل کی سرگرمی کو 20% تک بڑھاتا ہے، جو انفیکشن کے خلاف مزاحمت کو بہتر بناتا ہے۔

نفسیاتی فوائد: یوگا کورٹیسول کی سطح کو 25-30% تک کم کرتا ہے، موڈ کو بہتر بناتا ہے، اور ادراکی کارکردگی (جیسے توجہ اور یادداشت) کو بڑھاتا ہے۔

اعصابی اثرات: یوگا دماغ کے ایمیگڈالا اور ہپوکیمپس جیسے حصوں میں سرمئی مادے کی مقدار کو بڑھاتا ہے، جو جذباتی نظم اور یادداشت سے وابستہ ہیں۔ نیوروامیجنگ مطالعات (2024) سے پتہ چلتا ہے کہ 8 ہفتوں کی یوگا مشق دماغ کے ڈیفالٹ موڈ نیٹ ورک (DMN) کی سرگرمی کو متوازن کرتی ہے، جو ذہنی صحت کے لیے اہم ہے۔

علاجی یوگا کا بنیادی میکانزم اس کے سمپیتھیٹک اعصابی نظام (لڑائی یا پرواز) کو پرسکون کرنے اور پیراسیمپیتھیٹک نظام (آرام اور ہضم) کو متحرک کرنے کی صلاحیت میں مضمر ہے۔ یہ عمل جسم میں ایک شفا یابی کی حالت پیدا کرتا ہے، جو دائمی بیماریوں کے بنیادی عوامل، جیسے کہ سوزش اور تناؤ، کو حل کرتا ہے۔

علاجی یوگا کے اہم اجزا

1. **نرم حرکات:** نرم حرکات علاجی یوگا کا بنیادی ستون ہیں۔ یہ حرکات:

- کم اثر والی اور احتیاط سے ترتیب دی گئی ہوتی ہیں، تاکہ چوٹ یا دباؤ سے بچا جا سکے۔
- سیدھ بندی، حرکت کی فنکشنل حد، اور پٹھوں کے توازن پر مرکوز ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر، ترمیم شدہ اتراسان (فورورڈ فولڈ) کمر کے نچلے حصے کی لچک کو بہتر بناتا ہے۔

• محدود حرکت والوں کے لیے سہارا دینے والے اوزار یا کرسی پر مبنی متبادل استعمال کیے جاتے ہیں، جیسے کہ کرسی پر بیٹھ کر کیا جانے والا ورکشاسان (ٹری پوز)۔

یہ حرکات خون کے بہاؤ، لمفی نکاسی، اور اعصابی و عضلاتی انضمام کو فروغ دیتی ہیں، جو شفایابی اور توانائی کے لیے ضروری ہیں۔

2. **سانس کی مشقیں:** سانس کو یوگا اور طب یونانی دونوں میں زندگی کی توانائی سمجھا جاتا ہے۔ علاجی یوگا میں سانس کی مشقیں، جیسے کہ:

• **ڈایافرامی سانس:** آکسیجن کی سطح کو بہتر بناتی ہے اور ذہن کو پرسکون کرتی ہے۔

• **انولیما ولوما:** اعصابی نظام کے دونوں حصوں (سمپیتھیٹک اور پیرا سمپیتھیٹک) کو متوازن کرتی ہے۔

• **بھرامری:** واگس اعصاب کو متحرک کرتی ہے، جو آرام کی حالت کو فروغ دیتی ہے۔

یہ تکنیکیں تھکن کو کم کرتی ہیں، توانائی کی سطح کو بڑھاتی ہیں، اور جذباتی توازن کو بحال کرتی ہیں۔ ایک 2024 کی تحقیق نے ثابت کیا کہ 6 ہفتوں تک روزانہ 10 منٹ پرانایاما کرنے سے کورٹیسول کی سطح 20% کم ہوتی ہے۔

3. **مراقبہ اور ہوشیاری:** مراقبہ اور ہوشیاری علاجی یوگا کی روح ہیں۔ یہ مشقیں:

• موجودہ لمحے کی آگاہی کو بڑھاتی ہیں، ذہنی انتشار اور بے چینی کو کم کرتی ہیں۔

• جذباتی بہبود کو فروغ دیتی ہیں، شکرگزاری، خود ہمدردی، اور لچک کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔

• نیورو کیمیکل توازن کو بہتر بناتی ہیں، جیسے کہ سیروٹونن اور گابا کی سطح میں اضافہ۔

ایک 2023 کی تحقیق، جو جرنل آف نیوروسائنس میں شائع ہوئی، نے ثابت کیا کہ ہوشیاری کی مشقیں دماغ کے ایمیگڈالا کی سرگرمی کو 30% تک کم کرتی ہیں، جو تناؤ اور بے چینی کے ردعمل کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ اثرات دائمی بیماریوں کے نظم و نسق میں مراقبہ کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

عملی اطلاقات

علاجی یوگا کی شروعات: علاجی یوگا شروع کرنے کے لیے ایک رہنمائی یافتہ اور تعاون پر مبنی نقطہ نظر ضروری ہے:

• **طبی مشاورت:** صحت کے ماہرین سے مشورہ کریں تاکہ یوگا آپ کی حالت کے لیے محفوظ اور موزوں ہو۔

• **مستند انسٹرکٹرز:** سند یافتہ علاجی یوگا انسٹرکٹرز کی تلاش کریں، جو اناٹومی، پیتھالوجی، اور موافقت پذیر تکنیکوں میں مہارت رکھتے ہوں۔ انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف یوگا تھراپسٹس (IAYT) سے تصدیق شدہ انسٹرکٹرز کو ترجیح دیں۔

> **علاجی یوگا، جس کی جڑیں قدیم یوگک حکمت اور طب یونانی کے اصولوں میں ہے، جدید سائنسی تحقیقات سے توثیق یافتہ ایک ہمہ جہت شفا یابی کا نظام ہے۔ یہ جسم، سانس، اور ذہن کو یکجا کر کے نہ صرف دائمی بیماریوں کی علامات کو کم کرتا ہے، بلکہ ان کے بنیادی عدم توازن کو بھی حل کرتا ہے۔ گٹھیا، ذیابیطس، بلند فشار خون، دائمی درد، اور ذہنی صحت کے مسائل کے نظم و نسق میں اس کی ثابت شدہ تاثیر اسے ایک عالمگیر اور قابل رسائی علاج بناتی ہے۔**

• **ذاتی پروگرام:** اپنی صلاحیتوں، اہداف، اور حدود کے مطابق ذاتی نوعیت کا منصوبہ تیار کریں۔ مثال کے طور پر، ایک گٹھیا کے مریض کے لیے جوڑوں کے تحفظ والے آسن اور آرام دہ تکنیکیں شامل کی جا سکتی ہیں۔

روزمرہ زندگی میں انضمام

علاجی یوگا کو روزمرہ کی زندگی میں شامل کرنا آسان اور مؤثر ہو سکتا ہے:

• **مختصر سیشنز:** صبح یا شام کے معمولات میں 10-20 منٹ کے سیشن شامل کریں۔ مثال کے طور پر، صبح 5 منٹ ڈایافرامی سانس اور 10 منٹ نرم کھنچاؤ توانائی کی سطح کو بڑھاتے ہیں۔

• **آن لائن وسائل:** یوٹیوب یا ایپس جیسے کہ Insight Timer پر رہنمائی یافتہ علاجی یوگا سیشنز استعمال کریں، جو مخصوص حالتوں کے لیے تیار کیے گئے ہوں۔

• **تکمیلی علاج:** یوگا کو فزیوتھراپی، سائیکوتھراپی، یا ادویات کے ساتھ ملائیں تاکہ ایک جامع علاج کا پروگرام بنایا جا سکے۔

چیلنجز اور احتیاطات

علاجی یوگا کے باوجود چند چیلنجز ہیں جن پر توجہ ضروری ہے:

• **رسائی:** بزرگوں، معذور افراد، اور محروم طبقات کے لیے یوگا پروگراموں کو مزید قابل رسائی بنانے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر، کمیونٹی سینٹرز میں مفت یا کم لاگت سیشنز کا اہتمام کیا جا سکتا ہے۔

• **غلط فہمیاں:** یوگا کو صرف ایک جسمانی یا مذہبی مشق سمجھنے کی غلط فہمیوں کو تعلیم کے ذریعے دور کیا جائے۔ اس کے سائنسی اور عالمگیر فوائد پر زور دیں۔

• **انسٹرکٹرز کی تربیت:** علاجی یوگا انسٹرکٹرز کے لیے سخت معیارات اور طبی علم کی ضرورت ہے، تاکہ مشقیں محفوظ اور مؤثر ہوں۔

ثقافتی سالمیت، سائنسی سنجیدگی، اور ہمدردانہ خدمت کو یقینی بنانا علاجی یوگا کو جدید صحت کی دیکھ بھال میں ایک معتبر مقام دلائے گا۔

اختتامیہ

علاجی یوگا، جس کی جڑیں قدیم یوگک حکمت اور طب یونانی کے اصولوں میں ہے، جدید سائنسی تحقیقات سے توثیق یافتہ ایک ہمہ جہت شفایابی کا نظام ہے۔ یہ جسم، سانس، اور ذہن کو یکجا کر کے نہ صرف دائمی بیماریوں کی علامات کو کم کرتا ہے، بلکہ ان کے بنیادی عدم توازن کو بھی حل کرتا ہے۔ گٹھیا، ذیابیطس، بلند فشار خون، دائمی درد، اور ذہنی صحت کے مسائل کے نظم و نسق میں اس کی ثابت شدہ تاثیر اسے ایک عالمگیر اور قابل رسائی علاج بناتی ہے۔

ایک ایسی دنیا میں، جہاں بیماری، تناؤ، اور بے ربطی بڑھ رہی ہے، علاجی یوگا امید، صحت، اور ہم آہنگی کی روشنی پیش کرتا ہے۔ یہ ہر فرد کو اپنی شفایابی کے سفر میں ایک فعال شراکت دار بننے کی دعوت دیتا ہے۔ اگر آپ دائمی صحت کے مسائل کا سامنا کر رہے ہیں، تو کسی مستند علاجی یوگا انسٹرکٹر کی رہنمائی میں اس مشق کو اپنانے پر غور کریں۔ صحت، سکون، اور خود آگہی کا سفر ایک گہری، باشعور سانس سے شروع ہوتا ہے۔

■

Nazish Ehtesham Azmi
Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi- 110025
Mob.:9891651477
islahihealthcarefoundation@gmail.com

یوگ
شعور کی تہہ میں اترتا سکون

رئیس احمد

یوگ کوئی معمولی ورزش نہیں، بلکہ ایک ایسی قدیم مشق ہے جو جسم، دماغ، اور روح کو ایک خوبصورت ہم آہنگی میں باندھتی ہے۔ لفظ 'یوگ' سنسکرت سے آیا ہے، جس کا مطلب ہے 'اتحاد' یا 'جوڑنا'۔ یہ اتحاد نہ صرف ہمارے اندرونی وجود کے درمیان ہوتا ہے، بلکہ یہ ہمیں ہمارے ماحول، دوسرے لوگوں، اور کائنات سے بھی جوڑتا ہے۔

ہر سال 21 جون کو منایا جانے والا 'عالمی یوگا دیوس' اس بات کی یاد دہانی ہے کہ یوگ کس طرح دنیا بھر کے لوگوں کو صحت، سکون، اور اتحاد کی طرف لے جا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی عالمگیر تحریک ہے جو ہر عمر، ہر ثقافت، اور ہر پس منظر کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

یوگ کیا ہے؟

یوگ کو سمجھنے کے لیے اسے ایک سادہ لفظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ یہ ایک مشق ہے، ایک فن ہے، ایک سائنس ہے، اور سب سے بڑھ کر، ایک طرزِ زندگی ہے۔ اگر آپ یوگ کے بارے میں سوچتے ہیں تو شاید آپ کے ذہن میں لوگوں کے مشکل آسن کرتے ہوئے یا پرسکون انداز میں مراقبہ کرتے ہوئے مناظر آتے ہوں۔ لیکن یوگ اس سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔

یوگ اپنے دماغ کو پرسکون کرنے، اور اپنی روح کو آزاد کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ آپ کی اپنی رفتار سے اپنے اندر کی طرف ایک سفر ہے۔ چاہے آپ ایک مصروف پروفیشنل ہوں، گھریلو خاتون ہوں، طالب علم ہوں، یا ریٹائرڈ شخص، یوگ آپ کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور پیش کرتا ہے۔

یوگ کی خوبصورتی اس کی سادگی میں ہے۔ آپ کو کسی مہنگے سامان یا بڑے جم کی ضرورت نہیں۔ بس ایک پرسکون کونا، تھوڑا سا وقت، اور اپنے آپ سے جڑنے کی خواہش۔ یہ آپ کو سکھاتا ہے کہ آپ اپنی سانسوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر زندگی کے چیلنجز سے کیسے نمٹ سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسی عالمگیر زبان ہے جو ہر دل کو چھوتی ہے۔

یوگ کی تاریخی جڑیں: ایک قدیم ورثہ

یوگ کی جڑیں ہزاروں سال پرانی ہیں اور ہندوستان سے شروع ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا آغاز تقریباً 5000 سال قبل ویدک دور میں ہوا، جب رشی اور منی مراقبہ اور خود آگاہی کے ذریعے زندگی کے گہرے سوالات کے جواب تلاش کرتے تھے۔ یوگ کوئی جامد چیز نہیں تھی؛ یہ وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی اور پھیلتی رہی۔

پتنجلی کا یوگ سوتر: یوگ کی سب سے اہم دستاویز پتنجلی کے 'یوگ سوتر' ہیں، جو دوسری صدی قبل مسیح میں لکھے گئے۔ اس کتاب نے یوگ کو ایک منظم شکل دی اور اس کے آٹھ مراحل (اشٹانگ یوگ) بیان کیے:

1. یم: اخلاقی اصول، جیسے غیر تشدد، سچائی، ایمانداری، اور خود پر قابو۔
2. نیم: ذاتی نظم و ضبط، جیسے پاکیزگی، قناعت، خود مطالعہ، اور استقامت۔
3. آسن: جسمانی حرکات جو جسم کو مضبوط، لچکدار، اور متوازن بناتی ہیں۔
4. پرانایام: سانس کی مشقیں جو دماغ کو پرسکون کرتی ہیں اور توانائی کو بڑھاتی ہیں۔
5. پرتیاہار: حواس کو اندر کی طرف موڑنا، یعنی بیرونی دنیا سے توجہ ہٹانا۔
6. دھارنا: توجہ مرکوز کرنے کی صلاحیت۔
7. دھیان: گہرا مراقبہ جو دماغ کو مکمل سکون دیتا ہے۔
8. سمادھی: خود آگاہی کی بلند ترین حالت، جہاں انسان اپنے وجود کے ساتھ مکمل اتحاد محسوس کرتا ہے۔

یہ مراحل انسان کو ایک مکمل، متوازن، اور بامقصد زندگی کی طرف لے جاتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یوگ نے مختلف شکلیں اختیار کیں اور دنیا بھر میں پھیل گیا۔ آج یہ صرف ہندوستان تک محدود نہیں، بلکہ ایک عالمی رجحان بن چکا ہے۔ نیویارک کے سنٹرل پارک سے لے کر ٹوکیو کے یوگ اسٹوڈیوز تک، ہر جگہ لوگ یوگ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

یوگ کے فوائد: جسم، دماغ، اور روح کے لیے

یوگ کے فوائد اتنے زیادہ ہیں کہ انھیں گننا مشکل ہے۔ یہ جسم، دماغ، اور روح پر ایک ساتھ کام کرتا ہے، اور اس کے اثرات زندگی کے ہر پہلو میں نظر آتے ہیں۔ آئیے، ان فوائد کو سادہ اور انسانی انداز میں دیکھتے ہیں:

1. جسمانی صحت

لچک اور طاقت: اگر آپ کے جسم میں سختی ہے یا جوڑوں میں درد رہتا ہے، تو یوگ اسے آہستہ آہستہ ٹھیک کرتا ہے۔ یہ پٹھوں کو مضبوط بناتا ہے اور جسم کو لچکدار کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر آپ دن بھر بیٹھ کر کام کرتے ہیں، تو یوگ آپ کی کمر، کندھوں، اور گردن کے درد کو دور کر سکتا ہے۔

ہاضمہ: یوگ ہاضمے کے نظام کو بہتر بناتا ہے۔ اگر آپ کو گیس، قبض، یا بدہضمی کا مسئلہ ہے، تو کچھ مخصوص آسن جیسے پونمکتان آسن یا بھجنگ آسن اسے حل کر سکتے ہیں۔

دل کی صحت: یوگ بلڈ پریشر کو کنٹرول کرتا ہے، کولیسٹرول کی سطح کو کم کرتا ہے، اور دل کے امراض کے

خطرے کو کم کرتا ہے۔ یہ خون کے بہاؤ کو بہتر بناتا ہے اور دل کو صحت مند رکھتا ہے۔

مدافعتی نظام: یوگ جسم کے مدافعتی نظام کو مضبوط کرتا ہے جس سے آپ بیماریوں سے بہتر طور پر لڑ سکتے ہیں۔ باقاعدہ یوگ کرنے والے لوگ کم بیمار پڑتے ہیں۔

وزن کنٹرول: یوگ وزن کم کرنے یا اسے کنٹرول کرنے میں مددگار ہے۔ اگرچہ یہ جم کی طرح شدید ورزش نہیں، لیکن یہ میٹابولزم کو بہتر بناتا ہے اور غیر ضروری چربی کو کم کرتا ہے۔

2. **ذہنی سکون:**

تناؤ سے نجات: آج کی تیز رفتار زندگی میں تناؤ ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے۔ یوگ کی سانس کی مشقیں (پرانایام) جیسے انولوم ولوم یا بھسٹریکا تناؤ کو پگھلا دیتی ہیں۔ بس چند منٹ کی گہری سانس آپ کو تازگی دے سکتی ہے۔

بہتر نیند: اگر آپ رات کو ٹھیک سے نہیں سوتے، تو یوگ آپ کو گہری اور پرسکون نیند دے سکتا ہے۔ کچھ آسن جیسے شوان آسن یا مراقبہ نیند کے مسائل کو حل کرتے ہیں۔

توجہ اور یادداشت: یوگ دماغی صلاحیتوں کو بہتر بناتا ہے۔ اگر آپ طالب علم ہیں یا دفتری کام کرتے ہیں، تو یوگ آپ کی توجہ اور ارتکاز کو بڑھاتا ہے۔ مراقبہ آپ کے دماغ کو تیز اور صاف کرتا ہے۔

جذباتی توازن: یوگ آپ کو اپنے جذبات پر قابو پانے میں مدد دیتا ہے۔ یہ غصہ، پریشانی، یا اداسی کو کم کرتا ہے اور آپ کو زیادہ پرسکون بناتا ہے۔

3. **روحانی ترقی:**

یوگ آپ کو اپنے اندر جھانکنے کا موقع دیتا ہے۔ یہ آپ کو اپنی زندگی کے مقصد، خوشی، اور اندرونی سکون کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ کوئی مذہبی چیز نہیں، بلکہ ایک ذاتی سفر ہے جو آپ کو اپنے وجود سے جوڑتا ہے۔

مراقبے کے ذریعے آپ اپنے اندر ایک گہرا سکون تلاش کر سکتے ہیں، جو زندگی کی چھوٹی بڑی پریشانیوں سے لڑنے کی طاقت دیتا ہے۔

4. **دائمی مسائل کا حل:**

یوگ ذیابیطس، ہائی بلڈ پریشر، دمہ، آرتھرائٹس، اور دیگر دائمی امراض کے علاج میں مددگار ہے۔ یہ جسم کے قدرتی نظام کو بہتر بناتا ہے اور دوائیوں پر انحصار کم کرتا ہے۔

اگر آپ کو کمر درد، گردن کا درد، یا گھٹنوں کا درد ہے، تو یوگ کے کچھ مخصوص آسن جیسے ترُ آسن یا وجر آسن اسے ٹھیک کر سکتے ہیں۔

5. **ہارمونل توازن:**

یوگ ہارمونل عدم توازن کو درست کرتا ہے، جو خاص طور پر خواتین کے لیے فائدہ مند ہے۔ یہ ماہواری کے مسائل، تھائرائیڈ، اور دیگر ہارمونل مسائل میں مدد کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، سروانگ آسن یا متسی آسن ہارمونز کو متوازن کرتے ہیں۔

6. **جوانی اور تازگی:**

یوگ جسم کو اندر سے جوان رکھتا ہے۔ یہ جلد کو چمکدار بناتا ہے، بالوں کو مضبوط کرتا ہے، اور عمر کے اثرات کو کم کرتا ہے۔ باقاعدہ یوگ کرنے والے لوگ اپنی عمر سے کم نظر آتے ہیں۔

یوگ کی اقسام: ہر ایک کے لیے کچھ نہ کچھ

یوگ ایک وسیع سمندر کی طرح ہے، جس میں ہر ایک کے لیے کچھ نہ کچھ ہے۔ مختلف لوگوں کی ضروریات اور دلچسپیوں کے مطابق یوگ کی کئی اقسام ہیں۔ آیئے چند مشہور اقسام پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

1. **ہتھ یوگ:** یہ یوگ کی سب سے بنیادی شکل ہے، جو beginners کے لیے بہترین ہے۔ اس میں سادہ آسن اور سانس کی مشقیں شامل ہوتی ہیں۔ اگر آپ نے کبھی یوگ نہیں کیا، تو یہ شروع کرنے کے لیے بہترین آپشن ہے۔ یہ جسم کو لچکدار بناتا ہے، تناؤ کو کم کرتا ہے، اور دماغ کو پرسکون رکھتا ہے۔

2. **اشٹانگ یوگ:** یہ ایک تیز رفتار اور طاقتور یوگ ہے، جو مخصوص ترتیب میں آسنوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر آپ کو شدید ورزش پسند ہے، تو یہ آپ کے لیے ہے۔ یہ جسم کی طاقت، لچک، اور برداشت کو بڑھاتا ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے بہترین ہے جو ایک چیلنجنگ مشق چاہتے ہیں۔

3. **وینیاسا یوگ:** اس میں سانس کے ساتھ ہم آہنگی کے ساتھ آسن بدلے جاتے ہیں، جو ایک بہاؤ کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ یہ جسم کو گرم کرتا ہے اور لچک کو بہتر بناتا ہے۔

اگر آپ کو رقص یا روانی پسند ہے، تو یہ آپ کے لیے بہترین ہے۔

4. **بیکرم یوگ:** یہ گرم کمرے (تقریباً 40 ڈگری سینٹی گریڈ) میں کیا جاتا ہے اور اس میں 26 مخصوص آسن ہوتے ہیں۔ یہ پسینہ بہانے اور جسم کو detox کرنے میں مددگار ہے۔

اگر آپ گرمی برداشت کر سکتے ہیں، تو یہ آپ کے جسم کو اندر سے صاف کرے گا۔

5. **ین یوگ:** یہ ایک سست رفتار یوگ ہے جو گہرے ٹشوز اور جوڑوں پر کام کرتا ہے۔ اس میں آسنوں کو طویل عرصے تک (3-5 منٹ) روکا جاتا ہے۔

اگر آپ تناؤ سے نجات یا گہری سکون کی تلاش میں ہیں، تو یہ آپ کے لیے ہے۔

6. **کنڈلینی یوگ:** یہ زیادہ روحانی یوگ ہے، جو مراقبہ، منتر، اور سانس کی مشقوں پر زور دیتا ہے۔ اس کا مقصد اندرونی توانائی کو جگانا ہے۔

اگر آپ اپنے اندر گہرائی سے جھانکنا چاہتے ہیں، تو یہ آپ کے لیے بہترین ہے۔

7. **ریسٹوریٹو یوگ:** یہ ایک بہت ہی آرام دہ یوگ ہے، جو جسم اور دماغ کو مکمل سکون دیتا ہے۔ اس میں کم آسن ہوتے ہیں اور زیادہ تر آرام کی پوزیشنز استعمال کی جاتی ہیں۔

اگر آپ کو تناؤ یا تھکاوٹ ہے، تو یہ آپ کو نئی توانائی دے گا۔

8. **ایریل یوگ:** یہ ایک جدید شکل ہے، جس میں جھولوں یا کپڑوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ جسم کو لچکدار بناتا ہے اور ایک تفریحی تجربہ دیتا ہے۔

اگر آپ کچھ نیا اور دلچسپ آزمانا چاہتے ہیں، تو یہ آپ کے لیے ہے۔

9. **پاور یوگ:** یہ ایک فٹنس پر مبنی یوگ ہے جو طاقت اور لچک کو بڑھاتا ہے۔ یہ اشٹانگ یوگ سے متاثر ہے لیکن زیادہ لچکدار ہے۔

یوگا پر اردو میں کچھ کتابیں

اگر آپ جم کی طرح شدید ورزش چاہتے ہیں، تو یہ آپ کے لیے ہے۔

10. یوگ ندرا:

- یہ ایک گہری آرام کی تکنیک ہے، جسے 'یوگک نیند' بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں آپ لیٹ کر ایک گائیڈڈ مراقبہ کرتے ہیں۔
- یہ تناؤ، بے خوابی، اور ذہنی تھکاوٹ کے لیے بہترین ہے۔

ہر قسم کا اپنا مزہ ہے۔ آپ اپنی جسمانی حالت، دلچسپی، اور وقت کے مطابق کوئی بھی منتخب کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہیں کہ کون سی قسم آپ کے لیے بہتر ہے، تو کسی یوگ انسٹرکٹر سے مشورہ لینا اچھا خیال ہے۔

عالمی یوگا دیوس: ایک عالمگیر جشن

عالمی یوگا دیوس ہر سال 21 جون کو منایا جاتا ہے۔ اس کی شروعات 2015 میں ہوئی، جب اقوام متحدہ نے اسے عالمی دن کے طور پر تسلیم کیا۔ 21 جون کو اس لیے منتخب کیا گیا کیونکہ یہ شمالی نصف کرہ میں سال کا سب سے لمبا دن ہوتا ہے، اور بہت سی ثقافتوں میں اس دن کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

عالمی یوگا دیوس کے مقاصد:

- یوگ کے جسمانی، ذہنی، اور روحانی فوائد کے بارے میں عالمی سطح پر شعور اجاگر کرنا۔
- لوگوں کو صحت مند طرز زندگی اپنانے کی ترغیب دینا۔
- یوگ کو ایک عالمی تحریک کے طور پر فروغ دینا۔
- مختلف ثقافتوں، ممالک، اور پس منظر کے لوگوں کے درمیان ہم آہنگی اور اتحاد کو بڑھانا۔

اس دن دنیا بھر میں بڑے پیمانے پر یوگ کے پروگرام منعقد ہوتے ہیں۔ لوگ پارکوں، اسکولوں، کالجوں، دفتروں، اور عوامی مقامات پر جمع ہوتے ہیں اور ایک ساتھ یوگ کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی تصویر بناتا ہے جہاں مختلف رنگ، زبانوں، اور ثقافتوں کے لوگ ایک ہی مقصد کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔

عالمی یوگا دیوس کی سرگرمیاں

- بڑے یوگ سیشنز: بہت سے شہروں میں ہزاروں لوگ ایک ساتھ یوگ کرتے ہیں۔ یہ ایک شاندار منظر ہوتا ہے، جہاں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ جڑتے ہیں۔
- ورکشاپس اور سیمینارز: یوگ کے فوائد اور اسے روزمرہ کی زندگی میں شامل کرنے کے بارے میں ورکشاپس ہوتی ہیں۔ ماہرین لوگوں کو یوگ کی تکنیک سکھاتے ہیں۔
- آن لائن ایونٹس: آج کل بہت سے یوگ سیشنز آن لائن بھی ہوتے ہیں، جو لوگوں کو گھر بیٹھے شامل ہونے کا موقع دیتے ہیں۔
- بچوں کے لیے پروگرامز: اسکولوں میں بچوں کو یوگ سکھایا جاتا ہے تاکہ وہ چھوٹی عمر سے ہی اس کے فوائد سے واقف ہوں۔
- کمیونٹی ایونٹس: بہت سے محلے اور کمیونٹیز اپنے طور پر یوگ ایونٹس منعقد کرتے ہیں، جو لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتے ہیں۔

یوگا دیوس کے عالمی اثرات

عالمی یوگا دیوس نے یوگ کو ایک عالمی تحریک بنا دیا ہے۔ اس کے کچھ اہم اثرات یہ ہیں:

1. **صحت عامہ پر اثرات:** یوگا دیوس نے لوگوں کو اپنی صحت کے بارے میں زیادہ باشعور بنایا ہے۔ بہت سے لوگوں نے یوگ کو اپنی روزمرہ کی زندگی کا حصہ بنایا ہے۔

اس نے دائمی امراض کے علاج اور روک تھام کے لیے یوگ کے کردار کو اجاگر کیا ہے۔ مثال کے طور پر، ذیابیطس، ہائی بلڈ پریشر، اور دمہ کے مریضوں کے لیے یوگ ایک سستا اور مؤثر حل ہے۔

بہت سے ہسپتال اور کلینک اب یوگ کو اپنے علاج کے پروگرامز میں شامل کر رہے ہیں۔

2. **ثقافتی ہم آہنگی:** یوگا دیوس نے مختلف ممالک اور ثقافتوں کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا ہے۔ یہ دن عالمی اتحاد اور امن کا پیغام دیتا ہے۔

یوگ کی عالمگیر اپیل نے اسے ایک ایسی سرگرمی بنا دیا ہے جو کسی ایک گروہ یا ثقافت تک محدود نہیں۔ یہ ایک پل کی طرح ہے جو سب کو جوڑتا ہے۔

3. **معاشی فوائد:** یوگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے یوگ سے متعلق صنعتوں کو فروغ دیا ہے، جیسے یوگ سینٹرز، یوگ ٹیچر ٹریننگ پروگرامز، اور یوگ سے متعلق مصنوعات (جیسے یوگ میٹس، لباس، اور ایکو فرینڈلی سامان)۔

یوگ سے سیاحت بھی بڑھ رہی ہے۔ بہت سے لوگ یوگ سیکھنے کے لیے ہندوستان کے رشی کیش، گوا، یا کیرالہ جیسے مقامات کا رخ کرتے ہیں۔

4. **تعلیمی اثرات:** بہت سے اسکولوں اور کالجوں نے یوگ کو اپنے نصاب کا حصہ بنایا ہے۔ یہ بچوں کو ذہنی اور جسمانی صحت کے بارے میں سکھاتا ہے۔

یوگ ٹیچر ٹریننگ پروگرامز کی مانگ بھی بڑھ رہی ہے، جو لوگوں کو ایک نیا کیریئر آپشن دے رہے ہیں۔

5. **ماحولیاتی شعور:** یوگ لوگوں کو فطرت سے جوڑتا ہے۔ بہت سے یوگ پروگرامز اب ماحولیاتی شعور کو فروغ دیتے ہیں، جیسے کہ ایکو فرینڈلی یوگ میٹس کا استعمال یا درخت لگانے کی مہمات۔

یوگ سیشنز اکثر کھلے میدانوں یا پارکوں میں ہوتے ہیں، جو لوگوں کو فطرت کے قریب لاتے ہیں۔

یوگ کو روزمرہ کی زندگی میں شامل کرنے کے عملی طریقے

یوگ کو اپنی زندگی کا حصہ بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔ یہ ایک ایسی مشق ہے جو آپ کی مصروف زندگی میں بھی آسانی سے فٹ ہو سکتی ہے۔ یہاں کچھ عملی تجاویز ہیں جو آپ کو یوگ شروع کرنے میں مدد دیں گی:

1. **صبح کا وقت:** صبح کے وقت 10-15 منٹ یوگ کریں۔ سوریہ نمسکار (سورج کو سلام) یا کچھ سادہ آسن جیسے تڑآسن یا بھجنگ آسن آپ کو دن بھر کے لیے تازگی دیں گے۔

اگر آپ کے پاس زیادہ وقت نہیں، تو بس 5 منٹ کی سانس کی مشق بھی کافی ہے۔

2. **سانس کی مشقیں (پرانایام):** پرانایام جیسے انولوم ولوم، کپالبھاتی، یا بھسترِیکا تناؤ کو کم کرتے ہیں اور دماغ کو پرسکون رکھتے ہیں۔ آپ انہیں کہیں بھی، کسی بھی وقت کر سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر، اگر آپ دفتر میں تناؤ محسوس کر رہے ہیں، تو چند گہری سانسیں آپ کو فوراً سکون دیں گی۔

3. **چھوٹے سیشنز:** اگر آپ کے پاس پورا گھنٹہ نہیں، تو دن میں 5-10 منٹ کا یوگ سیشن بھی بہت فائدہ دیتا ہے۔ آپ دن میں کئی بار چھوٹے سیشنز کر سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر، آپ صبح 5 منٹ آسن، دوپہر کو 5 منٹ پرانایام، اور رات کو 5 منٹ مراقبہ کر سکتے ہیں۔

4. **آن لائن مدد:** آج کل یوٹیوب اور دیگر پلیٹ فارمز پر بہت ساری مفت یوگ ویڈیوز ہیں۔ آپ گھر بیٹھے کسی بھی وقت یوگ سیکھ سکتے ہیں۔

بہت سی ایپس جیسے Insight Timer یا Yoga Studio آپ کو یوگ سیشنز اور گائیڈڈ میڈیٹیشن فراہم کرتی ہیں۔

5. **یوگ کلاسز:** اگر آپ beginner ہیں، تو کسی یوگ انسٹرکٹر کی رہنمائی میں یوگ سیکھنا بہتر ہے۔ بہت سے یوگ سینٹرز beginners کے لیے خصوصی کلاسز پیش کرتے ہیں۔

اگر آپ گھر سے باہر نہیں جا سکتے، تو بہت سے انسٹرکٹرز آن لائن کلاسز بھی دیتے ہیں۔

6. **صحت مند غذا:** یوگ کے ساتھ ساتھ صحت مند اور متوازن غذا بھی ضروری ہے۔ تازہ پھل، سبزیاں، دالیں، اور ہلکی غذا یوگ کے اثرات کو بڑھاتی ہے۔

زیادہ تلی ہوئی یا پروسیسڈ غذاؤں سے پرہیز کریں، کیونکہ یہ جسم کو سست کرتی ہیں۔ پانی زیادہ پییں اور کیفین کا استعمال کم کریں۔

7. **گروپ یوگ:** اپنے دوستوں یا فیملی کے ساتھ یوگ کریں۔ یہ نہ صرف مزہ دیتا ہے، بلکہ آپ کو باقاعدگی سے یوگ کرنے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔

- آپ اپنے محلے میں ایک چھوٹا سا یوگ گروپ بھی بنا سکتے ہیں۔ ہفتے میں ایک بار پارک میں یوگ سیشن منعقد کریں۔

8. **مراقبہ:** روزانہ 5-10 منٹ مراقبہ کریں۔ یہ دماغ کو پرسکون کرتا ہے اور آپ کو اپنے خیالات پر کنٹرول کرنے میں مدد دیتا ہے۔

اگر آپ کو مراقبہ مشکل لگتا ہے، تو بس ایک پرسکون جگہ پر بیٹھیں اور اپنی سانسوں پر توجہ دیں۔ آہستہ آہستہ یہ آسان ہو جائے گا۔

9. **یوگ کو معمول بنائیں:** یوگ کو اپنی روزمرہ کی زندگی کا حصہ بنائیں، جیسے آپ دانت صاف کرتے ہیں یا ناشتہ کرتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی عادت بڑے نتائج دے سکتی ہے۔

ایک کیلنڈر پر اپنے یوگ سیشنز کو نشان زد کریں تاکہ آپ باقاعدگی سے عمل کر سکیں۔

10. **صبر اور تسلسل:** یوگ کے فوائد فوراً نظر نہیں آتے۔ صبر کریں اور باقاعدگی سے مشق جاری رکھیں۔ چند ہفتوں کے بعد آپ خود میں فرق محسوس کریں گے۔

یوگ اور جدید سائنس: ایک مضبوط رشتہ

جدید سائنس نے یوگ کے فوائد کو تسلیم کیا ہے اور اسے صحت کے لیے ایک مؤثر ذریعہ مانا ہے۔ متعدد تحقیقی مطالعات نے ثابت کیا ہے کہ یوگ جسم اور دماغ پر مثبت اثرات مرتب کرتا ہے۔ یہاں کچھ سائنسی ثبوت ہیں:

1. **تناؤ پر کنٹرول:** یوگ کورٹیسول (تناؤ کا ہارمون) کی سطح کو کم کرتا ہے، جو ذہنی صحت کے لیے فائدہ مند ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق، باقاعدہ یوگ کرنے والوں میں تناؤ اور اضطراب کی سطح نمایاں طور پر کم ہوتی ہے۔

2. پرانایام اور مراقبہ دماغ کے پیراسمپیتھیٹک نروس سسٹم کو متحرک کرتے ہیں، جو سکون اور آرام کی حالت کو فروغ دیتا ہے۔

2. **دماغی صحت:** یوگ دماغ کے وہ حصوں کو متحرک کرتا ہے جو خوشی اور سکون کے جذبات کو کنٹرول کرتے ہیں، جیسے کہ ہپوکیمپس اور پریفرنٹل کورٹیکس۔ یہ ڈپریشن، اضطراب، اور دیگر ذہنی مسائل کے علاج میں مددگار ہے۔

ایک مطالعے سے پتا چلا کہ یوگ کرنے والوں میں دماغی لچک (neuroplasticity) بڑھتی ہے، جو سیکھنے اور یادداشت کو بہتر بناتی ہے۔

3. **مدافعتی نظام:** یوگ مدافعتی نظام کو مضبوط کرتا ہے اور جسم کو بیماریوں سے لڑنے کی طاقت دیتا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق، یوگ کرنے والوں میں سوزش (inflammation) کی سطح کم ہوتی ہے، جو دائمی امراض کو روکنے میں مدد دیتی ہے۔

4. **دل کی صحت:** یوگ بلڈ پریشر اور کولیسٹرول کو کنٹرول کرتا ہے، جو دل کے امراض کے خطرے کو کم کرتا ہے۔ یہ خون کے بہاؤ کو بھی بہتر بناتا ہے اور شریانوں کو لچکدار رکھتا ہے۔

ایک تحقیق کے مطابق، ہفتے میں تین بار یوگ کرنے والوں میں دل کے دورے کا خطرہ 15% تک کم ہو جاتا ہے۔

5. **نیند:** یوگ نیند کے معیار کو بہتر بناتا ہے۔ ایک مطالعے سے پتا چلا کہ یوگ ندرا یا رات کو ہلکے آسن کرنے والے لوگ زیادہ گہری اور پرسکون نیند سوتے ہیں۔

یہ بے خوابی (insomnia) کے علاج میں بھی

مؤثر ہے۔

6. **دردکا انتظام:** یوگ دائمی درد، جیسے کمر درد، جوڑوں کا درد، یا مائیگرین، کو کم کرنے میں مددگار ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق، یوگ کرنے والوں کو درد کی شدت میں کمی محسوس ہوتی ہے۔

یوگ کے بارے میں غلط فہمیاں اور ان کا ازالہ

یوگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باوجود، اس کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں ہیں جو لوگوں کو اس سے دور رکھتی ہیں۔ آیئے انہیں سمجھیں اور ان کا ازالہ کریں:

1. **یہ صرف مخصوص لوگوں کے لیے ہے:** غلط! یوگ سب کے لیے ہے۔ یہ کسی ایک گروہ، ثقافت، یا عمر تک محدود نہیں۔ چاہے آپ 20 سال کے ہوں یا 70 سال کے، مرد ہوں یا خاتون، یوگ آپ کے لیے فائدہ مند ہے۔
2. **یہ بہت مشکل ہے:** یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے۔ یوگ میں ہر سطح کے لیے کچھ نہ کچھ ہے۔ beginners کے لیے سادہ آسن جیسے تڑآسن یا شوان آسن بھی بہت فائدہ دیتے ہیں۔ آپ کو مشکل آسن کرنے کی ضرورت نہیں۔
3. **یہ صرف جسمانی ورزش ہے:** یوگ جسم کے ساتھ ساتھ دماغ اور روح کو بھی بہتر بناتا ہے۔ اس کا اصل مقصد اندرونی سکون اور خود آگاہی ہے، نہ کہ صرف جسمانی فٹنس۔
4. **اس کے لیے زیادہ وقت چاہیے:** یوگ کے لیے آپ کو گھنٹوں دینے کی ضرورت نہیں۔ بس 15-10 منٹ روزانہ بھی کافی ہیں۔ آپ اپنی مصروف زندگی میں بھی یوگ کے لیے وقت نکال سکتے ہیں۔
5. **یہ صرف جوانوں کے لیے ہے:** یوگ ہر عمر کے لیے ہے۔ بوڑھے افراد کے لیے چیئر یوگ یا ہلکے آسن موجود ہیں، جو ان کی صحت کو بہتر بناتے ہیں۔
6. **یہ مہنگا ہے:** یوگ ایک سستی مشق ہے۔ آپ کو صرف ایک یوگ میٹ اور تھوڑی سی جگہ کی ضرورت ہے۔ بہت سارے مفت وسائل، جیسے یوٹیوب ویڈیوز، بھی دستیاب ہیں۔

ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے عالمی یوگا دیوس جیسے مواقع بہت اہم ہیں، جو لوگوں کو یوگ کی صحیح سمجھ فراہم کرتے ہیں۔

یوگ اور ہماری ذمہ داری

ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ ہم اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ یوگ ایک سادہ، سستا، اور مؤثر طریقہ ہے جس سے ہم اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ عالمی یوگا دیوس ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم ایک بڑی عالمی برادری کا حصہ ہیں، جہاں سب ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بہتر زندگی کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔

ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم یوگ کے پیغام کو پھیلائیں۔ اگر آپ یوگ کرتے ہیں، تو اپنے دوستوں، فیملی، اور کمیونٹی کو بھی اس کی طرف راغب کریں۔ ایک چھوٹی سی کوشش سے ہم اپنے معاشرے کو زیادہ صحت مند، خوشحال اور پرسکون بنا سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر:

- اپنے دفتر میں ایک یوگ سیشن کا اہتمام کریں۔
- اپنے بچوں کو یوگ کی سادہ مشقیں سکھائیں۔
- اپنے محلے میں ایک یوگ گروپ بنائیں اور ہفتے میں ایک بار مل کر یوگ کریں۔

یوگ کا مستقبل: ایک روشن افق

یوگ کا مستقبل بہت روشن ہے۔ جیسے جیسے لوگ صحت، تندرستی، اور ذہنی سکون کے بارے میں زیادہ باشعور ہو رہے ہیں، یوگ کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ آئندہ چند سالوں میں ہم یوگ کو اور زیادہ عام ہوتا دیکھیں گے۔ یہاں کچھ رجحانات ہیں جو یوگ کے مستقبل کو شکل دے رہے ہیں:

1. **آن لائن یوگ:** ٹیکنالوجی کی بدولت یوگ اب ہر ایک کی پہنچ میں ہے۔ آن لائن کلاسز، ایپس، اور ویڈیوز نے یوگ کو زیادہ قابل رسائی بنا دیا ہے۔ لوگ اب گھر بیٹھے دنیا کے بہترین یوگ انسٹرکٹرز سے سیکھ سکتے ہیں۔
2. **یوگ اور کارپوریٹ ویلنس:** بہت سی کمپنیاں اپنے ملازمین کے لیے یوگ پروگرامز شروع کر رہی ہیں۔ یہ ملازمین کے تناؤ کو کم کرتا ہے، ان کی پیداواریت کو بڑھاتا ہے، اور کام کی جگہ پر مثبت ماحول بناتا ہے۔
3. **یوگ اور بچے:** اسکولوں میں یوگ کو نصاب کا حصہ بنایا جا رہا ہے۔ یہ بچوں کو ذہنی اور جسمانی صحت کے بارے میں سکھاتا ہے۔ یوگ بچوں کی توجہ، نظم و ضبط، اور جذباتی توازن کو بہتر بناتا ہے۔
4. **یوگ اور میڈیکل سائنس:** ڈاکٹرز اور ہیلتھ پروفیشنلز اب یوگ کو علاج کے طور پر تجویز کر رہے ہیں۔ یہ دائمی امراض، ذہنی صحت، اور بحالی (rehabilitation) کے پروگرامز میں ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔
5. **یوگ اور ماحولیات:** یوگ لوگوں کو فطرت سے جوڑتا ہے۔ بہت سے یوگ پروگرامز اب ماحولیاتی شعور کو فروغ دیتے ہیں، جیسے کہ ایکوفرینڈلی یوگ میٹس کا استعمال، پلاسٹک کا کم استعمال، یا درخت لگانے کی مہمات۔
6. **یوگ اور ٹیکنالوجی:** نئی ٹیکنالوجیز جیسے ورچوئل ریئلٹی (VR) یوگ یا سمارٹ یوگ میٹس یوگ کے تجربے کو اور دلچسپ بنا رہی ہیں۔ یہ لوگوں کو نئے انداز میں یوگ کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔
7. **یوگ اور تنوع:** یوگ اب ہر قسم کے لوگوں کے لیے موزوں بنایا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر، معذور افراد کے لیے چیئر یوگ، حاملہ خواتین کے لیے پرینٹل یوگ، اور بوڑھوں کے لیے سینئر یوگ پروگرامز تیار کیے جا رہے ہیں۔
8. **یوگ ایک عالمگیر تحفہ:** یوگ ایک ایسی مشق ہے جو ہمیں خود سے، ہمارے ماحول سے، اور ایک دوسرے سے جوڑتی ہے۔ یہ ہمیں سکھاتی ہے کہ ہم اپنے جسم کا احترام کریں، اپنے دماغ کو پرسکون رکھیں، اور اپنی روح کو آزاد کریں۔ عالمی یوگا دیوس اس پیغام کو پھیلاتا ہے کہ صحت، سکون، اور ہم آہنگی ہر ایک کا حق ہے۔

یوگ کو اپنی زندگی کا حصہ بنانا ایک چھوٹی سی کوشش ہے جو بڑے نتائج دے سکتی ہے۔ چاہے آپ صبح 5 منٹ کی سانس کی مشق کریں، ہفتے میں ایک بار یوگ کلاس لیں، یا اپنے دوستوں کو یوگ کے فوائد بتائیں، بس شروع کریں۔ یوگ آپ کا انتظار کر رہا ہے، اور یہ آپ کی زندگی کو ضرور بدل دے گا۔

تو آیئے، اس عالمی یوگا دیوس پر ایک چھوٹا سا عہد کریں کہ ہم یوگ کے ذریعے اپنی زندگی کو صحت مند، خوشحال، اور پرسکون بنائیں گے۔ یہ ایک ایسی تحریک ہے جو نہ صرف ہمیں بہتر بناتی ہے، بلکہ ہمارے آس پاس کے لوگوں اور پوری دنیا کو بھی زیادہ خوبصورت بناتی ہے۔ اپنی یوگ میٹ بچھائیں، گہری سانس لیں، اور اس خوبصورت سفر کا آغاز کریں۔

■

Rais Ahmed
C-36/5, Lane No: 17/2, R.K. Marg,
Chauhan Banger
Delhi- 110053
Mob. 8882594420
nadeemahmad_126@yahoo.co.in

یوگا کے روحانی فوائد

عبدالعلیم

موجودہ حالات و معمولات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہنے میں حرج نہیں کہ آج کا انسان ذہنی و جسمانی دونوں اعتبار سے بے اطمینانی کا شکار ہے، اس کی یہ بے چینی محض خارجی عوامل کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ اس کی باطنی اتھل پتھل اور کشمکش کا زیادہ حصہ ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اگر انسان اپنے طور پر مضبوط ہوتا ہے۔ یعنی اس کی باطنی طاقتیں اگر قوت بخش ہیں تو خارجی حالات سے وہ نبرد آزما ہو جاتا ہے۔ لیکن جب اس کی خارجی اور باطنی دونوں سطحیں اس کے لیے اطمینان بخش نہیں ہوتی ہیں تو اس کے اندر بے چینی، الجھن، خود سے فرار، عدم تشکیک، ناکامی کا جذبہ، کچھ نہ کر پانے کی اہلیت جیسے تصورات جنم لیتے ہیں جس کے نتیجے میں ترش مزاجی، جھنجھلاہٹ، چڑچڑا پن، بدن درد جیسے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ ان سب سے نپٹنے کے لیے انسان طرح طرح کی ترکیبیں اختیار کرتا ہے۔ مثلاً لوگ علاج کے لیے ڈاکٹروں کا رخ کرتے ہیں جو کچھ نسخے تجویز کرتے ہیں لیکن ایک جزوی طریقہ کار ہوتا ہے کلی نہیں۔

مذکورہ تمام منفیات سے بچنے اور ایک توانا جسم اور پرسکون ذہن کے حصول کے لیے 'یوگا' کو اپنایا جا سکتا ہے اور اس کے ذریعے روحانی اور جسمانی دونوں طرح کا سکون حاصل ہوتا ہے۔ یہ انسانی جسم و ذہن اور روح کو ملانے کا ایک طریقہ کار ہے اور ان تینوں کے ادغام سے سالم پیکر وجود میں آتا ہے۔ یہ ایک جسمانی اور روحانی تعلیم ہے جو خود کو سنوارنے اور زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ فراہم کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یوگا صرف چند حرکات و سکنات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ زندگی گزارنے کے اصول و ضوابط بھی اس کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں۔

یوگا کیا ہے؟ ایک سوال ہے، یوگا ایک قدیم ورزش ہے جس کا آغاز ہندوستان سے ہوا اور یہیں سے بیرون ممالک پہنچا اور وہاں کے لوگ متعدد فوائد کے پیش نظر اس کو اختیار کر رہے ہیں۔ یوگا دراصل جسمانی اعضاء اور ذہنی نظم و نسق پر مشتمل ایک ورزش ہے جو ہمیں تندرست چست اور متحرک رکھتی ہے اور جس کے سبب ہمارے اندر مثبت پہلو جنم لیتا ہے جو ہمیں زندگی کے بارے میں اور تمام موجودات کے بارے میں نفع بخش نظریہ قائم کرنے اور لوگوں کے تئیں اچھا سلوک کرنے پر ابھارتا ہے۔ گرچہ ہزاروں سالوں سے آج تک اس میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن اس نے ہمیشہ انسان کو خود پر قابو پانے اور باطنی اتھل پتھل اور ذہنی الجھن کو کنٹرول کرنے پر قادر بنایا ہے۔

یوگا کی مشقیں ہر عمر میں کی جا سکتی ہیں خواہ وہ کسی بھی عمر کا ہو۔ یہ ایک سماجی نظام ہے جسے ہر کوئی اپنے من مطابق کر سکتا ہے، یوگا کی بہت ساری اقسام ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے جدا بھی نہیں ہیں۔ یوگا کرنے سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس حقیقت کے قائل ہو جاتے ہیں کہ دنیا میں بے شمار نشیب و فراز ہیں جن سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ لہٰذا ان ناسازگار حالات میں بھی خود کیسے معتدل رہیں اور زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے اپنے ذہنی توازن کو کیسے برقرار رکھیں، یہ تبھی ممکن ہے جب یوگا کے ذریعے خود پر قابو پایا جائے مشہور شاعر جان ڈون (John Donn) لکھتا ہے:

''کوئی انسان ایک جزیرے کی طرح بالکل الگ تھلگ نہیں ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ انسان سماج اور معاشرے کا ہی ایک فرد ہوتا ہے۔ معاشرے کے لوازمات اور وہاں بسنے والے بے شمار انسانوں سے اس کا روزانہ سابقہ پڑتا ہے جن سے وہ خود کو الگ نہیں کر سکتا، یہی ایک ہونے کا احساس یوگا ہمارے اندر ابھارتا ہے جو کہ یوگا کا مقصد بھی ہے۔

یوگا انسان کے ذہن کی صحت مندی کا ضامن ہے اور اس کی نشوونما بھی بہتر طور پر کرتا ہے چھٹی صدی قبل از مسیح میں لکھی جانے والی ایک شاہکار کتاب بھگود گیتا میں یوگا کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

یوگا کامیابی اور ناکامی کے درمیان توازن کا نام ہے۔
یوگا ہماری زندگی کا سب سے خفیہ راز ہے۔
یوگا اس دنیا میں سلیقے سے زندگی گزارنے کا نام ہے۔
یوگا عظیم تر خوشیوں اور شادمانیوں کو جنم دیتا ہے۔
یوگا تکلیف اور بیماری کو ختم کرتا ہے اور یوگا ذہنی سکون اور اطمینان کا نام ہے۔

(یوگا سب کے لیے، تلخیص و ترجمہ، صدف ناز رابعہ بک ہاؤس، لاہور، ص 8-7)

یوگا کی ایک تعریف کٹھا اپنشد میں یوں بیان کی گئی ہے:

''جب سکوت کے باعث حواس خمسہ ساکن ہوتے ہیں تو اسی سکون کو یوگا کہتے ہیں۔''

مذکورہ تعریفات سے یہ اندازہ ہوا کہ یوگا چند حرکات و سکنات کے ذریعے قوی جسم ہی حاصل کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعے ہم داخلی سکون بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایک چکی کے اندر دو پاٹ ہوتے ہیں اگر وہ دونوں صحیح و سالم ہیں یعنی ان میں موجود دانت اپنا کام کر رہے ہیں تو اس میں ڈالا گیا اناج لائق خورد ہوگا اور اگر وہ دونوں صحیح وہ سالم نہیں ہیں تو اس میں ڈالا گیا اناج کھانے کے لائق نہیں رہے گا بلکہ وہ موٹا جھوٹا قسم کا رہ جائے گا۔ اسی طرح جب ہمارے باطن میں رسہ کشی کی کیفیت ہوگی تو ہم اطمینان میں نہیں رہ سکتے اور نہ ہی کسی چیز کے بارے میں بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اپنے ملنے جلنے والوں سے اچھا سلوک بھی نہیں برت سکتے اسی لیے پہلے خود پر قابو پانا اشد ضروری ہے اور یہ یوگا کی مشق سے ممکن ہو سکتا ہے۔

یوگا کی اقسام

یوگا کی بہت ساری قسمیں ہیں، ظاہر ہے مکمل طور پر یوگا کی اقسام کو نہیں اپنایا جا سکتا ہے۔ لیکن یوگا چند رائج الوقت شکلوں کا بھی نام نہیں ہے۔ میرے اس

مضمون کا مقصد اعمال کے ذریعے حاصل ہونے والی ظاہری توانائی سے زیادہ داخلی توانائی یا باطنی موجودات پر قابض ہونا ہے جس کے حصول سے ایک انسان بہتر طور پر خود کو تبدیل کرسکتا ہے۔ خود میں تغیر کے بغیر سماج کو بدلنے کا خیال محال ہے۔ یوگا کی مندرجہ ذیل اقسام انھی سے عبارت ہیں۔

یاما: اس میں جن احکامات پر زور دیا گیا ہے وہ ہے حرص، طمع، چوری، خواہش، غصہ اور حسد پر قابو رکھنا اور منفی اثرات کے زیر اثر کوئی غلط قدم نہ اٹھانا۔ اس کے تحت پانچ اصول بیان کیے گئے ہیں جو ذہن اور کردار کی طہارت کرتے ہیں اور سماجی حیثیت سے بھی ان کی معنویت ہے:

(1) اہنسا (عدم تشدد): کسی بھی ذی روح کو دکھ، تکلیف نہ پہنچانا نہ زبان سے اور نہ ہی ہاتھ سے اور نہ ہی عمل سے یہ تب ممکن ہوگا جب آپ کے خیالات، اعمال اور اقوال میں پاکیزگی اور نرمی ہوگی، ایک دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور اس کا احترام بھی لازم ہے

(2) ستیہ (سچ بولنا): اپنی باتوں میں ایسے اجزاء کا شامل نہ کرنا جن سے سامنے والا دھوکے میں پڑ جائے۔ الفاظ صاف اور واضح رکھنا تاکہ سننے والا وہی سمجھے جو آپ کہنا چاہتے ہیں۔

(3) استیہ (چوری نہ کرنا): یعنی دوسروں کے مال کو چپکے سے ہتھیانا ہی چوری نہیں ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے بغیر اجازت کے کسی دوسرے کی اشیا کو لے لینا۔ مثلاً کسی کے کام کو اپنا کام بنالینا، اپنے کام میں مستعد نہ رہنا وغیرہ اس میں شامل ہیں۔

(4) برہم چریہ (جنسی ہیجان سے پرہیز): غیر اخلاقی جنسی معاملات میں ملوث نہ ہونا اور نہ ہی ایسی سرگرمیوں میں پڑنا جو جنسی ہیجان کے ابھار کا سبب بنیں۔ اپنی جسمانی مضبوطی اور ذہنی قوتوں کی نشوونما کے لیے ان سے پرہیز کیا جائے اور ان قوتوں کو سماج کی بھلائی کے لیے استعمال کیا جائے۔ مہارشی پتنجلی نے برہم چریہ پر بہت زور دیا ہے کیونکہ ان کی نظر میں اس سے اجتناب مختلف سماجی خرابی اور کئی قسم کی برائیوں کا خاتمہ کرتا ہے۔

(5) اپری گرہ (قناعت پسندی): اس کا مطلب یہ ہے کہ بقدر ضرورت چیزوں کی ذخیرہ اندوزی کی جائے ضرورت سے زیادہ ذخیرہ اندوزی سے آپ لوگوں کو ان کے حق سے محروم کردیں گے اور سب کا ساتھ سب کا وکاس خاطر خواہ طور پر نہیں ہو پائے گا۔

نیاما: اس میں سادگی، قناعت، مطالعہ، خدا پر یقین شامل ہیں اس میں بھی چند اصولوں کی پابندی لازمی ہے:

(1) شوچ (پاکی وصفائی): اپنے جسم کو پاک رکھنا، جسمانی اعضا کی صفائی کرنا، اچھی اور بہتر غذاؤں کا استعمال کرنا تاکہ آپ کا جسم زہریلے جراثیم سے محفوظ رہے۔ اسی کے ساتھ ذہنی صفائی بھی اس میں شامل ہے۔ ذہن کو صاف رکھنے کے لیے فلسفیوں نے چند باتوں سے پرہیز کرنے کی تلقین کی ہے جو ذہن کو پراگندہ کرتی ہیں: کام (خواہشاتِ نفس پر لگام)، کرودھ (غصہ)، لوبھ (لالچ)، موہ (فریفتگی)، مد (انا) اور متسر (حسد) ان عوامل سے باز رہنے سے ذہن صاف اور شانت رہتا ہے

(2) سنتوش (قناعت): یعنی آپ ہر حالت میں اپنے آپ کو خوش رکھیں، صبر وشکر کرتے رہیں، ہوسکتا ہے کوئی شخص آپ سے بھی خراب حالت میں زندگی گزار رہا ہو، اس لیے اپنے سے کم درجے کے لوگوں کو دیکھ کر اپنی حالت پر قانع رہیں اور شکر کریں جیسا کہ پتنجلی نے 'یوگا سوتر' میں کہا ہے کہ:

''صبر وشکر انسانی زندگی میں اعلی ترین خوشیاں لانے کا موجب بنتا ہے۔''

(یوگا سب کے لیے، ترجمہ وتلخیص، صدف ناز، ص، 22)

(3) تپ (لگن): یعنی اپنی منزل کو حاصل کرنے کے لیے فضولیات سے بچنا۔ یوگا کے راستے پر چلنے کے لیے اپنے ذہن کو مرکوز کرنا، خواہشات پر کنٹرول رکھنا۔ اسے self control کہہ سکتے ہیں۔

(4) سوادھیائے (خود مطالعہ یا محاسبہ): اس میں دو چیزیں شامل ہوسکتی ہیں ایک یوگا کے اصولوں کو اگر خود نہیں سمجھ پاتے تو کسی عالم سے رجوع کریں دوسرے محاسبہ یعنی اپنی ذات پر غور وفکر کرنا، اپنے جذبات اور اپنے کاموں کا گہرائی سے جائزہ لینا۔ سوادھیائے کا عمل خود کی زندگی کو بہتر بنانے اور سمجھنے کا ایک بہتر ذریعہ ہے۔

(5) ایشور پرانِدھان: یعنی خدا کی عبادت کرنا اور ہمہ وقت اس کا دھیان بھی رکھنا، ہم کوئی بھی کام کریں اس کی رضا کی خاطر کریں اور یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ مالک ہمہ وقت ہم سب کو دیکھ رہا ہے۔

بھگود گیتا کے تین یوگ

بھگود گیتا میں یوگا کے تین اہم اصول بتائے گئے ہیں یعنی تین قسم کے یوگا کی بات کی گئی ہے:

(1) جنانا یوگ (2) کرما یوگ (3) بھگتی یوگ

جنانا یوگ: اس یوگا کا تعلق عقل سے ہے اس کے لیے مکمل انہماک کی ضرورت ہے۔ اس علم کے حصول کے لیے غور وخوض، معرفت اور نفس کشی لازمی ہے۔

کرما یوگ: اس کا تعلق عمل سے ہے اور بغیر عمل کے کچھ بھی ممکن نہیں۔ عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں مثبت اور منفی۔ یوگا چونکہ انسان میں مثبت پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے اور سکون واطمینان بخشتا ہے اس لیے منفی اعمال کی یہاں کوئی جگہ نہیں کیونکہ منفی عمل کرنے والے کو سکون وچین نصیب نہیں ہوسکتا۔ کرما کا مطلب یہ ہوا کہ نتائج کی پرواہ کیے بغیر عمل کرنا اور اس کے صلے میں کسی بھی طرح کی توقعات نہ رکھنا اس کی بہترین مثال۔ نیکی کر دریا میں ڈال ہوسکتی ہے

بھگتی یوگ: خدا سے محبت اور عقیدت رکھنے والا شخص کبھی ضائع نہیں ہوتا ہے اور اس راستے پر وہی چل سکتا ہے جو کرما اور جنانا کو حاصل کرچکا ہو۔

جسمانی یوگا

یوگا کے ہر آسن کا جسم کے ہر حصے پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں، یوگا کے آسن سے ریڑھ کی ہڈی اور مختلف ہڈیوں کے جوڑ میں لچک رہتی ہے جسم میں مدافعاتی قوت نمو پذیر ہوتی ہے اور جسم توانا اور چاق وچوبند رہتا ہے۔ ہم لاشعوری طور پر بھی کچھ ایسی حرکات وسکنات کرتے ہیں جن سے ہم اپنے جسم کو تھوڑی راحت بخشتے ہیں۔ مثلاً سو کر اٹھتے ہی انگڑائی لینا یا گہری سانس لینا، بدن کو توڑنا مروڑنا وغیرہ یہ تمام چیزیں ہم بے خیالی اور بے ترتیبی کے ساتھ کرتے ہیں، خود کو آرام دینے کے لیے۔ لیکن اگر انھی چیزوں کو مرتب ڈھنگ سے روزمرہ کے معمولات میں شامل کرلیں اور کچھ وقت اس پر صرف کریں تو ذہن وجسم کو کتنا سکون ملے گا۔

اب ہمارے سامنے یہ بات واضح ہوگئی کہ یوگا کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک جو ظاہری حسن کو سنوارتا ہے اور دوسرا جو داخلی نظام میں خوبصورتی پیدا کرتا ہے۔ اس لیے یہ خیال رہے کہ محض یوگا کے ایک پہلو پر عمل کرکے ایک بہتر اور مکمل انسان نہیں بنا جاسکتا اس لیے ضروری ہے کہ اس کے دونوں پہلوؤں کو اختیار کیا جائے تاکہ اپنی ذات کی اور سماج کی بھلائی عمدہ طریقے پر ہو اور ایک بہتر معاشرے کی تشکیل ہوسکے۔

■

Abdul Aleem
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
aleema913@gmail.com

پروفیسر محمود الٰہی زخمی گورکھپوری

حیات وخدمات

عباس رضا نیر

پروفیسر محمود الٰہی نے اپنے ادبی کارناموں سے علمی وادبی دنیا میں منفرد مقام حاصل کیا۔ ان کی شخصیت کی جاذبیت جفاکشی اور ان کے خلوص میں مضمر ہے۔ اردو زبان سے بےلوث محبت کا جذبہ ان کو اردو کے ادب عالیہ کی تدریس کی توسیع پر آمادہ کرتا ہے۔ انھوں نے ایک طرف تدریسی سلسلے کو بھی جاری رکھا اور دوسری طرف اردو زبان وادب کے فروغ میں بھی کوشاں رہے۔ ساتھ ہی ساتھ تحقیقی وتنقیدی کارنامے بھی انجام دیتے رہے۔ یہ ان کا عزم اور حوصلہ تھا کہ وقت کو ربر کی طرح کھینچتے گئے اور اپنی فتوحات درج کراتے گئے۔ انھوں نے اردو زبان کو اس طرح گلے لگایا کہ اردو زبان وادب ان کا تعارف بن گئے۔ ان کی ادبی شخصیت کی کئی جہتیں شاعری، طنز ومزاح اور تنقید ہیں لیکن جس جہت نے ان کو قبولیت کی منزل تک پہنچایا وہ ان کی تحقیقی خدمات ہیں۔

پروفیسر محمود الٰہی 2 ستمبر 1930 کو ضلع 'امبیڈکر نگر' کے مشہور قصبہ 'ٹانڈہ' میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد 'مولانا علیم اللہ' ٹانڈہ کے مشہور مدرسہ 'کنزالعلوم' کے بانی اور صدر مدرس تھے۔ اسی مدرسہ سے محمود الٰہی کی تعلیمی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ مولوی 1943، عالم (1944) اور فاضل (1946) کی سند حاصل کرنے کے بعد ہائی اسکول (1947) اور انٹرمیڈیٹ (1952) کے امتحانات پاس کرتے ہیں۔ پھر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے 'آگرہ یونیورسٹی' میں داخل ہوتے ہیں۔ جہاں سے وہ بی اے (1953 میں) اور اردو مضمون میں ایم اے (1955 میں) کی سند حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد محمود الٰہی کا داخلہ 'علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' میں ہوجاتا ہے جہاں وہ ڈاکٹر محمد حسن کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا سندی مقالہ بعنوان 'اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ' پیش کرتے ہیں اور 1958 میں ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا جاتا ہے۔

پروفیسر محمود الٰہی کو درس وتدریس سے گہرا شغف تھا۔ اپنے اس شوق کو انھوں نے اپنے پیشے میں بدل دیا۔ یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ ان کا شوق ہی آگے چل کر ان کا پیشہ بن گیا۔ محمود الٰہی کی پہلی ملازمت درس وتدریس سے ہی وابستہ تھی کہ انھوں نے 'اسلامیہ انٹر کالج ہمیر پور' سے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کالج میں وہ 1952 سے 1955 تک عربی وفارسی مضامین کی تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد بحیثیت اردو لیکچرر 1958 کو 'گورنمنٹ رضا ڈگری کالج' رامپور میں تقرر ہوا۔ اسی سال 'گورکھپور یونیورسٹی' میں شعبہ اردو کا قیام عمل میں آتا ہے اور محمود الٰہی اپنی تدریسی زندگی کو اس ادارے کے لیے وقف کردیتے ہیں۔ ان کا شعبۂ اردو میں نومبر 1958 کو بحیثیت لیکچرر تقرر ہوجاتا ہے اور 1972 میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ڈین بھی متعین ہوتے ہیں اور 'کارگزار وائس چانسلر' کی ذمہ داریاں بھی سنبھالتے ہیں۔ انھوں نے گورکھپور یونیورسٹی میں رہ کر تقریباً 32 برس تک تدریسی اور علمی خدمات انجام دینے کے علاوہ اردو زبان کو فروغ دینے کے عملی اقدامات بھی کیے۔ شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی سے 1991 میں سبکدوش ہوئے۔ آپ کی نگرانی میں 36 پی۔ ایچ ڈی اور ایک ڈی لٹ کے مقالے پر ڈگری تفویض کی گئی۔

محمود الٰہی نے اردو زبان کے فروغ میں فقط فکری حصہ ہی نہیں لیا بلکہ عملی سرگرمی بھی دکھائی، انھوں نے گورکھپور یونیورسٹی سے ملحق مختلف کالجوں میں اردو زبان کو بحیثیت مضمون شامل کرانے کا اہم کارنامہ بھی انجام دیا۔ یہ ان کی جدوجہد کا نتیجہ ہے کہ آج بھی یونیورسٹی سے ملحق متعدد کالجوں میں اردو زبان کا تدریسی سلسلہ جاری ہے۔ ان کی سنجیدہ سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے 'اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ' کا تین بار (فروری 1981 تا اگست 1983، جون 1987 تا جولائی 1989، جولائی 1993 تا مارچ 1994) چیئرمین بھی بنایا گیا۔ اردو اکیڈمی سے ان کی وابستگی نے اردو تحقیق کے دامن کو مالامال کردیا کہ ان کی بیشتر تحقیقی کتابیں اور مضامین اسی دورانیہ میں منظرعام پر آئیں۔

محمود الٰہی کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوتا ہے۔ جب وہ تیرہ سال کے ہوئے تو ان کے اندر کی جمالیاتی حس نے انگڑائی لی اور وہ شعرگوئی پر آمادہ ہوئے۔ اس زمانے میں وہ مدرسہ میں زیرتعلیم تھے اور عربی کی ابتدائی نصابی کتابیں پڑھ رہے تھے۔ اسی عہد میں سیاسی تبدیلیاں بھی رونما ہورہی تھیں کہ آزادی کے متوالے 1942 کی تحریک کو کامیاب بنانے کی ہرممکن کوشش کررہے تھے، جس کے لیے شعرا بھی سرگرم تھے۔ اتفاق سے ٹانڈہ میں مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا جن میں مجروح سلطانپوری اور ہندی گورکھپوری شامل ہوتے تھے، پورا قصبہ ان کی شاعری اور ترنم کا دیوانہ بن گیا تھا۔ سامعین ان دونوں کے انداز شعرگوئی کی نقالی کرتے تھے۔ اس عہد کے ماحول

کے مرتب ہونے والے اثرات کا بیان خود محمود الٰہی کی زبان میں ملاحظہ ہو کہ انھوں نے کس طرح ماحول سے متاثر ہو کر شاعری کے میدان میں قدم رکھا:

"ماحول کی زد سے میں کیوں کر بچ سکتا تھا۔ میرے مدرسے کے ساتھی جب دوسرے محلوں سے آتے تھے اور رات کی محفل شعر و سخن کا ذکر کرتے تھے تو میں اسے بڑی حسرت کے ساتھ سنتا تھا۔ آخرش ایک سامع کی حیثیت سے میں بھی مشاعروں میں شریک ہونے لگا۔ اور ایک دن شعر گوئی کی بھی جرات پیدا ہو گئی جی چاہتا تھا کہ اپنے اشعار کسی مشاعرے میں سناؤں لیکن ساتھیوں کا یہ مشورہ بڑا صائب تھا کہ سنانے سے پہلے کسی استاد سے ان پر اصلاح لے لی جائے۔ قرعۂ فال ہندی صاحب کے نام نکلا اور میں نے ان کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا۔ انھوں نے مجھے مایوس نہیں کیا، انھوں نے شعر و شاعری کے بارے میں مجھے بڑے نیک مشورے دیے اور جب میں شعر کہتا تھا تو ان مشوروں کو ملحوظ رکھتا تھا لیکن اس کوچے کی رہ نوردی میرے بس کی بات نہیں تھی" (تعارف، شعلۂ گل، مصنف: ہندی گورکھپوری، نشاط پریس ٹانڈہ، 1984، ص 5)

اردو ناول کی تاریخ میں ڈپٹی نذیر احمد کو پہلا ناول نگار تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن محمود الٰہی نے ان کی اولیت سے انکار کرتے ہوئے مولوی کریم الدین کو اردو کا پہلا ناول نگار اور ان کی کتاب 'خط تقدیر' کو اردو کا پہلا ناول قرار دیا ہے۔ جس کے ثبوت میں انھوں نے اس کے طویل مقدمہ میں متعدد دلائل بھی پیش کیے۔

مذکورہ اقتباس سے انکشاف ہوتا ہے کہ محمود الٰہی نے ہندی گورکھپوری سے اصلاح سخن لی اور زخمی تخلص اختیار کیا، لیکن وہ خود کو فطری شاعر نہیں تسلیم کرتے تھے بلکہ انھوں نے تفنن طبع کے لیے اس میدان میں قدم رکھا تھا۔ اس کے باوجود ان کی دستیاب نظموں اور غزلوں کا رنگ قابل تعریف ہے جن میں ذاتی احساسات کے علاوہ ان کے عہد کا غالب رجحان بھی دیکھنے کو ملتا ہے، کیونکہ یہی وہ زمانہ ہے جب آزادی کی جنگ لڑی جا رہی تھی اور ہندوستان چھوڑو تحریک کا چرچا تھا۔ ان کا زیادہ تر کلام اس دور کے مقبول رسالوں اور اخباروں کی زینت بنا جن میں 'مدینہ' بجنور قابل ذکر ہے۔ محمود الٰہی زخمی کی ایک غزل ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے داخلی جذبے کی شدت کو بیان کیا ہے۔

غم دل سنانے کو جی چاہتا ہے
تمھیں بھی رلانے کو جی چاہتا ہے

سراپا الم ہے مری زندگانی
مگر مسکرانے کو جی چاہتا ہے

جسے سن کے عرش بریں جھوم اٹھے
وہ نغمہ سنانے کو جی چاہتا ہے

مہ و مہر کو انجم و کہکشاں کو
زمیں پر بچھانے کو جی چاہتا ہے

یہ انساں کے ظلم و ستم دیکھ کر اب
قیامت اٹھانے کو جی چاہتا ہے

یہ زخمی جنون محبت تو دیکھو
انھیں بھول جانے کو جی چاہتا ہے

محمود الٰہی زخمی نے مذکورہ بالا غزل میں اپنے جذبات کو نہایت ہی سادگی سے پیش کیا ہے۔ وہ اپنے محبوب کو اپنی داستان غم سنانا چاہتے ہیں تا کہ محبوب کی ہمدردی حاصل کی جا سکے اور وہ بھی ان کے غم میں برابر کا شریک ہو۔

محمود الٰہی زخمی نے غزلوں کے علاوہ کچھ سیاسی، قومی اور وطنی نظمیں بھی تخلیق کی ہیں جن میں ان کی نظم 'تفاخر' قابل تعریف ہے جس میں وہ اپنے وطن 'ٹانڈہ' کی معیشت کے تناظر میں تفاخر کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔

اسی ٹانڈہ سے تمھیں آج بھی خط لکھتا ہوں
جس کی گلیوں میں اُگے اطلس و دیبا و حریر

جس کی صناعی و خلاقی کے بل بوتے پر
شیش محلوں میں سنورتے تھے شہنشاہ و وزیر

میرا یہ ہاتھ کہ جس سے تمھیں خط لکھتا ہوں
چلے کرگھے پہ تو اس کو ید بیضا کہیے

چھوئے جیکارڈ تو بہزاد سے کیجے تعبیر
خام ریشم پہ پڑے تو دم عیسیٰ کہیے

مذکورہ نظم میں محمود الٰہی زخمی کہتے ہیں کہ میں ٹانڈہ (جہاں کپڑے کی صنعت ہوتی ہے) سے تمھیں نامہ لکھ رہا ہوں جہاں ہر قسم کے کپڑے بنائے جاتے ہیں، جہاں کی کاری گری اس قدر شاندار ہے کہ وہاں کے منقش عمدہ کپڑوں سے بادشاہوں اور وزیروں کی شان بڑھتی ہے۔ میرا یہ جو ہاتھ ہے جس سے میں خط لکھ رہا ہوں اس کے مختلف ہنر ہیں، اگر کرگھے پر چلے تو ید بیضا کا کام کرتا ہے یعنی شاندار اور خوبصورت کپڑوں کی بنائی کرتا ہے۔ جب جیکارڈ کو چھوتا ہے (یعنی ایسا کپڑا یا ڈیزائن جس میں دھاگے سے نقاشی کی جاتی ہے) تو ایران کے مشہور نقاش بہزاد کی طرح ہنرمندی دکھاتا ہے۔ جب کچے ریشم کو مس کرتا ہے تو اس میں زندگی پھونک دیتا ہے یعنی قیمتی بنا دیتا ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں اگر یہ کپڑا مصر پہنچے تو یوسف کا دامن بن جائے جس کی آرزو زلیخا بھی رکھتی ہے، یہی کپڑا ہے جو جنگل میں سیتا جی کا گیروا چیر بن جاتا ہے اور نجد پہنچتا ہے تو لیلی کا نقاب بن جاتا ہے۔

لیکن ان کی شاعری کا سلسلہ تادیر قائم نہیں رہتا بلکہ وہ آہستہ آہستہ اس سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں اور تحقیق و تنقید کے میدان میں قدم جمانا شروع کر دیتے ہیں اس حوالے سے ان کی سب سے پہلی تحقیقی کتاب ان کا سندی تحقیقی مقالہ 'اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ' ہے جو پہلی بار 1972 میں شائع ہوا۔ ان کے اس تحقیقی کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی پہلی اشاعت کے بعد متعدد ایڈیشن منظر عام پر آ چکے ہیں، یہی نہیں بلکہ اس کتاب کو یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی جگہ ملی۔ محمود الٰہی نے اپنی تحقیق میں اردو قصائد پر عربی اور فارسی قصائد کے اثرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی سمت و رفتار کا تعین کیا ہے۔

اردو ناول کی تاریخ میں ڈپٹی نذیر احمد کو پہلا ناول نگار تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن محمود الٰہی نے ان کی اولیت سے انکار کرتے ہوئے مولوی کریم الدین کو اردو کا پہلا ناول نگار اور ان کی کتاب 'خط تقدیر' کو اردو کا پہلا ناول قرار دیا ہے۔ جس کے ثبوت میں انھوں نے اس کے طویل مقدمہ میں متعدد دلائل بھی پیش کیے۔ محمود الٰہی نے مولوی کریم الدین کے اس تمثیلی قصے کو 1964 میں 'اردو کا پہلا ناول۔ خط تقدیر' کے نام سے شائع کیا ہے۔ چونکہ خط تقدیر کا زمانہ تصنیف 1865 ہے اور مرأۃ العروس اس کے چار سال بعد شائع ہوتا ہے اس زمانی تقدم کے علاوہ دیگر اہم انکات بھی پیش کیے ہیں جن سے خط تقدیر کی اولیت ثابت ہوتی ہے، محمود الٰہی کا ماننا ہے کہ اس ناول سے

اردو میں قصہ نگاری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے کیونکہ مغربی ادب کے زیر اثر اردو ادب میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، اب تک کی تحقیق کے مطابق خط تقدیر اس کا اولین نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ مولوی کریم الدین کو آزاد اور نذیر احمد پر زمانی تقدم بھی حاصل ہے جو بعد میں ادبی شہرت حاصل کرتے ہیں حالانکہ اس سے قبل خط تقدیر کو شہرت مل چکی تھی، اس کے علاوہ خط تقدیر میں ناول کے پلاٹ کی جھلک ملتی ہے اور انھوں نے کہانی کو پیش کرنے میں فن کی نزاکتوں کا خیال بھی رکھا ہے کیونکہ کریم الدین اس فن سے بخوبی واقف ہیں کہ مقصد اور کہانی میں کتنی قربت ہونی چاہیے۔ اس طرح مراۃ العروس کے بجائے خط تقدیر کو اردو کا پہلا ناول کہا جاسکتا ہے۔ جس کی تائید وہ درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں حالانکہ محمود الٰہی کی اس تحقیق کو شک کی نظر سے دیکھا گیا لیکن اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ انگریزی ادب کے زیر اثر لکھی جانے والی پہلی تمثیل کا انکشاف ہوا:

''انھوں نے نہ صرف یہ کہ اردو میں پہلی بار ناول لکھا بلکہ اسے سماج کے مختلف طبقوں کا نمائندہ بنانے کی کوشش کی'' (رشحات، ص72)

محمود الٰہی کے تحقیقی کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے استاد پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں کہ گورکھپور اور اس کے نواح کے علمی اور ادبی ذخیروں کی بازیافت میں محمود الٰہی نے پہل کی ہے۔ صحیفۂ محبت، کریم الدین کا خط تقدیر اور میر کے تذکرہ نکات الشعراء اور رجب علی بیگ سرور کے فسانۂ عجائب کے نئے متون کے سلسلے میں محمود الٰہی کی دریافتیں تحقیق میں نئے باب کا اضافہ ہیں۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ محمود الٰہی نے جو تحقیقی سرمایہ پیش کیا ہے وہ تحقیق کی نئی راہیں ہموار کرتا ہے۔ ان کے کھولے گئے نئے باب میں 'فسانۂ عجائب کا بنیادی متن' کی ترتیب وتدوین کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جس کا پہلا ایڈیشن 1973 میں شائع ہوا محمود الٰہی اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''لیکن اب یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ سرور نے فسانۂ عجائب میں جو نثر پیش کی ہے وہ ان کی اپنی نثر نہیں ہے، وہ ان کی ایسی نثر ہے جس میں ان کی ضمیر کی آواز شامل نہیں ہے، فسانۂ عجائب کی نثر سراسر اکتسابی ہے۔ انھوں نے بعض مصلحتوں کے پیش نظر فسانۂ عجائب کو مسجع نثر کا نمونہ بنا کر پیش کیا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سرور ایک سچے اور کھرے نثر نگار تھے اور ان کی نثر اردو نثر نگاری کے ارتقا کی ایک فطری مگر اہم کڑی ہے۔'' (رشحات، ص98)

فسانۂ عجائب کے بارے میں محمود الٰہی نے حیرت انگیز انکشافات کیے ہیں جیسے فسانۂ عجائب کا پہلا نسخہ (1240ھ بمطابق 1824) میر امن کی باغ و بہار کے جواب میں نہیں لکھا گیا تھا۔ سرور نے پہلے نسخے میں سہل ممتنع کو اختیار کیا تھا۔ فسانۂ عجائب لکھنے کا مقصد رنگین اسلوب کا رعب دکھانا ہرگز نہ تھا۔ انیس سال تک لوگ پہلے نسخے کے سہل اسلوب سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ سرور نے اپنے سہل اور فطری اسلوب میں تبدیلی اس وقت کی جب انھوں نے اس پر طباعت کی غرض سے نظر ڈالی۔ محمود الٰہی نے سرور کے اندر پیدا ہونے والی اس حیرت انگیز تبدیلی کا اظہار کچھ اس انداز سے کیا ہے:

''سرور نے آج سے لگ بھگ ڈیڑھ سو سال پہلے فسانۂ عجائب میں جو معیاری نثر پیش کی تھی اور جس کی بنیاد پر انھیں ایک محدود حلقے ہی میں سہی، حسن قبول ملا تھا، وہ نثر فسانۂ عجائب کی پہلی اشاعت (1259ھ) کے بعد ہی نظروں سے اوجھل ہوگئی اور اس وقت سے آج تک دنیا سرور کی ایسی نثر سے دو چار ہے جس پر آورد و تکلف کے ہزار پردے پڑے ہوئے ہیں۔''

سرور کے اسلوب میں اس انقلاب کے محرکات میں محمود الٰہی نے تین بنیادی وجوہات شمار کرائی ہیں۔ اول یہ کہ نصیر الدین حیدر کے عہد کے لکھنؤ میں علیحدگی پسندی اور دہلی سے ممتاز ہونے کا شدید رجحان پیدا ہو چکا تھا۔ دوم یہ کہ فسانۂ عجائب لکھتے وقت سرور کی ادبی حیثیت متعین نہیں ہوئی تھی اس لیے جب ان کو قبولیت ملنا شروع ہوئی ہوگی تو انھوں نے تقاضائے وقت کے مطابق اپنے اسلوب میں تبدیلی کرنا بھی

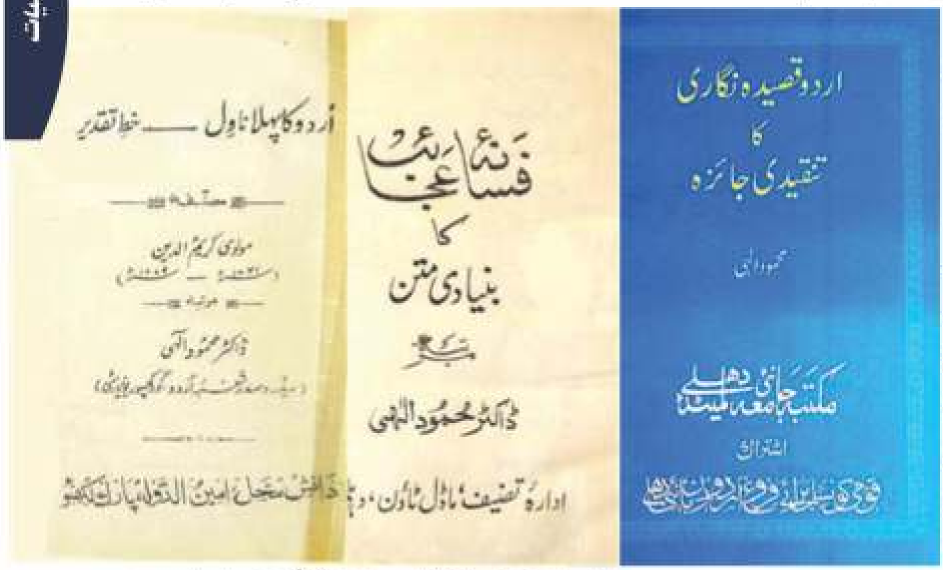

مناسب خیال کیا ہوگا تا کہ شاعری کی طرح نثر میں بھی لکھنؤ کا امتیاز قرار پائے۔ سوم یہ کہ خطی نسخے کے علاوہ فسانۂ عجائب کے متداول نسخوں میں سرور کے استاد 'آغا نوازش' کا ذکر ملتا ہے کہ انھوں نے فسانۂ عجائب پر بغرض اصلاح نظر ڈالی، لہٰذا قرین قیاس ہے کہ استاد نے تبدیلی اسلوب کے مشورے دیے ہوں گے۔

محمود الٰہی نے سرور کی فطری نثر نگاری کو ثابت کرنے کے لیے متعدد مثالیں پیش کی ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ سرور نے اپنی کتاب کو 18 مرتبہ درست کیا تھا جس کا ذکر تحسین دہلوی نے اپنی کتاب 'سروش سخن' میں بھی کیا ہے۔ محمود الٰہی کی تحقیقی نظر نے اس بات کا بھی انکشاف کیا ہے کہ فسانۂ عجائب کا پہلا نام 'فسانۂ عجیب' ہے۔

اسی طرح پروفیسر محمود الٰہی نے 'تذکرۂ شورش' (اصل نام: رموز الشعرا) کی اشاعت کر کے اردو تحقیق میں گراں قدر اضافہ کیا ہے، جس کو انھوں نے عظیم آباد کے شعرائے اردو کا پہلا تذکرہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس تذکرے کا قدیم نسخہ 'خانقاہ رشیدیہ، جونپور' سے حاصل کیا اور 1984 میں اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ سے شائع کیا۔ غلام حسین شورش نے یہ تذکرہ 1191ھ (بمطابق 1777) کو 'شاہ رکن الدین عشق' کی فرمائش پر لکھا تھا۔ جس کی زبان فارسی ہے لیکن اس کا مواد اردو شعراء کے احوال وکوائف اور نمونۂ کلام پر مبنی ہے۔ محمود الٰہی 'مقدمۂ مرتب' اس تذکرے کی اہمیت کا اقرار اس طرح کرتے ہیں:

''اگر تذکرۂ شورش کچھ اور پہلے منظرِعام پر آ جاتا تو گزشتہ نصف صدی سے بہار میں اردو شاعری کے آغاز وارتقا پر جو اختلاف رائے پایا جاتا ہے، اس کی شدت بڑی حد تک کم ہو جاتی کیونکہ اس اختلافی موضوع پر اسے اصل ماخذ کی حیثیت حاصل ہے اور اب تک زیادہ تر ثانوی ماٰخذ سے کام لیا گیا ہے۔''

(مقدمۂ مرتب، تذکرۂ شورش، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ،1984،ص9)

محمود الٰہی نے اپنی تحقیق میں ثابت کیا ہے کہ 'تذکرۂ شورش' بہار میں اردو تاریخ کی روایت کو جاننے کا سب سے قدیم اور مستند وسیلہ ہے جس سے ہم بہار میں اردو ادب کی تاریخی کڑیاں جوڑ سکتے ہیں اور اختلافات کو دور کر سکتے ہیں بشرطیکہ اس کی قدامت کو تسلیم کر لیا جائے جیسا کہ وہ اک دوسری جگہ کہتے ہیں:

''بہار میں اردو شاعری کے آغاز اور اس کے ارتقا کے باب میں تذکرۂ شورش کو سب سے قدیم اور سب سے مستند ماخذ سمجھنا چاہیے۔''

(مقدمۂ مرتب، تذکرۂ شورش، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ،1984،ص15)

محمود الٰہی نے محض یہ تذکرہ ہی شائع نہیں کیا بلکہ صاحب تذکرہ کے سوانحی حالات کی دریافت میں اپنی تحقیقی بصیرت کا ثبوت بھی دیا ہے اور جس قدر ممکن ہو سکا شورش کے حوالے سے معلومات بہم پہنچائی ہیں کہ ان کا اصل نام میر غلام حسین تھا، ان کا عرف 'میر بھینا' اور تخلص شورش تھا، ان کے والد کا نام میر محسن اور وطن عظیم آباد تھا، میر باقر حزیں اور شاہ رکن الدین عشق سے مشورۂ سخن کرتے تھے، تقریباً تمام اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے اور صاحب دیوان شاعر تھے، یہ دیوان تقریباً چار ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تذکرۂ شورش کی دریافت محمود الٰہی کا غیر معمولی کارنامہ ہے۔

محمود الٰہی کے تحقیقی کاموں میں 'تذکرہ نکات الشعرا' کی ترتیب وتدوین کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جس کو بخوبی انجام دینے کے لیے انھوں نے نکات الشعرا کے ایک نسخے کو پیرس کے قومی کتب خانہ سے حاصل کیا اور انجمن کے بنیادی متن کے علاوہ دیگر نسخوں سے موازنہ کرنے کے بعد صحیح متن کی دریافت کی ہے اور اپنے بنائے گئے طریقۂ کار پر اصل متن پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ محمود الٰہی نے اس تذکرہ کا متن تیار کرنے میں جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ دوسرے مرتبین کے یہاں مفقود ہے۔ 'نکات الشعرا' کی متنی تحقیق میں جو نکات ملحوظ خاطر رکھے گئے ہیں وہ محمود الٰہی کے محققانہ ذہن کی اُپج ہیں۔ کہ جو حروف، فقرے یا جملے بنیادی نسخے میں موجود ہیں لیکن نسخۂ پیرس میں موجود نہیں تو انھوں نے اپنے تیار کردہ متن میں ان پر خط کشید کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے اپنے تیار کردہ متن میں نسخۂ پیرس کے اضافوں کو واوین میں درج کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ مختلف نسخوں میں اختلاف نسخ کی وضاحت کے لیے حواشی کا سہارا لیا ہے اور نسخوں کی نشاندہی کے لیے علامتیں متعین کی ہیں۔ اشعار درج کرنے میں نسخۂ انجمن کو بنیادی مرجع بنایا ہے، چونکہ دونوں نسخوں کے اشعار کی تعداد میں اختلاف ہے لہذا اس اختلاف کو دور کرنے کے لیے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جن اشعار کا اضافہ 'نسخۂ پیرس' میں ہے ان کو اپنے متن میں شامل کر لیا ہے اور امتیاز کے طور پر واوین میں درج کیا ہے۔ اسی طرح جو اشعار 'نسخۂ انجمن' میں شامل ہیں لیکن 'نسخۂ پیرس' میں موجود نہیں ان کے شروع کے الفاظ پر خط کشید کر دیا گیا ہے۔

محمود الٰہی نے 'نکات الشعرا' پر نہایت ہی تحقیقی مقدمہ بھی لکھا ہے جس کے ذیل میں متعدد ایسی باتیں آ گئی ہیں جو میر تقی میر اور ان کے تذکرہ سے متعلق نئی معلومات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن کی توضیح وہ 'تذکرہ ریختہ گویاں' اور 'نکات الشعرا' کو مدمقابل رکھتے ہوئے حقائق کا انکشاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس حوالے سے ان کے ایک جملے کی معنویت ملاحظہ ہو، جس سے ان کے تحقیقی شعور کا علم بھی ہوتا ہے:

''یہ دونوں تذکرے معاصرانہ چشمک کے مظاہر ہیں اور ایک کا مطالعہ دوسرے کے مطالعے کے بغیر نامکمل رہے گا۔'' (رشحات، ص76)

محمود الٰہی کے کارناموں میں 'صحیفۂ محبت' کو بھی ستائش کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ یہ مہدی افادی کے خطوط کا مجموعہ ہے جس کو محمود الٰہی نے ترتیب دے کر 1964 میں ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ سے شائع کیا۔ یہ وہ خطوط ہیں جن کو مہدی افادی نے اپنی بیوی عزیز النسا (مہدی افادی) کے نام لکھے۔ اردو ادب میں ان خطوط کی اہمیت ان کی ادبیت کی وجہ سے ہے جس کا اظہار محمود الٰہی کچھ اس طور پر کرتے ہیں:

''خوب صورت الفاظ کی ترکیب اور تراش خراش اور موزونیت کے ساتھ ان کی ترتیب یہ مسٹر مہدی حسن کا خاص حصہ ہے اور تمام خوبیوں پر دور جدید میں الفاظ کے سکے ڈھالنا اور اتنا خوبصورت گڑھنا کہ دیکھنے والے دنگ ہو جائیں۔ یہ مسٹر مہدی حسن کا اعلیٰ کمال ہے۔'' (رشحات، ص40)

محمود الٰہی نے اپنی تحقیق میں ثابت کیا ہے
کہ 'تذکرۂ شورش' بہار میں اردو تاریخ کی روایت
کو جاننے کا سب سے قدیم اور مستند وسیلہ ہے
جس سے ہم بہار میں اردو ادب کی تاریخی کڑیاں
جوڑ سکتے ہیں اور اختلافات کو دور کر سکتے ہیں
بشرطیکہ اس کی قدامت کو تسلیم کر لیا جائے

محمود الٰہی ان خطوط کی اہمیت کے پیش نظر اس پر جامع مقدمہ بھی تحریر کرتے ہیں جس میں ان کے تحقیقی شعور کے علاوہ تنقیدی بصیرت کا بھی علم ہوتا ہے کہ انھوں نے مہدی افادی کی جمالیاتی حس اور رومانیت کو کس پیرائے میں پرکھا ہے اور اس کی وجوہات کا نفسیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ صحیفۂ محبت کے مقدمہ میں محمود الٰہی نے مہدی افادی کی سماجی، خانگی اور ادبی زندگی کو جس نقطۂ نظر سے پرکھا ہے اس میں ایک ماہر نقاد کا ذہن کام کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً مہدی افادی میں شادی کے بعد پیدا ہونے والے فکری اور جذباتی انقلاب کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے دونوں ادبی سرمایوں پر کچھ اس طرح رائے دیتے ہیں:

''اس رشتے پر جو مسرت انھیں حاصل ہوئی، اس کا اظہار انھوں نے کھل کر اپنے دوستوں سے کیا یہاں تک کہ شادی کے بعد جو دو تین مضامین انھوں نے لکھے وہ بھی ان کے اس جذبہ مسرت کے ترجمان بن گئے۔ میں ان کے اس طرز کے مضامین کو اردو ادب میں ایک صحت مند اضافہ سمجھتا ہوں مگر اس کے ساتھ میں اس حقیقت کو بھی

سامنے لانا چاہتا ہوں کہ ان کے یہ مضامین اور جو خطوط انھوں نے اپنی رفیقہ حیات کو لکھے ہیں وہ دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ ان مضامین کے بہت سے جملے ان خطوط میں نظر آئیں گے۔ مضامین میں نور جہاں، جہاں گیر، عذرا وغیرہ کا جو ذکر ہے اس کی تفسیر ان خطوط میں ملے گی۔'' (رشحات، ص: 41)

محمود الٰہی 'افادات مہدی' اور 'صحیفۂ محبت' کو ان کا قیمتی سرمایہ تسلیم کرتے ہیں۔ وہ صرف ان کے خطوط کی ادبیت کی ہی ستائش نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کے مضامین کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جن میں ایسی ادبی قدریں پائی جاتی ہیں جو مہدی افادی کے مقام کو نمایاں کرتی ہیں۔ ان کے تنقیدی اور ادبی مقام کو متعین کرتے ہوئے محمود الٰہی نے اپنے قیمتی خیالات پیش کیے ہیں جن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

محمود الٰہی کے تحقیقی سرمایے میں 'الہلال اور البلاغ' کی اشاعت کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے کافی تلاش و جستجو کے بعد دونوں اخبارات کی فائلوں کو جمع کیا اور پہلی بار مرتب کر کے 1988 میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے تین جلدوں میں شائع کیا۔ دونوں اخبارات کی اشاعت کو اردو صحافت کا عہد زریں تصور کیا جاتا ہے۔ دونوں اخبارات کی تحقیق میں محقق کو کن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا اس کو بڑی تفصیل سے مقدمے میں بیان کیا گیا ہے حتی کہ وہ اپنے اہل خانہ کو اس کی تحقیق میں شامل کر کے اس کو اجتماعی تحقیق میں بدل دیتے ہیں:

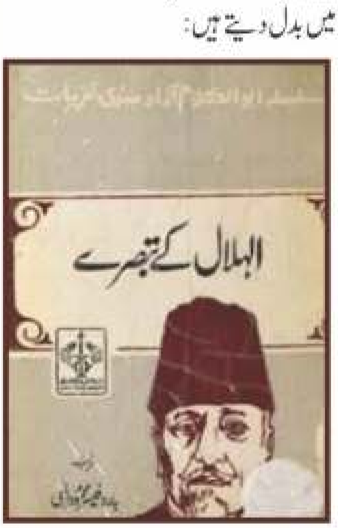

''اس کے بعد ایک ایک کر کے میں نے سارے شماروں کے الیکٹرو اسٹیٹ عکس حاصل کر لیے۔ اصل مرحلہ اس کے بعد پیش آیا جسے میں تنہا طے نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اپنی بیوی کے سامنے مسائل رکھے اور اس سے کہا کہ میں ہفتے دو ہفتے کے لیے سارے گھر کو اس کام میں لگانا چاہتا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ گھر کے معمولات میں فرق بھی نہ آئے اور اپنی اپنی بساط کے مطابق گھر کا ہر فرد اس کام میں میری مدد بھی کر دے۔''

محمود الٰہی نے 'الہلال اور البلاغ' کے مقدمے میں دونوں اخبارات میں پیش کیے گئے مولانا آزاد کے مذہبی، سیاسی، قومی، سماجی اور اقتصادی نظریات پر باریک روشنی ڈالی ہے۔ جس سے ان اخبارات کی اہمیت اور افادیت کا پہلو سامنے آتا ہے کہ اگر یہ اخبارات مرتب نہ کیے جاتے تو نئی نسل کو آزاد کے ذہن کو سمجھنا کتنا مشکل ہوتا۔ اس اعتبار سے محمود الٰہی کا یہ تحقیقی کام قابل قدر ہے۔ محمود الٰہی نے دونوں اخبارات کے اسلوب کا بھی جائزہ لیا ہے اور ان کے طرز نگارش کو تین خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک اسلوب تو وہ ہے جو خطیبانہ شان کا حامل ہے، دوسرا وہ ہے جو عالمانہ یا فلسفیانہ رنگ رکھتا ہے، تیسرے اسلوب کو ان کا فطری اسلوب خیال کیا جاتا ہے جس میں غزلیت اور افسانویت کا امتزاج پایا جاتا ہے اس اسلوب کی نمائندگی غبار خاطر میں بھی نظر آتی ہے۔

اسی طرح 'بازیافت' ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جو 1965 میں دانش محل لکھنؤ سے شائع ہوا، یہ مجموعہ ان کے تنقیدی شعور کا غماز ہے، جس میں دس مضامین شامل ہیں۔

مذکورہ کتابوں کے علاوہ بھی ان کی متعدد کتابیں دستیاب ہیں جن پر انھوں نے اہم مقدمے قلم بند کیے۔ ڈراما انارکلی پر مختلف ناقدین نے مقدمے لکھے لیکن محمود الٰہی کا مقدمہ ان سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ مختلف رسائل و جرائد میں ان کے متعدد مضامین شائع ہوئے اس کے علاوہ انھوں نے اتر پردیش اردو اکادمی سے شائع ہونے والے رسائل میں اہم اداریے اور کتابوں پر گراں قدر مقدمے تحریر کیے۔ مولانا آزاد صد سالہ تقریب کے موقعے پر وہ اتر پردیش اردو اکادمی کے چیئرمین تھے، لہٰذا انھوں نے ملک کے مشہور قلمکاروں کی سو کتابیں شائع کیں جن پر پیش لفظ بھی لکھے، اسی موقعے پر انھوں نے ادب میں ان اخبارات کو جگہ دی جو اپنی بیباکی کے لیے مشہور تھے اور انگریزوں کے حریف تھے ایسے اخباروں میں مدینہ، زمیندار، پیغام، الہلال، البلاغ، ہمدرد، زمانہ وغیرہ قابل ذکر ہیں جن کے انتخابات کو اکادمی سے شائع کرانے

محمود الٰہی نے 'الہلال اور البلاغ' کے مقدمے میں دونوں اخبارات میں پیش کیے گئے مولانا آزاد کے مذہبی، سیاسی، قومی، سماجی اور اقتصادی نظریات پر باریک روشنی ڈالی ہے۔ جس سے ان اخبارات کی اہمیت اور افادیت کا پہلو سامنے آتا ہے کہ اگر یہ اخبارات مرتب نہ کیے جاتے تو نئی نسل کو آزاد کے ذہن کو سمجھنا کتنا مشکل ہوتا۔

کا اہم کام انجام دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اکادمی سے شعری انتخاب، نثری انتخاب، تراجم، نصابی کتب اور تذکرے بھی شائع کیے۔

المختصر یہ کہ پروفیسر محمود الٰہی زخمی کی حیات اور خدمات کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ ایک محفل میں ان کا مکمل بیان کرنا ناگزیر ثابت ہوگا لہٰذا ان کے اہم کارناموں کی نقاب کشائی پر ہی اکتفا کیا گیا ہے کیونکہ ضروری نہیں کہ کسی خوشبو کا تعارف کرانے کے لیے اس کی تمام تر خوبیاں اور اثرات پیش کیے جائیں، کچھ معاملات ذوق کے حوالے بھی کیے جا سکتے ہیں، حس خود بخود اپنی منزل ڈھونڈ لے گی، محمود الٰہی کی شخصیت بھی خوشبو کی طرح ہے جو اپنے کارناموں اور فتوحات کے سبب پہچان لیے جاتے ہیں۔ اردو زبان و ادب کے تئیں ان کا گہرا خلوص ایسا گراں قدر اثاثہ ہے جو ان کو کبھی فراموش نہیں ہونے دے گا۔ محمود الٰہی نے شخص سے شخصیت اور شاعر سے محقق بننے تک کا جو سفر طے کیا ہے اس میں وہ ایک ماہر مدرس، کامیاب منتظم، باذوق شاعر اور اپنے عہد کے سنجیدہ محقق ثابت ہوتے ہیں۔

■

Prof. Abbas Raza Nayyar
Department of Urdu
University of Lucknow, Lko.
Mob: 9919785172
Email: abbasrazanayyar@gmail.com

محمد صادق اختر

اردو اور فارسی کے استاد شاعر

کاہش جونپوری

گیا ایک قدیم اور معروف شہر ہے اس کی تاریخی حیثیت مسلم ہے۔ یہی وہ شہر ہے جہاں گوتم بدھ کو علم کی روشنی حاصل ہوئی اور وہ سدھارتھ سے گوتم بدھ ہوگئے۔ یہی وہ شہر ہے جس کے متعلق ایک قوم کا عقیدہ ہے کہ اگر آپ مرنے کے بعد نجات اور عیش وآرام والی اچھی زندگی کے خواہاں ہیں تو یہاں آکر نذرانہ عقیدت پیش کرنا ضروری ہے۔ انھیں خصوصیات اور امتیازات کی وجہ سے لوگ اس خطے کی طرف کھنچے چلے آئے اور اسے اپنی علمی اور عملی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ اس خطے میں ہندوؤں اور بدھ مذہب کے ماننے والوں کے علاوہ مسلمان بھی بڑی تعداد میں آکر آباد ہوئے اور اپنی علمی، ادبی اور دینی سرگرمی کا اسے مرکز بنایا۔ فارسی زبان وادب کی ترقی اور اس کی اشاعت میں بھی اس خطے کا ایک اہم رول رہا ہے، بے شمار شعرا، ادبا اور نثرنگاروں نے اپنی علمی جولانیاں دکھائی ہیں جو نہ صرف گیا، بلکہ بہار اور ہندوستان کے لیے بھی قابل فخر ہیں۔ انھیں شخصیات میں حضرت مولوی اولاد علی کاہش بھی ہیں، آپ کا اصل وطن جونپور ہے، لیکن مادی ضرورتوں کے ساتھ گیا کی علمی و روحانی کشش انھیں اس شہر میں کھینچ لائی۔ گیا آنے کے بعد انھوں نے یہاں کی عدالت میں ملازمت اختیار کی اور وہیں مقیم ہوگئے، دوران اقامت انھوں نے وہیں شادی بھی کی اور اولاد بھی ہوئے، وہ فارسی اور اردو دونوں زبان میں شاعری کرتے تھے۔ کاہش صاحب نے خود اپنے دیوان میں اپنا مختصر تعارف پیش کیا ہے اس کی تفصیل ان کے دیوان سے نقل کی جاتی ہے۔

''ہیچمدان... سید اولاد علی الکاظمی الجونفوری بن سید محمد عوض مرحوم... متخلص کاہش''

اس عبارت سے یہ واضح ہوا کہ ان کا نام سید اولاد علی اور وطن جونپور ہے، انھوں نے اپنا تخلص کاہش اختیار کیا تھا۔

سید اقبال احمد اپنی کتاب تاریخ شیراز ہند جونپور کے صفحہ 263 و64 پر حضرت کاہش کے متعلق لکھتے ہیں:

آپ کا نام حکیم اولاد علی، کاہش تخلص نواسہ شاہ عنایت مخدوم کے تھے، آپ 1217 ہجری مطابق 1802 میں پیدا ہوئے اور جب سن تمیز کو پہنچے تو پڑھنے میں لگائے گئے۔ اولا مختصرات عربیہ اپنے بزرگوں سے پڑھا بعدہ لکھنو گئے اور علمائے فرنگی محل سے کافی فیض حاصل کیا اور علم طب حکیم مسیح الزماں سے پڑھا اور مطب میں بیٹھے۔ ہر قسم کا تجربہ تھوڑے عرصے میں حاصل کر کے حکیم حاذق بن گئے آپ کو شاعری سے بھی شوق تھا۔ کلام فارسی کی مشق واصلاح مرزا قتیل سے اور اردو کلام کی مشق واصلاح حضرت شیخ ہمدانی مصحفی سے کیا۔ آپ شاعر نازک خیال اور خوش گو تھے بعد تکمیل کمالات آپ جاہ ومنصب کے حصول میں کوشاں ہوئے۔ اولا ضلع گیا میں عہدہ پیشکاری عدالت دیوانی مقرر ہوئے بعدہ سررشتہ داری کے عہدہ پر مامور ہوئے چند سال ملازمت کر کے ترک کر دیا اور گوشہ قناعت میں بیٹھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حصول علم کے لیے وہ لکھنؤ گئے تھے اور اعلی تعلیم انھوں نے وہیں سے حاصل کی، اور یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت لکھنو شہر اہل علم، ادیبوں اور شاعروں کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ وہاں نامور شعرا، معروف ادبا، ماہرین فن شاعری اور نکتہ دان زبان وادب کی ایک بہت بڑی تعداد موجود تھی، چنانچہ یہ بعید نہیں کہ کاہش صاحب نے اس ادبی ماحول، شعر وشاعری کے حلقوں اور محفلوں سے اپنے ذوق شاعری کی آبیاری نہ کی ہو اور اسے جلا نہ بخشی ہو۔

سید احمد اللہ ندوی اپنی کتاب 'تذکرہ مسلم شعرائے بہار' میں لکھتے ہیں:

عربی، فارسی اور اردو زبان میں ید طولی حاصل تھا۔ بیشک اس کا ثبوت ان کی اردو اور فارسی کی شاعری ہے اور اسی طرح عربی کے وہ مصرعے جو ان کی فارسی شاعری میں صنعت تلمیح کے طور پر استعمال ہوئے ہیں وہ ان کی ان تینوں زبانوں میں مہارت کے ثبوت دیتے ہیں۔

تذکرہ نگاروں کے مطابق وہ کافی دنوں تک شہر گیا میں رہے پھر وطن اصلی جونپور کو لوٹ گئے اور وہیں انتقال کیا، ان کو شاعری میں کمال دسترس تھا اس کے متعلق سید احمد اللہ ندوی کاہش صاحب کے ایک تعلق والے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ جونپور میں ایک مجلس مشاعرہ نہایت تزک واحتشام سے منعقد ہوئی، لکھنو سے جناب انیس مرحوم کے پوتے تشریف لائے، جناب کاہش اور دوسرے چوٹی کے شعرا جمع ہوئے۔ جناب انیس مرحوم کے پوتے نے چند اشعار تعلّی کے پڑھے۔ ان اشعار کو سن کر کاہش صاحب کی رگ حمیت پھڑک اٹھی اور برجستہ اسی مجلس میں بیٹھے بیٹھے ڈیڑھ سو اشعار مثنوی کی بحر میں لکھ کر اسی مشاعرہ میں پڑھ کر

سنایا، جس کے بعد مجلس میں سناٹا چھا گیا جن میں چند شعر یہ ہیں۔

رکتی ہے کب کسی سے مری طبع نکتہ گیر   مونس ہوں، یاانیس ہوں، یاانس یا دبیر
جولانی پر جو آئے مری طبع نکتہ گیر   نیزوں اڑے یہ اشہب خامہ، بسان تیر
جولانی پہ اگر فرس طبع بھڑ پڑے   چکر وہ دوں کہ ابلق ایام گر پڑے

حضرت کاہش ایک استاد شاعر تھے حضرت عطا حسین فانی صاحب کے مطابق گیا میں ان کے کافی شاگرد موجود تھے، اس کا ذکر سید احمد اللہ ندوی نے بھی اپنی کتاب تذکرہ مسلم شعرا بہار میں کیا ہے اور ان کے چند شاگردوں کی فہرست بھی دی ہے۔ معلوم نہیں جونپور میں بھی ان کے شاگرد تھے یا نہیں، کسی جگہ بھی اس کا تذکرہ نہیں ملا۔

حضرت کاہش ایک اچھے اور حاذق طبیب بھی تھے، طب کی تعلیم انھوں نے حکیم مسیح الزماں صاحب سے حاصل کی تھی۔ اقبال جونپوری کے مطابق انھوں نے مطب میں ہر قسم کا تجربہ حاصل کیا اور اس فن میں مہارت حاصل کی۔

تذکرہ نگاروں کے بیان سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ انھوں نے طب کی تعلیم حاصل کی تھی اور اس میں ہر قسم کا تجربہ بھی حاصل کیا تھا لیکن انھوں نے اس فن کو پیشے کی حیثیت سے اختیار کیا یا نہیں یا عارضی طور پر بھی اپنا مطب قائم کیا تھا یا نہیں اس کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ اسے پیشے کے طور پر اختیار نہ کرنے کی وجہ کیا تھی اس کا بھی سبب نہیں معلوم ہوا جب کہ اس زمانہ میں طب ایک معزز پیشہ سمجھا جاتا تھا۔

فیاض احمد علیگ صاحب نے اپنے ایک مضمون میں جو مضامین ڈاٹ کام پر 'جونپور کے چند طبیب شعرا' کے عنوان سے اگست 2018 میں شائع ہوا ہے۔ اس کے مطابق ''وہ بہار کے ضلع گیا میں دیوانی عدالت میں پیش کار رہے اور اس کے بعد ترقی کر کے سررشتہ دار کے عہدہ پر مامور ہوئے لیکن چند سالوں بعد ہی یہ ملازمت بھی چھوڑ دی اور گوشہ نشیں ہو کر تجرد کی زندگی گزاری۔'' حالانکہ دوسرے تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے تجرد کی زندگی نہیں گزاری بلکہ زن و فرزند رکھتے تھے۔ کیفیت العارفین و نسبت العاشقین کے ضمیمہ میں سید حسین الدین احمد نے واضح طور پر گیا میں ان کے شادی کرنے کا ذکر کیا ہے اور ان کے ایک پوتے حافظ سید ارادت الحق صاحب مرحوم کا بھی ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب عیال تھے زن و فرزند رکھتے تھے لیکن ایک سوال جس کی تفصیل نہیں ملتی وہ یہ کہ کیا جب وہ جونپور واپس گئے تو بچوں کو ساتھ لے کر گئے یا نہیں گیا میں ہی چھوڑ دیا، اگر اہل و عیال ساتھ میں جونپور ہجرت کر کے نہیں گئے وہ تنہا گئے اس اعتبار سے فیاض احمد علیگ صاحب کا کہنا درست ہے کہ ملازمت ترک کرنے کے بعد وہ گوشہ نشیں ہو گئے اور تجرد کی زندگی گزاری۔ لیکن سید حسین الدین احمد صاحب نے کیفیت العارفین و نسبت العاشقین کے ضمیمہ میں ایک نوٹ لکھا ہے کہ ''اب آپ کے خاندان میں یہاں کوئی نہیں شاید جونپور میں ہوں'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ کے اہل و عیال بھی جونپور منتقل ہو گئے تھے۔

سید احمد اللہ ندوی کے مطابق کاہش کے پوتے حافظ ارادۃ الحق صاحب نے کاہش کا تذکرہ لکھا تھا اور ان کی اردو کی غزلیں جمع کی تھیں، مگر اب ان کا اردو کلام نایاب ہے۔ معلوم ہوتا ہے شاید تذکرہ میں ہی غزلوں کو جمع کیا تھا اسی لیے تذکرہ اور غزلیں دونوں ہی معدوم ہو گئیں۔

دوسری بات جیسا کہ سید احمد اللہ ندوی اور دوسرے تذکرہ نگار حضرات ذکر کر رہے ہیں کہ ان کا دیوان اردو ضائع ہو گیا لیکن یہ معلوم نہیں کہ یہ دیوان انھوں نے خود ترتیب دی تھی یا یہ وہی اشعار کا مجموعہ ہے جسے ان کے پوتے سید ارادۃ الحق صاحب نے جمع کیا تھا یا کسی تیسرے فرد نے جمع کیا تھا۔

کاہش صاحب نے اپنے فارسی دیوان کے خاتمہ میں ذکر کیا ہے 'تمام شد دیوان دوئم فارسی' (فارسی کا دوسرا دیوان مکمل ہوا) اس عبارت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید فارسی کا دیوان اول بھی تھا لیکن اس کا ذکر کہیں نہیں ملا، اس لیے ایسا لگتا ہے کہ اردو کے دیوان کو دیوان اول کہا ہے اور فارسی کے دیوان کو دیوان دوم۔

سید حسین الدین احمد صاحب کی عبارت سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''ان کا اردو کا کلام میرے پاس نہیں ہے فارسی کا دوسرا دیوان ہے۔''

کاہش صاحب نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کی۔ شاعروں اور ادیبوں کے حلقے میں ان کی شناخت ایک ماہر اور استاد شاعر کی حیثیت سے تھی۔ محققین اور نقاد انھیں 'ایک نازک خیال، خوشگو اور اسی طرح 'اردو و فارسی زبان و ادب پر کامل دسترس رکھنے والا شاعر' مانتے ہیں۔

کاہش صاحب کی دیگر تصانیف میں ایک کتاب منتخب العروض ہے نام سے معلوم ہوتا ہے اس کتاب میں اشعار اور اس کے عروض وغیرہ کے موضوع پر بحث کی گئی ہے، شاید کاہش صاحب کو یہ ذوق اپنے استاد مرزا قتیل صاحب سے ہی حاصل ہوا ہو کیونکہ قتیل صاحب کی بھی کئی کتابیں فن عروض، علم بیان اور معانی پر ہیں۔

'کیفیت العارفین و نسبت العاشقین' کی اطلاع کے مطابق کاہش صاحب کے اہل خاندان تصوف و عرفان سے وابستگی رکھتے تھے اور کچھ افراد سلسلہ قادریہ رشیدیہ میں بیعت بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے بھی اصلاح باطنی کے لیے اپنے بزرگوں کے طریقے کو اختیار کیا اور جونپور میں ہی سلسلہ قادریہ رشیدیہ میں بیعت ہو گئے۔ لیکن جب وہ گیا آئے اور سید شاہ عطا حسین صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور ان کے کمالات سے آشنا ہوئے تو بے دریغ خود کو ان کے حوالے کر دیا اور ان سے اصلاح کا تعلق قائم کر کے سلسلہ ابوالعلائیہ میں بیعت ہو گئے۔

کاہش صاحب نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کی۔ شاعروں اور ادیبوں کے حلقے میں ان کی شناخت ایک ماہر اور استاد شاعر کی حیثیت سے تھی۔ محققین اور نقاد انھیں 'ایک نازک خیال، خوشگو' اور اسی طرح 'اردو و فارسی زبان و ادب پر کامل دسترس رکھنے والا شاعر' مانتے ہیں۔

کاہش صاحب کا قلمی دیوان جس کا ذکر تذکروں میں دیوان دوم کے نام سے ہوا ہے خانقاہ منعمیہ ابوالعلائیہ گیا میں موجود ہے، بعض بعض جگہوں پر کرم خوردہ ہونے کے باوجود کسی حد تک اچھی حالت میں ہے۔

اس کے بارے میں کتاب 'نذر خدا بخش' میں جسے محققین نے خدا بخش کے کارنامے کو لوگوں کے سامنے اجاگر کرنے کے لیے لکھا ہے اس میں ایک مضمون بہار

کے اندر فارسی آثار کے متعلق بھی ہے۔جس میں ان محققین نے بھی حضرت کاہش کے اس دیوان کے موجود ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے علاوہ ان کی دوسری تصانیف کی موجودگی کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔

اس دیوان کے ہر صفحے پر کم از کم چھ اور زیادہ سے زیادہ نو ابیات ہیں۔اس کے صفحات بڑے ہیں، نستعلیق رسم الخط میں لکھے ہوئے ہیں اور لائنیں سیاہ اور جلی ہیں، شاید کسی ماہر کاتب نے کتابت کی ہے۔ کچھ اوراق کرم خوردہ ہیں اور بوسیدہ بھی ہو چکے ہیں۔اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

از قامت بالای تو دل شد تہ و بالا   العظمۃ للہ تبارک و تعالی

''تیری بلند قامتی سے میرا دل تہ و بالا ہوگیا، ساری عظمت اللہ تبارک وتعالی کے لیے ہی ہے۔''

کاہش صاحب کی شاعری داخلی کیفیات سے لبریز ہے۔ کوئی غزل ایسی نہیں ہے جس میں انھوں نے اپنے زخم خوردہ جگر، اپنے دل بیتاب، محبوب کی بیوفائی اور اس کی جفاؤں کا تذکرہ نہ کیا ہو۔ان کا پسندیدہ مضمون محبوب کی جفا، اس کا ظلم وستم، اس کی بے رخی و بے پروائی، اس کی نازواداا ور عاشق کی دیوانگی و بے خودی وغیرہ ہے۔

خون دل یاقوت نماید لب لعلت   دندان تو بی آب کند لولوی لالا

''تیرے لبوں کی سرخی یاقوت کے دل کو بھی خون کرتی ہے اور تیرے دانتوں کی چمک کے سامنے موتیوں کی رونق بھی پھیکی ہے۔''

آمد پی نظارہ ام آن بت بہ لب بام   ای شوق جنوں سلمک اللہ تعالی

''اس بت کی دیدار کے لیے میں لب بام آیا ہوں، اے شوق جنون اللہ ہی تیرا محافظ ہے۔''

بہ ربود رخ وابروت ای جان دل کاہش   اقررت لمن زین بدرا وہلالا

''تیرے رخ اور ابرو نے کاہش کے دل پر قبضہ جمالیا ہے، میں اس ذات کی عظمت کا اقرار کرتا ہوں جس نے بدر جیسی صورت اور ہلال جیسی ابرو بنائی۔''

اور اس عبارت پر یہ دیوان ختم ہوتا ہے:

''تمام شد دیوان دوم فارسی از نتائج طبع بندہ ہیچمدان احقر العباد کمترین خلایق اعجز الناس المرجوالی اللہ الغنی القوی المدعوا بالسید اولاد علی الکاظمی الجونفوری ابن سید محمد عوض مرحوم غفر اللہ لہما وستر عیوبہما متخلص بہ کاہش در سنہ 1271 ہجری ماہ ربیع الثانی تاریخ سیوم مطابق سیوم جنوری 1854 موافق ہیجدہم ماہ پوس 1261 فصلی روز سہ شنبہ در قصبہ گیا متعلقہ ضلع بہار نوشتہ شد. واین کمترین از تلامذہ جناب فیض مآب غواص بحور تکمیل جناب مرزا محمد حسن قتیل کہ باتفاق آب ودانہ در این قصبہ رسیدہ وبہ عہدہ پیشکاری عدالت دیوانی ضلع بہار ممتاز گردیدہ وبہ ہمان زمان تالیف دیوان ہذا نمود۔''

فارسی کا دوسرا دیوان جو بندہ سید اولاد علی کاظمی جونپوری ابن سید محمد عوض مرحوم، کاہش تخلص کی شاعرانہ کاوش کا نتیجہ ہے سنہ 1217 ہجری ربیع الثانی کی تیسری تاریخ مطابق سنہ 1854 عیسوی جنوری کی تین تاریخ سہ شنبہ کے روز قصبہ گیا ضلع بہار میں تکمیل کو پہنچا، بندہ حقیر مرزا محمد قتیل کے شاگردوں میں ہے۔اور یہ اتفاق ہے کہ آب و دانہ کی تلاش میں اس قصبہ میں پہنچا اور عدالت میں پیشکاری کے عہدے پر فائز ہوا۔

اس مذکورہ عبارت سے کچھ بنیادی اطلاعات جیسے اس دیوان کی تکمیل کی تاریخ اور کس جگہ تکمیل کو پہنچی وغیرہ کے بارے میں معلوم ہوا۔اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ مرزا محمد حسین قتیل کے شاگرد تھے اور تلاش آب ودانہ انھیں گیا لے آئی۔ اس کے بارے میں غور کرنے پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ لکھنؤ تعلیم حاصل کرنے گئے تھے اسی دوران ان کی ملاقات مرزا قتیل صاحب سے ہوئی اور استادی وشاگردی کا رشتہ قائم ہوگیا یا تعلیم کی تکمیل کے بعد، یا پھر غائبانہ طور پر۔

لیکن کاہش صاحب کے اس دعویٰ کی تفصیل کہ وہ مرزا قتیل کے شاگرد ہیں کسی تذکرہ میں نہیں ملتی۔ کاہش جونپوری صاحب کی ولادت سنہ 1802 میں ہوئی اور مرزا قتیل صاحب کا انتقال 18-1817 میں ہوا ہے۔ اس لحاظ سے مرزا قتیل کی وفات کے وقت کاہش صاحب کی عمر 16 سال کی ہوتی ہے۔اور عموماً عمر کا وہ مرحلہ شاعری کی ابجد کا ہوتا ہے۔لہٰذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے اس عمر میں کس طرح ان کی شاگردی اختیار کی اور کیسے اصلاح لی، تذکرے اس کی تفصیل سے خالی ہیں۔لیکن کاہش صاحب کے تذکرے میں ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کے لیے لکھنؤ گئے تھے اور اس وقت مرزا قتیل کا قیام لکھنؤ ہی میں تھا اور اودھ میں ان کی شاعری کی دھوم تھی، ان کے شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ تھا۔ چنانچہ یہ ممکن ہے کہ کاہش صاحب نے لکھنؤ میں مرزا قتیل صاحب کی شہرت سنی، ان کی فارسی دانی سے واقف ہوئے اور دوران تعلیم ہی ان کی شاگردی اختیار کرلی۔

دوسری بات یہ کہ جس وقت مرزا قتیل اور مرزا غالب کے شاگردوں میں چپقلش کا آغاز ہوا اس وقت کاہش صاحب کی عمر تقریباً 26-25 سال ہوگی لیکن اپنے استاد کی دفاع میں کاہش صاحب کا کچھ بھی حصہ نظر نہیں آتا۔

کاہش صاحب کی شاعری داخلی کیفیات سے لبریز ہے۔کوئی غزل ایسی نہیں ہے جس میں انھوں نے اپنے زخم خوردہ جگر، اپنے دل بیتاب، محبوب کی بیوفائی اور اس کی جفاؤں کا تذکرہ نہ کیا ہو۔ان کا پسندیدہ مضمون محبوب کی جفا، اس کا ظلم وستم، اس کی بے رخی و بے پروائی، اس کی نازواداا ور عاشق کی دیوانگی و بے خودی وغیرہ ہے۔

ان کی شاعری میں وہی مضامین عشق ومحبت اور اس کی نیرنگیاں نظر آتی ہیں۔ تصوف اور اس کی کیفیات بھی دکھتی ہیں۔ یہ سب گرچہ پامال مضامین ہیں لیکن انھوں نے اس کے بیان میں نئے نئے پیرایے ایجاد کیے ہیں۔اس کے اندر ایسی تنوع اور جدت پیدا کی ہے کہ پڑھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ایک ہی مضمون کو مختلف طریقے سے بیان کیا ہے اس کے لیے مختلف تعبیرات کا استعمال کیا ہے جس سے قاری محسوس کرتا ہے کہ کوئی نیا مضمون ہے۔اس جدت نے انھیں ایک استاد شاعر کی حیثیت سے روشناس کرایا ہے۔

ان کی ایک غزل کے چند ابیات نقل کیے جارہے ہیں۔

دریغ یکدم آب از گلوی تشنہ مدار   اگر بدست تو شمشیر آبداری ہست

''میرے پیاسے حلق کو پانی سے محروم مت کرو، خواہ آبدار تلوار کے ذریعے ہی ہو۔''

بہ روی نو خط ساقی نظر فگن کاہش　　　شراب کہنہ بہ پیا کہ نو بہاری است

''نوخیز ساقی کے چہرے پر اے کاہش نظر ڈالو اور پرانی شراب لاؤ کہ موسم بہار کا آغاز ہے۔''

اس بیت کے مضمون کو دیکھیے کتنی معنویت اور کتنی گہرائی ہے۔ کہتے ہیں پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں اس تشنگی کو دور کرنے کے لیے پانی کی ضرورت ہے اور معشوق کی فطرت میں جفا ہے عاشق کو تڑپتا دیکھنے میں اسے مزہ آتا ہے، چنانچہ عاشق اس سے درخواست کرتا ہے کہ پانی نہ سہی تمھارے پاس آبدار تلوار تو ہے اس سے تو دریغ مت کرو، کم سے کم اس پیاس کو دور کرنے کے لیے میرے اوپر آبدار تلوار ہی استعمال کر لو شاید اس سے میری پیاس بجھ جائے اور تم کو بھی میرا تڑپنا مزہ دے گا۔

آپ نے چونکہ اردو شاعری کی اصلاح کے لیے غلام ہمدانی مصحفی کی شاگردی اختیار کی تھی چنانچہ ان کے مطالب و مضامین اور ان کے انداز کا اپنے فارسی کے اشعار میں بھی تتبع کیا ہے خود ایک غزل کے مقطع میں اس کا اظہار بھی فرمایا ہے۔

می شود لعل لبت این قدر شراب آلود　　　تو بہ آن بادگران خوردہ یقین من است

''تیرے لعل جیسے لب اس قدر شراب آلود ہیں، مجھے یقین ہے کہ تم نے اس قیمتی بادہ سے ضرور لذت اندوزی کی ہے۔''

باغ تازہ نشد خاطر فشردہ من　　　گل خزان زدہ گویا دل حزین من است

''میرے دل کا باغ مرجھایا ہوا ہے، میرا غمگین دل گویا خزان زدہ گل ہے۔''

تصوف میں عشق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ عشق ہی تصوف کی معراج ہے۔ کاہش صاحب چونکہ ایک صوفی ہیں اور تصوف سے ان کا گہرا تعلق ہے اس لیے بھی ان کی شاعری میں جا بجا عشق کے تذکرے ملتے ہیں۔

حسن و عشق کے بیان کے جتنے بھی پیرایے ہو سکتے تھے سب انھوں نے اختیار کیا اور یہ مصحفی کی شاگردی کا اثر ہے جو ان کے اشعار میں نظر آ رہا ہے۔ ان کی فارسی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کا محور حسن و عشق کے معاملات ہیں خواہ وہ مجازی ہوں یا حقیقی۔ چونکہ غزل کا موضوع ہی داخلی کیفیات کا بیان ہے چنانچہ انھوں نے اپنے اشعار میں اس کو بہت اچھی طرح برتا ہے۔

بہ کشا دہن تنگ کہ راہ عدم این است　　　بردار پردہ از رخ کہ باغ ارم این است

''تنگ دہانی کو کشادہ کرو کہ یہ راہ عدم معلوم ہوتا ہے، اپنے رخ سے پردہ ہٹاؤ کہ تمھارا چہرہ جنت کا باغ ہے۔''

دیوانگی و بیخودی و بادیہ گردی　　　در رہگذر عشق نخستین قدم این است

''دیوانگی، بے خودی اور بادیہ پیمائی، عشق کے رہگذر میں یہ پہلا قدم ہے۔''

جز سکہ داغ تو اگر نقد روان نیست　　　در کشور عشاق رواج درم این است

''اگر تیرے کھوٹے سکہ کے علاوہ کوئی اور سکہ نہیں چلتا ہے، تو کیا عاشقوں کے ملک میں یہی درہم رائج ہے۔''

عمریست کہ آوارگی قافلہ عشق　　　مارا زدیاری بہ دیار دیگر انداخت

''قافلہ عشق کی آوارگی نے ایک مدت تک، مجھے ایک دیار سے دوسرے دیار تک بھٹکایا ہے۔''

کس کس طرح سے معشوق اپنی اداؤں اور ناز و انداز سے عاشق کو پریشان کرتا ہے یہاں تک کہ اپنی اداؤں سے شب وصل کو بھی قیامت بنا دیتا ہے۔

پریشان کردہ کاکل بہ رخ انداختی رفتی　　　شب وصل مرا صبح قیامت ساختی رفتی

''چہرے پر زلفیں بکھیرے ہوئے جا رہے ہو، وصل مراد کی رات کو قیامت کی صبح بنا کر جا رہے ہو۔''

متاع نقد دل را ساختم بازیچہ طفلان　　　زمن ای جان جان نرد محبت باختی رفتی

''دل کے متاع نقد کو میں نے بچوں کا کھیل بنا دیا، اے جانِ جان تم مجھ سے محبت کی بازی ہار کر جا رہے ہو۔''

کاہش صاحب کی شاعری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری اعلی معیار کی ہے۔ اس آخری دور میں جب اردو نے فارسی کی جگہ لے لی تھی اور فارسی جاننے والوں کی تعداد میں کافی کمی آ گئی تھی فارسی میں اس طرح کی معیاری شاعری فارسی زبان کا اصحاب علم و دانش کے دلوں اور ذہنوں میں رچے بسے ہونے کا ثبوت ہے۔

کاہش صاحب گیا میں ہی رہے ان کے کام کا میدان گیا تھا اسی لیے ان کے آثار بھی گیا میں محفوظ ہیں، گرچہ وہ جونپور واپس چلے گئے لیکن وہاں کے لوگ ان کے کارنامے سے واقف نہ ہو سکے اور نہ وہاں کے لوگوں کو ان کے آثار سے واقفیت ہوئی اسی لیے ہمیں وہاں کے مصنفین کے مضامین میں ان کے آثار کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی ہے۔ ڈاکٹر فیاض احمد علیگ کے مضمون سے جو انھوں نے مضامین ڈاٹ کام میں 'جونپور کے چند طبیب شعرا' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں کہ ''ان کی مذکورہ تصانیف نایاب ہو چکی ہیں اور اب کوئی بھی دستیاب نہیں ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے ان کا دیوان فارسی جو ضخیم ہے وہ گیا میں محفوظ ہے گرچہ کچھ جگہوں پر کرم خوردہ ہے اور کاغذ بھی بوسیدہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ فیاض صاحب نے ان کے فارسی دیوان کو بھی مطبوعہ شمار کیا ہے جب کہ ایسا نہیں ہے فارسی دیوان مخطوطہ ہے۔

اسی طرح اقبال جونپوری صاحب کی کتاب میں بھی ان کے احوال ملتے ہیں لیکن آثار کے متعلق تفصیل نہیں ملتے۔ ان حضرات نے چند اردو ابیات نقل کیے ہیں۔

سبھی تذکرہ نگاروں نے ان کی فارسی اور اردو کی تصانیف میں رسالہ فارسی، رسالہ مکتوبات، منتخب العروض، ایک دیوان فارسی اور دو دیوان اردو کا ذکر کیا ہے۔

کاہش صاحب کا انتقال 1864 میں جونپور میں ہوا۔ کاہش صاحب نے اٹھارہ سو ستاون کے بعد گیا چھوڑا ہے گویا آپ کے جونپور جانے کے چند ہی سالوں بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔

کاہش صاحب کی دو غزلیں اور ایک قطعہ پیش خدمت ہے۔

ز لعل شکرین آموختم شیرین مقالی را　　　بفکر آن گہ دریافتم نازک خیالی را

''اس شیریں محبوب سے میں نے شیریں مقالی سیکھی، اس کے خیال میں محویت نے میرے اشعار میں نازک خیالی پیدا کی۔''

سحر گہ در قفس بلبل صفیر خونچکان میزد　　　بیان می کرد شاید قصہ فرسودہ حالی را

''وقت سحر قفس میں جب بلبل غم انگیز فریاد کرتی ہے تو (ایسا محسوس ہوتا ہے) شاید وہ اپنی بدحالی کی داستان سنا رہی ہے۔''

بحال دیدہ خونبار مارا گریہ می آید　　　کہ در ہر فصل پیدا کرد ابر برشگالی را

''خون رونے والی آنکھوں کی حالت پر میری اشک فشانی نے ہر موسم کو، موسم

برسات بنادیا ہے۔"

بخاطر می نشاند مطلع خورشید را گردون　　　شناسد فکر عالی پایہ مضمون عالی را

"جیسے فلک، خورشید کے طلوع کی جگہ کو دل میں بٹھاتا ہے، اسی طرح فکر عالی کے حامل بھی عالی مضامین کے مرتبہ کو پہچان لیتے ہیں۔"

شراب خون دل بیرون چکید از دیدہ گریان　　　نگہدارم چرا زیر بغل مینای خالی را

"جب خون دل شراب کی شکل میں اشک کے ذریعے آنکھوں سے بہہ گیا، پھر کیوں خالی مینا (دل) کو بغل میں لیے پھر رہا ہوں۔"

شنیدم از لب گور تو نگر این صدا کاہش　　　کہ بنشین بر بساط خاک وبرچین فرش قالی را

"کاہش میں نے ایک مالدار کی قبر سے یہ آواز سنی (وہ کہہ رہا تھا)، کہ خاک پر بیٹھو اور قالین کا فرش لپیٹ دو۔"

یہ ایک طویل غزل ہے اس میں انھوں نے مختلف مضامین کا احاطہ کیا ہے، عرفانی مضامین بھی ہیں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر بھی ہے، عشق اور غم عشق جیسے مضامین بھی ہیں، جیسے۔

بہ خلوت گاہ دل جای مدہ شکل خیالی را　　　تجلی گاہ شمع طور کن این بزم خالی را

ان ابیات میں انھوں نے کتنے اچھوتے انداز میں دنیا کی بے ثباتی و ناپائداری کا نقشہ کھینچا ہے۔

نمی آید بہ کار اہل دولت کیسہ پرزر　　　بزیر خاک برد آخر سکندر دست خالی را

شنیدم از لب گور تو نگر این صدا کاہش　　　کہ بنشین بر بساط خاک وبرچین فرش قالی را

اس کے علاوہ بھی ان کے اشعار میں بہت سے دقیق خیالات اور نادر افکار ملتے ہیں۔

بلبل کی صدا جو قید میں زندگی گزار رہی ہے۔ شاعر اس کی سریلی آواز سے صرف لطف اندوز نہیں ہو رہا ہے بلکہ اس صدا میں جو درد، جو نالہ وفریاد پوشیدہ ہے اسے بھی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح جب شاعر حال دل کو کاغذ پر لکھتا ہے تو خامہ فرسائی کی جو آواز آتی ہے اسے بھی وہ فقط ایک مہمل صدا نہیں سمجھتا ہے بلکہ اسے وہ زنجیر کی صدا معلوم ہوتی ہے جو شوریدہ حالی کو بیان کر رہی ہے۔ یعنی لکھ کر اپنی حالت بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن قلم اسے تحریر کے ساتھ ساتھ آواز بھی دے رہا ہے۔

سحر گہ در قفس بلبل صفیر خونچکان میزد　　　بیان می کرد شاید قصہ فرسودہ حالی را

زنال خامہ ہردم نالہ زنجیر برخیزد　　　بکاغذ گر نویسم قصہ شوریدہ حالی را

بحال دیدہ خونبار مارا گریہ می آید　　　کہ در ہر فصل پیدا کرد ابر برشگالی را

اس بیت میں کس قدر دقیق خیال کو بیان کر رہے ہیں کہ آسمان پر جو بادل نظر آ رہے ہیں یہ میرے آنسوؤں کی وجہ سے ہے اور بارش کا سبب بھی میرا رونا ہی ہے۔

خود کو پند و نصیحت دے رہے ہیں کہ نالہ وفریاد کا طریقہ ان دلوں سے سیکھو جو کہ عشق میں بیمار ہیں۔

بیاموز از دل بیمار عاشق طرز نالیدن　　　رہا کن ای درای کاروان بیہودہ نالی را

ایک اور غزل ملاحظہ کیجیے اور معنی کی بلندی اور خیال پردازی دیکھیے۔

امید بوی تو از بہار بود مرا　　　وگرنہ با گل وگلشن چہ کار بود مرا

"باد بہاری سے مجھے تیری خوشبو کی امید تھی، ورنہ مجھے گل وگلشن سے کیا کام"

شبی کہ زلف ورخت را بخواب می دیدم　　　خیال گردش لیل ونہار بود مرا

"رات جب میں نے خواب میں تیرے زلف اور چہرے کا دیدار کیا، تو مجھے شب وروز کی گردش کا خیال آنے لگا۔"

نوازشی عجبی داشت برمن بیمار　　　اجل بہ شام غمت غمگسار بود مرا

"مجھ بیمار پر اس کی عجیب نوازش تھی، تیرے غم کی شام میں موت میری غمگسار بن کر آئی۔"

جز اینکہ حسرت وغم بردم گرجہان کاہش　　　باین دیار ندانم چہ کار بود مرا

"کاہش، اگر اس جہاں میں سوائے حسرت وغم کے کچھ حاصل نہیں ہوا، تو اس دیار میں میرا کیا کام تھا، آج تک نہ جان سکا۔"

کاہش صاحب نے صرف غزل میں ہی نہیں بلکہ قطعات، رباعیات، ترجیع بند اور ترکیب بند میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

ایک قطعہ بطور مثال ملاحظہ کیجیے۔

برسر قیس حزین صاحب محمل می گفت　　　دارم ارمان ہمان آنچہ تو حسرت داری

"غمزدہ قیس کے سرہانے محمل نشیں کہہ رہی تھی، میری بھی وہی آرزو ہے جو تیری حسرت ہے۔"

نگہی کن بہ من خستہ دلم بیتاب است　　　جای لیلی بہ فدای تو چہ حالت داری

"مجھ خستہ دل پر ایک نگاہ تو ڈال لو میرا دل بیتاب ہے، میں لیلیٰ کے بجائے تجھ پر فدا ہوں، تمہاری کیا حالت ہے۔"

شمع سان بہر تو سوزد دل کاہش ہر شب　　　بزم اغیار شود قابل صحبت داری

"کاہش کا دل ہر شب شمع کی طرح تیرے لیے تڑپتا ہے، (لیکن تم تو) غیروں کی محفل کو اپنی صحبت سے رونق بخشتے ہو۔"

ماخذ

- سید اقبال اقبال: تاریخ سلاطین شرقی اور صوفیائے جونپور، جلد 1، ادارہ شیراز پبلشنگ ہاؤس، جونپور، یوپی 1988
- سید اقبال احمد، تاریخ شیراز ہند جونپور، ادارہ شیراز پبلشنگ ہاؤس، جونپور، یوپی 1963
- سید اولاد علی کاہش، دیوان کاہش، مخطوطہ، خانقاہ منعمیہ ابوالعلائیہ، گیا، بہار
- سید عطا حسین فانی، کیفیت العارفین ونسبت العاشقین، مطبع منعمیہ ابوالعلائیہ، گیا، بہار
- سید حسین الدین احمد، ضمیمہ کیفیت العارفین ونسبت العاشقین، مطبع منعمیہ ابوالعلائیہ، گیا، بہار
- سید احمد اللہ ندوی، تذکرہ مسلم شعرائے بہار، جلد چہارم، انٹرنیشنل پریس، کراچی، پاکستان، 1969
- سید اقبال احمد، تاریخ شیراز ہند جونپور کا مختصر تعارف، ادارہ شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس، جونپور، یوپی 1963
- ریاض الدین، ریاض گیاوی، تذکرہ سخنوران وطن، تذکرہ شعرائے گیا، ریاض پبلشنگ ہاؤس، چوک روڈ گیا، بہار 1984
- غلام ہمدانی مصحفی، تذکرہ ہندی، جامع برقی پریس، دہلی، 1933
- مشاہیر بہار، جلد دوم، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 2001
- قاضی عبدالودود: فارسی شعر وادب چند مطالعہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 1995
- عبدالغفور نساخ، سخن شعرا، اتر پردیش، اردو اکادمی، لکھنؤ، 1982
- سید عزیز الدین بلخی احمد متخلص بہ راز، تاریخ شعرائے بہار، جلد اول، قومی پریس لمیٹڈ، بانکی پور، پٹنہ، 1931

Dr. Md Sadique Akhtar
Guest Faculty in Persian
School of Arab and Asian Studies
Department of Asian Languages
English and Foreign Languages University
Hyderabad- (Telangana)
Mob.: 9818148553
sadique111@gmail.com

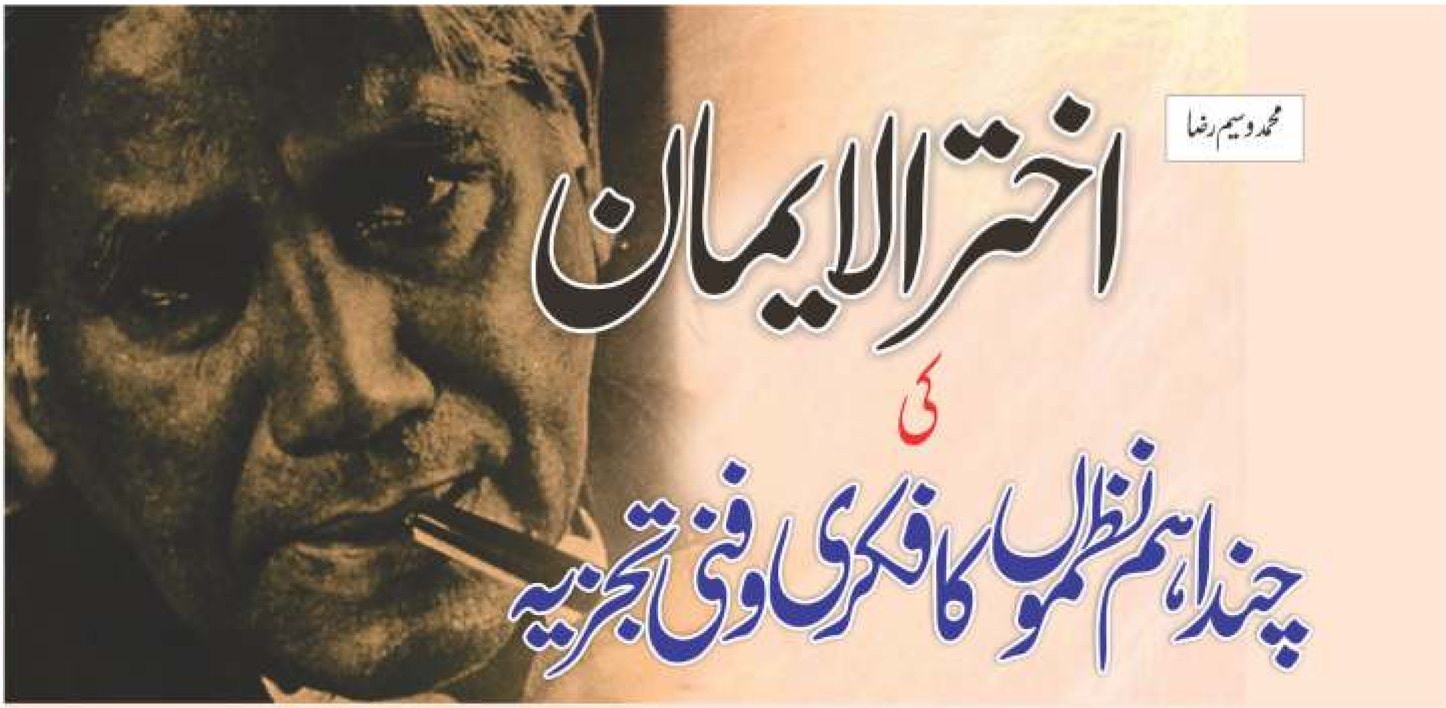

محمد وسیم رضا

اختر الایمان
کی
چند اہم نظموں کا فکری و فنی تجزیہ

بیسویں صدی میں اردو نظم نگاری کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو چند اہم اور نمایاں نظم نگاروں میں ایک بڑا نام اختر الایمان کا ہے۔ جدید شعرا میں ان کی حیثیت بلند قامت بھی ہے اور خود آگہی کی معراج بھی۔ ان کی شاعری ان کے اپنے جذبات و احساسات کا مینی فیسٹو ہے جس کے سہارے وہ اپنی شاعری کی تزئین کاری کرتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ وہ اپنی تخلیقات اور ذات کے اظہار کے حوالے سے معاصر زندگی کے آشوب کو اپنے وجود میں جذب کرنے کا ہنر جانتے ہیں جس کا اظہار انھوں نے اپنے شعری مجموعہ 'بنت لمحات' میں اس طرح کیا ہے:

''اگر چہ میری شاعری میری ذات کا اظہار ہے۔ پھر بھی اسے کہنے کے لیے اس کے پس منظر محرکات اور ان وجوہ کا جاننا ضروری ہے جن کا یہ شاعری ردِ عمل ہے۔ اس کی اخلاقی وجہ یہ ہے کہ اس جدید علم اور صنعتی انقلاب نے ہماری پرانی قدریں ہم سے چھین لی ہیں۔''[1]

اختر الایمان بنیادی طور پر احساسات اور کیفیات کے شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں دردمندی، کسک، اضمحلال اور کرب کی ترجمان ہیں۔ نئے زمانے کے مسائل کی گہرائی کے سلسلے میں جس فکرمندی کے ساتھ وجوہات کی تہہ تک جاتے ہیں، وہ ان کی عبقریت پر دال ہے۔ نئے زمانے کے آدمی کا کرب اُن کی شاعری کی شناخت ہے۔ بقول فراق گورکھپوری:

''نئے شاعروں میں سب سے گھائل آواز اختر الایمان کی ہے۔ اس میں جو چلبلا پن، تلخی اور تیز دھار ہے وہ خود بتادے گی کہ آج کے حساس نوجوانوں کا المیہ کیا ہے۔''[2]

قبل اس کے کہ اختر الایمان کی نظم نگاری کے فکری وفنی اختصاص پر گفتگو کی جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے شعری مجموعے سے بھی متعارف ہوا جائے۔ یوں اختر الایمان نے اپنی شاعری کا آغاز کالج کے زمانے سے ہی کر دیا تھا اور ان کی نظمیں رسالوں میں شائع ہوتی رہیں، لیکن ان کا پہلا شعری مجموعہ 1943 میں 'گرداب' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کی اشاعت کے چند ہی وقفے بعد 'تاریک سیارہ' 1966 میں یکے بعد دیگرے 'سب رنگ' اور 'یادیں' شائع ہوئے۔ 1969 میں 'بنت لمحات' اور 1977 میں 'آبجو' کی اشاعت ہوئی۔ ان تمام شعری مجموعوں کی کلیات 1984 میں 'سروساماں' کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد بھی ان کے دو شعری مجموعے 'زمیں زمیں' 1990 میں اور ان کے انتقال کے بعد ایک شعری مجموعہ 'زمستان سرد مہری کا' شائع ہوا۔

اختر الایمان کی نظموں کے موضوعات بوقلمونی اور رنگارنگی کے مظہر ہیں اور فلسفیانہ طبیعت کا اشاریہ بھی۔ ان کی نظمیہ شاعری کی سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ذاتی محرومیوں اور مایوسیوں کی نوحہ خوانی نہیں کی بلکہ تمام کائنات کے غم کو بھی اپنی ذات میں جذب کرلیا ہے اور یہی غم ان کی زندگی کے ادراک اور گہری بصیرتوں کے انکشاف کا وسیلہ بن گیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم 'نقشِ پا' کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس نظم میں سنجیدگی بھی ہے اور فلسفیانہ خیالات کی ترجمانی بھی۔ دیکھیے یہ اشعار

یہ نیم خواب گھاس پر اُداس اُداس نقشِ پا
کچل رہا ہے شبنمی لباس کی حیات کو
وہ موتیوں کی بارشیں فضا میں جذب ہوگئیں
جو خاک دانِ تیرہ پر برس رہی تھیں رات کو
یہ رہروانِ زندگی خبر نہیں کہاں گئے
وہ کون سا جہان ہے، ازل نہیں ابد نہیں
دراز سے دراز تر ہیں حلقہ ہائے روز و شب
یہ کس مقام پر ہوں میں کہ بندشوں کی حد نہیں

....

کوئی نیا افق نہیں جہاں نظر نہ آسکیں
یہ زرد زرد صورتیں یہ ہڈیوں کے جوڑ سے
ہوا کے بازوؤں میں کاش اتنی تاب آسکے
دکھا سکیں وہ عہدِ نو ہی زندگی کے موڑ سے؟

پوری نظم شاعر کے رجائی طبیعت کا ترجمان ہے جو نیک اعمال اور نئے ماحول کا اشاریہ بن جاتی ہے۔ بقول میراجی:

''اختر کی پہلی نظم جو میں نے دیکھی وہ 'نقشِ پا' تھی۔ اس سے شاعر کا تصور کچھ اس طرح بندھا تھا جیسے کوئی شخص کھڑے کھڑے زمین پر دیکھ رہا ہو یا اگر چل رہا ہو تو آنکھیں جھکائے آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہو۔''

پانچ بندوں پر مشتمل اس نظم میں لہجے کی انفرادیت اور لفظیاتی نظام دونوں کو ہنرمندانہ طریقے سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ افسردگی کا بیان ہے لیکن نظم کے آخری شعر میں ایک پیغام ہے۔ رجائیت و امید کی لہریں ٹھاٹھیں مار رہی ہیں 'دکھا سکیں وہ عہدِ نو ہی زندگی کی موڑ سے؟

اختر الایمان کی ایک مشہور نظم 'بنت لمحات' ہے

جس کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

''یہ کھردری تشبیہات سے پُر، انتشار آمیز شاعری، اس خلوص اور جذبۂ محبت کے تحت وجود میں آئی ہے جو مجھے انسان سے ہے۔''3

اس نظم میں عشق کے تجربے کو نہایت ہی لطیف، دل نواز اور نرم گداز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ عاشق اور معشوق دونوں اپنی اپنی فعالیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ عاشق اپنی دروں بینی کے توسط سے خودشناسی کی منزل کی طرف گامزن ہے، تو دوسری طرف محبوبہ بھی کسی گاؤں کی الھڑ دوشیزہ نہیں بلکہ شہر کی ایک پڑھی لکھی مہذب خاتون ہے جو محبت کے جذبے کی لطافتوں سے ناآشنا نہیں۔ ساتھ ہی احساسِ ذات کی لذت اور اس کی مسیحائی کا احساس بھی اس کے یہاں بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ اسی طرح اختر الایمان کی دوسری نظموں میں 'پرانی فصیل' ایک علامتی نظم ہے۔ یہ نظم قدیم وجدید تہذیب کی علامت بن کر ہماری معاشرتی زندگی کی افسوس ناک صورتِ حال سے فنکار کی بیزاری کا اشاریہ بن جاتی ہے جو دو بدلتے ہوئے معاشروں اور تہذیبی تصادم سے پیدا ہوتی ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے علامیہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''اختر الایمان یوں تو علامیہ کی شاعری کو مشکل، بہت مشکل بتاتے ہیں اور ہے بھی بہت مشکل کام۔ کہتے ہیں، علامیہ کی شاعری پڑھتے وقت بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ ان لوگوں کے مزاج کو راس نہیں آتی جن کے لیے شاعری کوئی سنجیدہ چیز نہیں اور جو اسے رواروی میں پڑھنا چاہتے ہیں۔''4

اختر الایمان نے 'پرانی فصیل' کے توسط سے زندگی کے تاریک گوشوں کی نقاب کشائی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ نظم کے ابتدائی حصے سے ہی علامت اپنا کام بحسن وخوبی انجام دے رہی ہے۔ پڑھنے والا بھی مرکزی علامت کے توسط سے شاعر کے تجربوں میں شامل ہوجاتا ہے۔ اپنی باتوں کو تقویت بخشنے کے لیے نظم 'پرانی فصیل' کے دو بند نقل کرتا ہوں ۔

مری تنہائیاں مانوس ہیں تاریک راتوں سے
مرے رخنوں میں ہے اُلجھا ہوا اوقات کا دامن
مرے سائے میں حال و ماضی رُک کر سانس لیتے ہیں
زمانہ جب گزرتا ہے بدل لیتا ہے پیراہن

....

اختر الایمان یوں تو علامیہ کی شاعری کو مشکل، بہت مشکل بتاتے ہیں اور ہے بھی بہت مشکل کام۔ کہتے ہیں، علامیہ کی شاعری پڑھتے وقت بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ ان لوگوں کے مزاج کو راس نہیں آتی جن کے لیے شاعری کوئی سنجیدہ چیز نہیں اور جو اسے رواروی میں پڑھنا چاہتے ہیں۔

یہاں سرگوشیاں کرتی ہیں ویرانی سے ویرانی
فسردہ شمع امید و تمنا تو نہیں دیتی
یہاں کی تیرہ بختی پر کوئی رونے نہیں آتا
یہاں جو چیز ہے ساکت کوئی کروٹ نہیں لیتی

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ اختر الایمان کی نظموں کا موضوع احساس ہے۔ وہ ہر بات کو احساس کے توسط سے بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے ہاں احساس کے بیان میں کسی قسم کی قنوطیت، ناامیدی، مایوسی، رنج وغم کا شائبہ تک نہیں۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جسے فرانسیسی زبان میں Spleer سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ نظم اس بحرانی دور کا مکمل اشاریہ ہے جب پرانی تہذیب اپنی معنویت کھو چکی تھی۔ قدروں کا انہدام ہو رہا تھا۔ نئی تہذیب نے انسان کو جس بحران اور انتشار میں مبتلا کر دیا تھا اور اس کے نتیجے میں جو ہولناک مناظر سامنے تھے، اسی کا کرب آگیں بیان ہے۔ نظم کا اختتام اس بند پر ہوتا ہے ۔

غرض ایک دور آتا ہے کبھی، اک دور جاتا ہے
مگر میں دو اندھیروں میں ابھی تک ایستادہ ہوں
مرے تاریک پہلو میں بہت افعی خراماں ہیں
نہ توشہ ہوں نہ راہی ہوں نہ منزل ہوں نہ جادہ ہوں

اختر الایمان کی ایسی نظموں میں تنہائی، محرومی، . . ، نئی صبح وغیرہ میں اسی قسم کے احساسات وکیفیات نمایاں ہیں۔ یہ سلسلہ پہلے مجموعہ 'گرداب' سے شروع ہوکر 'تاریک سیارہ' تک پہنچتا ہے۔ لب ولہجے میں تلخی ہے لیکن یہ تلخی حقائق اور زندگی کی سچائیوں کا منظر نامہ پیش کرتی ہے جس میں معاشرے کی بربادی، سوز دروں کی دھیمی دھیمی آنچ میں سلگ رہی ہے۔ اسی قبیلے کی نظموں میں 'لغزش' بھی ہے جس میں شاعر تلخی سے فرار کا راستہ اختیار کرنے پر آمادہ ہے لیکن انجام اطمینان بخش نظر نہیں آتا۔

اختر الایمان کی ابتدائی دور کی نظموں میں 'پگڈنڈی' ایک کامیاب ترین علامتی نظم ہے۔ شعری اسلوب اور علامتی طریقۂ کار کے اعتبار سے یہ نظم اقبال کی نظم 'ہمالہ'، 'فلسفۂ غم' اور 'ساقی نامہ' کی یاد دلاتی ہے۔ اقبال کی نظم 'ساقی نامہ' کے ابتدائی اشعار کو سامنے رکھ کر اختر الایمان کی نظم 'پگڈنڈی' کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

انگڑائی لیتی، بل کھاتی، ویرانوں سے آبادی سے
ٹکراتی، کتراتی، مڑتی، خشکی پر گرداب بناتی
اٹھلاتی، شرماتی، ڈرتی، مستقبل کے خواب دکھاتی
سایوں میں ستاتی، مڑتی بڑھ جاتی ہے آزادی سے

یہ اشعار اختر الایمان کی شاعری میں پیکر تراشی کی عمدہ

مثال ہے۔ بصری اور حرکی پیکروں کی آمیزش نے ایک ولولہ انگیز ڈرامائی کیفیت پیدا کر دیا ہے۔ ان کی فنکارانہ ہنرمندی یہ ہے کہ علامتوں کی مجرد صورت کو رومانی اور حقیقی وجود عطا کر دیا ہے۔

اختر الایمان کی ایک مشہور نظم 'ایک لڑکا' خمیرِ انسانیت کے علامیہ کے روپ میں تو ہے لیکن تخلیقی قوت کا اشاریہ بھی ہے۔ اس نظم میں ضمیر انسانیت کا پہلو ایک تیکھے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم کی پوری ساخت طنزیہ اسلوب اور علامتی طرزِ اظہار کی تہہ داری سے مزین ہے۔ اس نظم کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

دیارِ شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں کبھی کھیتوں کی مینڈوں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کم سنوں کی رنگ رلیوں میں

—

خدائے عز و جل کی نعمتوں کا معترف ہوں میں
مجھے اقرار ہے اس نے زمیں کو ایسا پھیلایا
کہ جیسے بستر کمخواب ہو، دیبا و مخمل ہو
مجھے اقرار ہے یہ خیمہ افلاک کا سایہ
اسی کی بخششیں ہیں، اس نے سورج، چاند تاروں کو
فضاؤں میں سنوارا، اک حد فاصل مقرر کی

—

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج، اندوہ پرور، اضطراب آسا

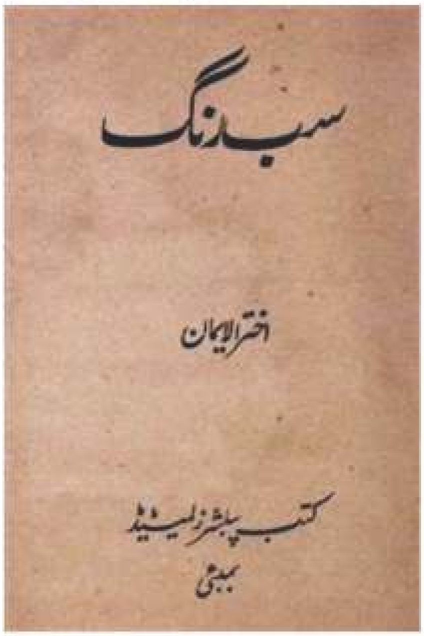

جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مرچکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں

اس نظم میں دیہاتی ماحول میں ایک کمسن لڑکے کے خد و خال کو بہت ہی ہنرمندی سے بیان کیا گیا ہے۔ بقول پروفیسر زاہدہ زیدی:

''...........جو باتیں ذہن پر خاص طور سے اپنا نقش چھوڑتی ہیں، وہ اس بچے کی فطرت سے ہم آہنگی، جوش، ولولہ، بے ساختگی، تجسس، تحیر، تخیل کی فراوانی، ہوا میں تیرنا، خوابوں میں بادل کی طرح اُڑنا، رسم و رواج اور مصلحت اندیشی سے مکمل بے نیازی، آزادی کا احساس اور ایک رواں دواں کیفیت ہے اور یہ سب (عین مین) تخلیقی قوت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اس لیے لڑکے کا یہ متحرک وجود انسانیت سے زیادہ تخلیقی قوت کی بالیدگی کا نقش ذہن پر مرتب کرتا ہے۔''5

اختر الایمان کی نظمیہ شاعری کے تجزیے سے اس نکتے کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ ان کی شاعری میں انسانی معاشرے کی عصری صورتِ حال کی کسک اور سفاک حقیقت کو بہت ہی فنکارانہ طور پر اجاگر کیا گیا ہے جس میں دردمندی کی جھلک بھی ہے اور طنز بے نشتر بھی۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ اختر الایمان نے جدید اردو نظم؛ گہرے وجودی تجربے، فلسفیانہ تفکر، پیچیدہ بصیرت، زندگی کے فہم و ادراک سے آشنا کیا۔ انھوں نے شعری تجربے اور اپنی بصیرتوں کے اظہار پر کسی طرح کی لسانی، نظریاتی یا فکری پابندی عائد نہیں کی۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے ذہن و دماغ کو مذہب سے، تاریخ سے، سیاسی نظریوں اور مفروضوں سے، منافقت و مصالحت سے، استحصالی رویوں اور غلامانہ رواجوں سے پاک رکھا اور یہی ساری صفات و کمالات ان کے ادبی و شعری سفر کا اثاثہ ہیں۔

جہاں تک زبان و بیان کا معاملہ ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اختر الایمان کے یہاں علامتوں کا ایک فنکارانہ استعمال ہے تو دوسری طرف طنزیہ طریقِ کاران کے اسلوب کی بنیادی شناخت ہے۔ ان کے اسلوب میں لچک بھی ہے جس کے نتیجے میں ہر رنگ کے اسلوب کو ڈھال لینے کا ہنر جانتے ہیں۔ بقول پروفیسر شمیم حنفی:

''اختر الایمان کا ایک امتیاز اپنے ہم عصروں میں یہ بھی ہے کہ انھوں نے شعری تجربے کے ادراک

جہاں تک زبان و بیان کا معاملہ ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اختر الایمان کے یہاں علامتوں کا ایک فنکارانہ استعمال ہے تو دوسری طرف طنزیہ طریقِ کاران کے اسلوب کی بنیادی شناخت ہے۔ ان کے اسلوب میں لچک بھی ہے۔ جس کے نتیجے میں ہر رنگ کے اسلوب کو ڈھال لینے کا ہنر جانتے ہیں۔

اور بصیرت کے اظہار پر کسی طرح کی لسانی، نظریاتی اور فکری روک نہیں لگائی۔ یہ کسی معینہ دائرے میں گردش کرتی ہوئی شاعری کے برعکس چھوٹے بڑے مختلف دائروں سے رہائی کی شاعری ہے۔''6

حوالہ جات

1 مقدمہ 'بنت لمحات'، ص 6
2 فراق گورکھپوری، مجموعہ 'گرداب' کا مقدمہ
3 پیش لفظ 'بنت لمحات'
4 'اختر الایمان: جمالیاتی لجنڈ' از شکیل الرحمن، ص 115
5 بحوالہ مضمون 'اختر الایمان کی شاعری کا فکری و فنی ارتقا: دس نمائندہ نظموں کے تناظر میں'، مشمولہ: 'رموزِ فکر و فن' زاہدہ زیدی، ص 173
6 مضمون 'اختر الایمان کی شاعری'، مشمولہ: 'خیال کی مسافت' از شمیم حنفی، ص 235

Dr. Md. Wasim Reza
Head, Deptt. of Urdu,
Rameshwar College,
B.R.A. Bihar University,
Muzaffarpur-842001
Mob.: 9955545128,
Email: drwasimreza@gmail.com

محمد آصف

آسمان علم وادب کا درخشندہ ستارہ

لچھمی نرائن شفیق

علم وادب کے درخشندہ ستارے لچھمی نرائن شفیق کی پیدائش 1158ھ میں مہاراشٹر کے شہر اورنگ آباد میں ہوئی۔ شفیق نے سوانح نگاری، شاعری، تذکرہ نویسی اور تاریخ نگاری میں کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ موصوف کے حالات زندگی سے متعلق ہماری معلومات ناقص ہیں۔ ان کے معاصر تذکرہ نگاروں نے بھی قدرے مختصر الفاظ میں تعارف پیش کیا ہے۔ ان کی مختلف تصانیف کے دیباچوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے ایک تعلیم یافتہ اور ادب پرور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد کا نام منسارام تھا جو دکن کے صدر الصدور کے پیش کار تھے۔ وہ پنجاب کے کھتری سماج سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا خاندان ملازمت پیشہ تھا۔[1] ان کے جد اعلیٰ بھوانی داس نے عالمگیری عہد میں لشکر کے ساتھ لاہور سے دکن کی جانب ہجرت کی اور شہر اورنگ آباد میں سکونت اختیار کی۔ یہیں شفیق کے والد منسارام کی پیدائش ہوئی۔ ان کا خاندان مختلف ادوار میں مسلم حکمرانوں کے درباروں سے وابستہ رہا۔ ان کے والد منسارام خود صاحب تصنیف تھے چنانچہ اپنی تصنیف 'مآثر نظامی' کی ابتدا میں خود اپنے خاندان سے متعلق رقمطراز ہے:

''بندۂ عقیدت منسارام آصف جاہی ابن بھوانی داس غازی الدین خانی نبیرۂ بال کش عابد خانی نے تخمیناً مدت 50 سال اس سرکار دولت مدار میں اپنی زندگی بسر کردی۔ صدارت کل کی خدمات انجام دی اور مورد عاطفت وشفقت رہا۔''[2]

رائے منسارام نے 1200ھ میں ایک کتاب 'مآثر نظامی' کے نام سے لکھی جو نواب آصف جاہی عہد کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ ایک اور اہم تصنیف 'قانون دربار آصفی' کے نام سے قلمبند کی جس میں حکومت حیدر آباد کی جہاں بانی کے اصول ہیں۔ یہ کتاب بقول مصنف دو سال میں مکمل ہوئی۔

شفیق انہی کے بیٹے تھے۔ شفیق کی ابتدائی تعلیم و تربیت میر عبدالقادر مہربان نے کی اور جب سن شعور کی منزل میں قدم رکھا آزاد بلگرامی جیسے استاد میسر آئے۔ آزاد نے انھیں تراش کر کندن بنا دیا۔ وہ شفیق سے انتہائی انس ومحبت سے پیش آتے تھے۔

شفیق بلا کے ذہین وفطین تھے۔ محض 17 برس کی عمر میں مختلف علوم وفنون میں مہارت تامہ حاصل کر لی۔ عربی، فارسی، صرف نحو اور انشا میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ کم عمری ہی میں کئی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ انھیں شعروسخن اور تاریخ نگاری میں ملکہ حاصل تھا۔ شاعری میں میر عبدلقادر مہربان کے مشورے پر صائب تخلص کیا۔ آزاد نے مشورہ دیا کہ فارسی میں شفیق اور اردو میں صائب تخلص اختیار کریں۔ شفیق آزاد بلگرامی کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان کی کتابوں میں جہاں کہیں آزاد کا ذکر آتا ہے وہ نہایت ادب سے ان کا نام لیتے ہیں۔ شفیق ایک طومار نویس تھے۔ انھوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کتابیں لکھیں۔

شفیق کی تاریخ نگاری: شفیق اپنے عہد کے اہم مورخ تھے۔ تاریخ نگاری کا فن انھیں ورثہ میں ملا تھا۔ انھوں نے تاریخ پر مشتمل درج ذیل کتب یادگار چھوڑی ہیں۔

حقیقت ہائے ہندوستان: یہ کتاب شفیق نے برٹش ریزیڈنٹ ولیم پیٹرک کی فرمائش پر 1204ھ میں تحریر کی تھی۔ یہ کتاب چار مقالات پر مشتمل ہے۔ پہلے مقالہ میں مالگذاری کے نقشہ جات سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہے۔ دوسرے مقالے میں ہندوستان کے صوبوں کے مداخل سے بحث کی گئی ہے جس میں الہ آباد، اودھ، بہار، بنگال، اڑیسہ، مالوہ، گجرات، ملتان، لاہور اور کشمیر کے مفصل حالات درج کیے گئے ہیں۔ تیسرا مقالہ دکن کے حالات سے متعلق علم میں اضافہ کرتا ہے۔ چوتھے مقالے میں سلاطین ہند کی تاریخ رقم کی گئی ہے۔ اس مایہ ناز کتاب کا ایک نسخہ آصفیہ لائبریری، حیدر آباد میں موجود ہے۔

مآثر آصفی: 'مآثر آصفی' میں خاندان آصف جاہ نظام حیدر آباد دکن کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس میں خواجہ آصف کے حالات سے لے کر آصف جاہ ثانی تک کے معاملات کو نہایت حسن وخوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں مراٹھا کی بھی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ امرا اور راجاؤں کے حالات بھی درج ہیں۔ یہ کتاب 1208ھ میں لکھی گئی ہے۔

تمنیق شنگرف: 'تمنیق شنگرف' شفیق کی تاریخ نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ یہ کتاب 1200ھ میں لکھی گئی۔ اس میں ابتداً ہندوستان کے صوبوں کی تفصیلات اور اعداد وشمار بیان ہے بعدہ 'فتوحات دکن، سلطنت بہمنیہ، سلطنت عادل شاہی، نظام شاہی، عماد شاہی، قطب شاہی،

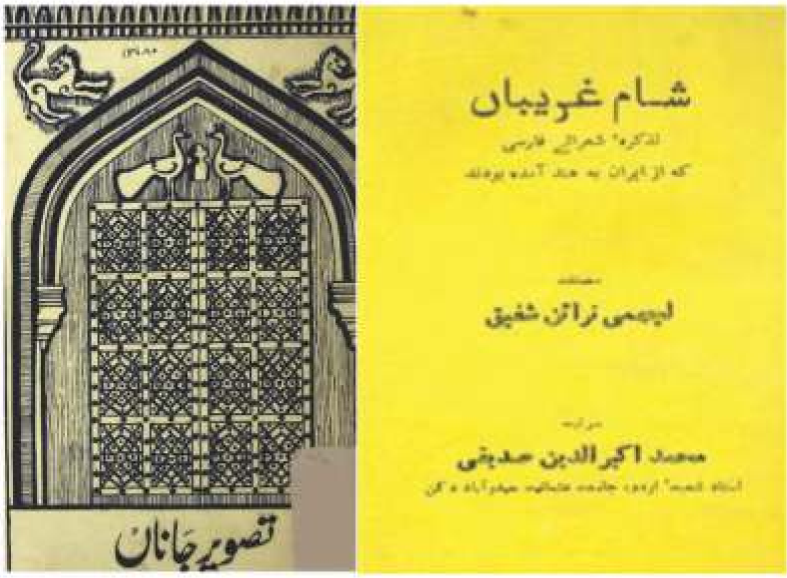

فاروقی اور بریدشاہی کے حالات تحریر کیے گئے ہیں۔ اس میں تیمور سلاطین کے حالات بھی درج کیے گئے ہیں۔ اسلوب تحریر عمدہ اور زبان نہایت سادہ و سلیس ہے لیکن بعض مقامات پر وہ حالات تحریر کرنے میں تاریخ فرشتہ سے خوشہ چینی کرتے ہیں۔

بساط الغنائم: بساط الغنائم میں مصنف نے مراٹھا کے عروج و زوال کی داستان تحریر کی ہے اور اس کا اختتام پانی پت کی جنگ پر کیا ہے۔[3]

حالات حیدرآباد: حالات حیدرآباد 1214ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ تاریخ نگار نے اس کتاب میں حیدرآباد میں موجود مختلف مساجد و مکاتیب، باغات، مکانات، اور دوسری سرکاری اور غیر سرکاری عمارتوں کا مفصل حال بیان کیا ہے۔

مذکورہ بالا کتب کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شفیق کی طبیعت تاریخ نویسی سے کس قدر مانوس تھی۔ وہ تاریخ نگاری کے لیے ضروری اوصاف سے متصف تھے۔ان کے ذہن و دماغ پر غلام علی آزاد کے مادۂ تاریخ تحقیق و تنقید کا گہرا اثر ہے۔ واضح رہے کہ آزاد مآثر الامرا کی ترتیب میں صمصام الدولہ شاہنواز خان کا دست راست رہے ہیں۔ایسے جید استاد کی قابلیت اور مجتہدانہ اہلیت سے شفیق کی طبیعت ضرور متاثر ہوئی ہوگی۔ اپنے تذکرے میں صوفی عبدالجبار ملکاپوری نے یوں تحریر کیا ہے:

'شام غریباں' ان شعرا کے متعلق ہے جو ایران سے مختلف سلاطین کے عہد میں ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے، اس اعتبار سے یہ تذکرہ اہم ہے۔ کیونکہ بسا اوقات جب ان شعرا کی فہرست بنانے کی ضرورت پڑے گی تو اس کام کے لیے شفیق کا تذکرہ بے کار اور بے سود نہیں بلکہ نایاب تصور کیا جائے گا۔

"وہ جو کچھ لکھتا ہے نہایت تحقیق سے لکھتا ہے۔ جس شخص یا جس چیز کی حالت لکھتا ہے اس کے مدعا علیہ کو پورا پورا صاف کر دیتا ہے۔ شفیق کو یہ لیاقت آزاد کی توجہ اور عنایت کی بدولت حاصل ہوئی۔ دکن میں اگرچہ آزاد کے تلامذہ صاحب تصنیف ہوئے لیکن شفیق ان کے ارشد تلامذہ میں تھے۔"[4]

شفیق کی تذکرہ نگاری

شفیق نے تذکرہ نگاری میں بھی نام پیدا کیا اور اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شعرا کے تذکرے رقم کیے ہیں:

گل رعنا: شفیق نے یہ تذکرہ 1187ھ میں مکمل کیا تھا جو ادب کی دنیا میں بے حد مشہور ہے۔ تذکرہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں مسلم شعرائے فارسی کا حال بیان کیا گیا ہے جبکہ حصہ دوم میں غیر مسلم شعرائے فارسی کا ذکر کیا گیا ہے۔ دیباچے میں تذکرہ نگار نے تذکرے کی تشکیل میں معاون دس مآخذ کا ذکر کیا ہے جن سے تذکرہ نویسی میں استفادہ کیا گیا ہے۔ تذکرہ 'گل رعنا' کا دوسرا حصہ بے حد اہم ہے۔ کیونکہ اس حصے میں تذکرہ نگار نے فارسی کے غیر مسلم شعرا کا حال مفصل بیان کیا ہے۔

شام غریباں: لکشمی نارائن شفیق اورنگ آبادی کا دوسرا اہم تذکرہ 'شام غریباں' ہے۔ جس میں ان شعرا حضرات کا ذکر کیا گیا ہے جو دیگر ممالک خصوصاً ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ اس میں تراجم بے حد مختصر ہیں اور اس کی جگہ لطائف و ظرائف کچھ زیادہ ہیں۔ شعرا کے حالات زندگی مفصل بیان کیے گئے ہیں۔ اشعار کا انتخاب بھی موزوں اور عمدہ ہے۔ بعض مقامات پر تذکرہ نگار نے مختلف شعرا کے مشکل اشعار کی تشریح بھی کی ہے جو بے حد مفید ہے۔ 'شام غریباں' ان شعرا کے متعلق ہے جو ایران سے مختلف سلاطین کے عہد میں ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے، اس اعتبار سے یہ تذکرہ اہم ہے۔ کیونکہ بسا اوقات جب ان شعرا کی فہرست بنانے کی ضرورت پڑے گی تو اس کام کے لیے شفیق کا تذکرہ بے کار اور بے سود نہیں بلکہ نایاب تصور کیا جائے گا۔

ان دونوں تذکروں میں 'گل رعنا' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اس میں ہندوستانی اور ایرانی شعرا سے متعلق بڑی جامع اور دلچسپ معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ 'گل رعنا' میں تراجم بھی ہیں جن کی وجہ سے اس کی افادیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ شفیق نے اس تذکرے میں اپنے استاد میر غلام علی آزاد بلگرامی کا حال مفصل تحریر کیا ہے جو کہیں اور اس تفصیل کے ساتھ دستیاب نہیں ہے۔ شفیق نے اپنے اس تذکرے میں شہنشاہ اکبر کے ذکر میں 46 صفحات صرف کیے ہیں۔ لیکن شفیق نے ان 46 صفحات میں اکبر کے متعلق کوئی نئی معلومات فراہم نہیں کی ہے۔ بلکہ اکبر سے متعلق زیادہ تر حالات تاریخ بدایونی سے ماخوذ ہیں۔ 'گل رعنا' ایک اعتبار سے بندرا بن داس خوشگو کے مشہور تذکرہ سفینہ سے اچھا ہے۔ اس لحاظ سے کہ شفیق نے شعرا کی ترتیب بلحاظ حروف تہجی رکھی ہے، جس سے شعرا کو ڈھونڈ نکالنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ 'گل رعنا' اور 'سفینۂ خوشگو' دونوں میں تذکرہ نگاروں نے واقعات کی تاریخیں درج کرنے میں بڑی کوتاہی سے کام لیا ہے۔ اگر واقعات کی تاریخ بھی دی گئی ہوتی تو یہ دونوں تذکرے اور بھی

شفیق نے علم وفن کی دنیا میں نام پیدا کیا۔اپنی علمی وادبی استعداد کے ذریعے اردووفارسی میں شعروفن کے جوہر دکھائے۔شفیق کے علمی وادبی کارناموں سے دنیائے علم وادب آج بھی فیضیاب ہورہی ہے۔

زیادہ مفید ہوتے۔مگر جہاں تک خوشگو کا سوال ہے وہ شفیق کے مقابلے زیادہ محتاط معلوم ہوتا ہے اور جا بجا واقعات کی تاریخیں بھی درج کرتا ہے۔

چمنستان شعرا: شفیق اورنگ آبادی کا تیسرا تذکرہ 'چمنستان شعرا' ہے۔یہ تذکرہ شفیق نے محض 17 برس کی عمر میں 1175ھ میں لکھا تھا۔یہ تذکرہ اردو شاعروں کے احوال پر مبنی ہے لیکن اسے فارسی زبان میں قلم بند کیا گیا ہے۔انجمن ترقی اردو نے حال ہی میں شفیق کے اس تذکرے کو شائع کیا ہے۔مقدمہ مولوی عبدالحق نے تحریر کیا ہے جس نے اس تذکرے کی افادیت میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔اس تذکرے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں شعرا کی ترتیب ابجد کے لحاظ سے رکھی گئی ہے۔اس میں تراجم مختصر ہیں۔تذکرے کی زبان بھی صاف اور رواں نہیں بلکہ منشیانہ ہے۔ اس تذکرے میں اشعار کا انتخاب اور تحقیق وتنقید اس بات کا اظہار ہے کہ یہ کسی سن رسیدہ تذکرہ نگار کا لکھا ہوا ہے حالانکہ اس وقت شفیق کی عمر 17 سال تھی۔اتنی کم عمر میں یہ تذکرہ تحریر کیا گیا جس کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ شفیق نے اپنے اس تذکرے میں میر تقی میر کی مخالفت کی ہے اور میر تقی میر کے 'نکات الشعرا' کے بعض بیانات کی تردید بھی کی ہے۔اس میں شمال اور دکن کے تقریباً 213 شعرا کا ذکر ہے۔[5]

شاعری

شفیق اورنگ آبادی نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتے تھے۔نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''کم عمری سے شعر گوئی کا شوق تھا۔مولانا غلام علی آزاد بلگرامی سے تلمذ کا شرف حاصل تھا۔پہلے صاحب تخلص تھا پھر شفیق اختیار کیا۔فارسی اور اردو دونوں میں مشق سخن کی ہے۔''[6]

مزید تحریر فرماتے ہیں:

''شفیق نے مثنوی، قصیدہ، غزل، رباعی وغیرہ غرض تمام اصناف سخن میں جولانی طبع دکھائی ہے۔ 'تصویر جاناں' ان کی مشہور مثنوی ہے۔ایک دوسری مثنوی 'معراج نامہ' ہے۔''[7]

انھوں نے نعتیہ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے، شفیق کا تحریر کردہ 'معراج نامہ' جو ایک سو چھ ابیات پر مشتمل ہے کافی مقبول ہے۔شفیق نے مثنوی نگاری میں بھی کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ان کی تین مثنویوں کی نشاندہی کی جاتی ہے جو فارسی زبان میں ہے جبکہ ایک مثنوی 'تصویر جاناں' کے عنوان سے اردو میں ہے۔

شفیق نے فارسی میں بھی عمدہ شاعری کی ہے۔ ان کی فارسی شاعری میں حسن وعشق اور معاملات عشق کا اظہار دلچسپ انداز میں ہے۔شفیق نے دور نوجوانی کی داستان عشق کو یوں لفظوں کا جامہ پہنایا ہے۔

یاد آیامی کہ عشق نوجوانی داشتم
بر سر رسوائی و کافی داشتم [8]

وہ عشق مجازی کے واسطے سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور محبوب کی زلف گرہ گیر میں خدا کو تلاش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

دلم گم شد بزلف خوب روی
شفیق اکنون خدارا جستجوی [9]

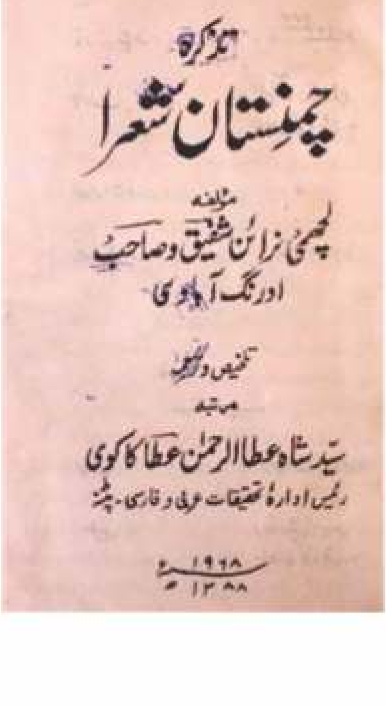

اور وہ اس جستجو میں کامیابی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

می رساند حسن مطلق رنگ ہا بے رنگ را
سیر کن در پرتو خورشید تار عنکبوت [10]

وہ بارگاہ خداوندی میں معافی کے خواستگار بھی ہیں۔

یارب بدر تو عذر خواہ آمدہ ام
سر تا بقدم غرق گناہ آمدہ ام
از چشمہ عفو شست و شوی فرما
در بارگہت نامہ سیاہ آمدہ ام [11]

اس کے علاوہ شفیق نے تاریخ گوئی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔صوفی عبدالجبار ملکاپوری محبوب الزمن ص582 پر تحریر کرتے ہیں کہ'' شاعری وسخن سنجی وتاریخ نویسی و تالیف میں فرد کامل تھا۔اس کے نتائج طبع بہت صاف شستہ وشفاف وبرجستہ ہوتے ہیں۔''[12]

شفیق نے علم وفن کی دنیا میں نام پیدا کیا۔اپنی علمی وادبی استعداد کے ذریعے اردو وفارسی میں شعروفن کے جوہر دکھائے۔شفیق کے علمی وادبی کارناموں سے دنیائے علم وادب آج بھی فیضیاب ہورہی ہے۔

حواشی

1. تذکرۂ شعرائے دکن، عبدالجبار ملکاپوری، جلداول، ص149
2. ہندوؤں میں اردو، رفیق ماہروی، ص173
3. ذکر مرہٹہ کے نام سے ملا فیروز کے کتب خانہ (ممبئی) میں ایک نسخہ موجود ہے۔
4. صوفی عبدالجبار ملکاپوری
5. دکن میں اردو، چوتھا دور سلطنت آصفیہ، ص403
6. ایضاً
7. ایضاً
8. سید محمد رضا ساجد، شفیق اورنگ آبادی حیات اور کارنامے، ص110
9. ایضاً، ص110
10. ایضاً، ص113
11. ایضاً، ص133
12. صوفی عبدالجبار ملکاپوری، محبوب الزمن، ص582

■

Dr. Mohammad Aasif
Assistant Professor Urdu
Government Vidarbha Institute of Science and Humanities (Autonomous)
Amravati-444604 (Maharshtra)
Mob.: 9403282420
aasifmohammad8313@gmail.com

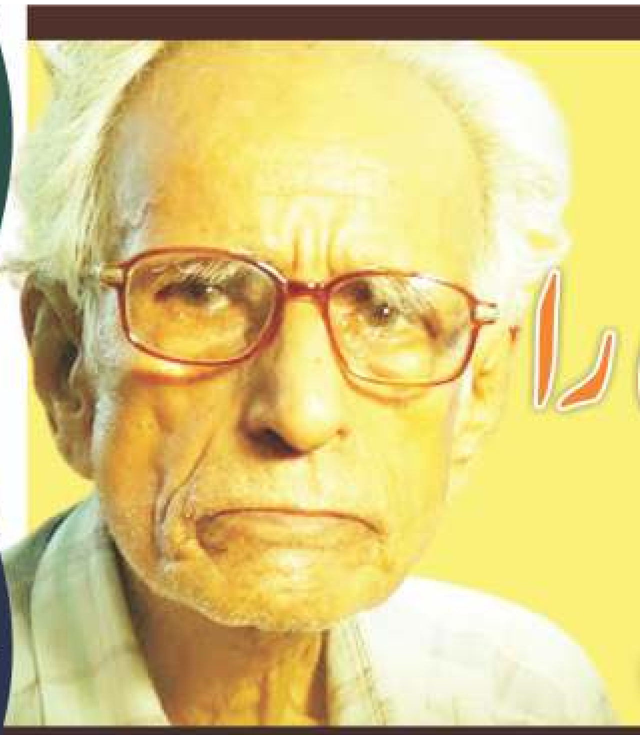

بلراج مین را بطور افسانہ نگار

نثار احمد

بیسویں صدی کے نصف آخر میں جن افسانہ نگاروں نے اپنے منفرد اسلوب سے افسانہ نگاری میں اہم مقام حاصل کیا ان میں بلراج مین را کا نام سب سے منفرد اور اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے جب افسانہ لکھنا شروع کیا تب ترقی پسند تحریک اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی اور جدیدیت کا شباب ڈھلنے کو تھا۔ مین را نے اپنے وقت کے حاوی تخلیقی رجحانوں کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں کی، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مین را کا کینوس اتنا وسیع تھا جس میں تخلیقیت کا حاوی رجحان ایک کونے میں سمٹ کر رہ گیا۔ اس کی سب سے بنیادی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کے یہاں شعور لاشعور کبھی کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا، مین را کے افسانے اسی شعور اور لاشعور کے درمیان کی ایک کڑی ہیں جو انھیں بے سمتی کی جانب لے جاتے ہیں اور یہی بے سمتی مین را کی کہانیوں کا حسن بن جاتی ہے۔

جدیدیت اپنے پورے تام جھام کے ساتھ عہد شباب پر تھی۔ موضوع، مواد، ہیت پرستی اور ادب کے سمت و رفتار کو طے کرنے اور پرکھنے کے پیمانے پر خوب بحثیں ہو رہی تھیں۔ اقبال فیض اور فراق سے لے کر پریم چند، کرشن چندر جیسے ادیبوں کو ادب کے ایک کھوٹے میں بند کر ایک ہیولی عطا کر دیا گیا۔ مین را اس وقت بھی اپنے منفرد طرز تحریر سے اس کھوٹے سے آزاد رہنے کے لیے کوشاں تھے۔ جدیدیت کے اس عہد میں وہ نمایاں قلم کار کی حیثیت سے نکل کر سامنے آئے اور مختصر افسانوں سے اپنی الگ شناخت قائم کی۔

مین را نے بہت کم افسانے لکھے۔ کل 37 افسانے ان کے فکشن اثاثے ہیں۔ مین را نے اتنا کم کیوں لکھا؟ تحریر کی روانی کے باوجود وہ اتنا محدود کیوں رہا؟ شمیم حنفی لکھتے ہیں:

''مین را کا قلم بہت تندی اور تیزی کے ساتھ ایک عرصے تک چلتا رہا پھر اس نے اچانک لکھنا بند کر دیا، مگر اس کے اظہار کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا اور اب تک جاری ہے اس سلسلے پر احمد مشتاق کے اس قول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے کہ خاموشی بھی ایک طرز اظہار ہے۔ مین را کے ہم عصروں میں بیان کے ساتھ ساتھ خاموشی کا یہ عنصر بہت نمایاں ہے۔''[1]

بلراج مین را کی یہ خاموشی ان کا ادبی حوالہ بن گئی۔ مین را اپنی اس خاموشی کی وجہ سے بہت با معنیٰ دکھائی دیتے ہیں ان کے افسانوں میں یہ خاموشی جا بجا موجود ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں کنفیوژن کی فضا ہموار کی، قاری کے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ افسانہ اپنی ابتدا سے انتہا تک کن کن نکات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اسی وجہ سے تربیت یافتہ قارئین کی ایک بڑی تعداد ان سے منسلک نہ رہ سکی حالانکہ اس کا انھیں کبھی کوئی گلہ بھی نہیں رہا اور اپنے اسی تخلیقی شان کی بنیاد پر وہ ممتاز بھی ہوئے۔ انھوں نے جتنے افسانے لکھے سب ان کے اندرون کا اظہار تھے خارجیت پسندی کو انھوں نے ذرا بھی قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ اپنے اندرون کے اظہار کے لیے انھیں کبھی کسی روایتی طور طریقے کی ضرورت نہیں پڑی اور نہ ہی کسی تحریک سے وابستگی رہی، نا ہی انھوں نے داخلیت کے اظہار کے لیے کبھی کسی اصول کی پابندی کی، ان کے لیے ان کا تخلیقی وجدان ہی سب کچھ تھا۔ ترقی پسندی یا جدیدیت سے ہاں اور نا کے درمیان کا واسطہ رہا، انھوں نے کبھی کسی کو اپنے حد میں شمولیت کی اجازت نہیں دی، بقول شمیم حنفی:

''ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کے سلسلے میں جو انتہا پسندانہ رویہ عام ہوا وہ ترقی پسندوں اور جدیدیت نوازوں کے غیر متوازن اور اڑیل موقف کی بنیاد پر (ہوا) اپنے زیادہ تر معاصرین کے برخلاف مین را نے نہ تو کسی کو اپنی اسپیس میں مداخلت کی اجازت دی نہ دوسروں کی اسپیس کو اپنے لیے عبور کرنے کی کوشش کی، اس لیے نہ تو وہ کسی منزل کا پابند رہا نہ کسی ایک رستے کا۔''[2]

مین را کے افسانے آفاقی نوعیت کے نہیں ہیں لیکن وہ اپنے ہمعصروں میں ممتاز ہے۔ ان کے افسانے شعور لاشعور کے درمیان کی ایک کڑی ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریر میں کہی اور ان کہی کے درمیان کی فضا اس حدت کے ساتھ پیدا کی ہے کہ قاری کی نظر عبارت سے آگے نکل جاتی ہے اور ذہن سابقہ عبارت میں مقید رہ جاتا ہے۔ ان کے افسانے کی نشتریت تحریر کا تیکھا پن عام اور روزمرہ کی کہانی کو فکشن کے روپ میں ڈھال دیتے ہیں۔ مین را کا ذہنی شعور اتنا بالیدہ ہے کہ کہانی کہنے کے ڈھنگ میں اور کہانی سنانے کے طور طریقے میں کس طرح تفریق کی جا سکتی ہے اسے خوب

آتا ہے اس کے افسانے یہ کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

وہ کانپ رہا تھا، اور کانپتے قدموں سے دھیمے دھیمے بڑھ رہا تھا وقت سے بے خبر، لیمپ پوسٹوں سے بے خبر، ایک بار پھر اس کے قدم رک گئے۔

اس کی نظروں کے سامنے خطرے کا نشان تھا سامنے پل تھا..

صاحب! یہ شخص پل کے پاس کھڑا تھا، کہتا ہے ماڈل ٹاؤن میں رہتا ہوں اور ماچس کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔

کیوں بے؟

اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی ماچس استعمال کرلوں؟ مجھے اپنا سگریٹ سلگانا ہے۔"3

اس کے علاوہ ان کے دیگر افسانے بھی اسی منفرد نوعیت کے حامل ہیں۔ ان کے بعض افسانے تو قصے اور کہانی پن کے اعتبار سے اتنے قریب ہیں کہ اسلوب اور بیانیہ کا فرق ہی دونوں کے درمیان حد فاصل کا کام کرتا ہے۔ 'وہ' اور 'مقتل' کی کہانی تقریباً ایک جیسی ہے۔ دونوں میں کرداروں کا سفر ہے اس کے باوجود دونوں نہ صرف پلاٹ اور اسٹرکچر کے اعتبار سے الگ ہیں بلکہ دونوں مین را کی شاہکار کہانیاں ہیں۔

مین را کے افسانوں میں موضوعاتی تنوع کے ساتھ ایک بکھراؤ نظر آتا ہے جس میں کہانی کے حصے وسیع کینوس میں دکھائی دیتے ہیں لیکن یہی بکھراؤ ان کی کہانیوں کا محور بن جاتا ہے۔ علامت و تجریدیت کے حوالے سے مین را کا نام ممتاز دکھائی دیتا ہے۔

کہانی بننے، کہنے اور لکھنے کے لیے مین را کو کبھی تیشہ طلبی کی ضرورت نہیں پڑی، ان کے ذاتی تجربات ہی ان کے افسانوں کا موضوع ہیں۔ جن سے ان کا گہرا رشتہ رہا ہے۔ شہری زندگی بالخصوص دہلی کی رہن سہن، سڑک، کافی ہاؤس، ٹی ہاؤس، کناٹ پلیس، ماڈل ٹاؤن، نرس، ڈاکٹر، ہاسپٹل، بس اسٹاپ اور بڑی بڑی عمارتیں ان کی کہانیوں کے کلیدی موضوعات ہیں۔ مین را کا اوراک شہری زندگی ہے ان کی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے قاری خود اس کا ایک کردار بن جاتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کل رات کی ہی تو کہانی ہے جو صاف اور شستہ زبان میں لکھ دی گئی ہے۔ یہ خود اس کے اپنے شہر کی کہانی ہے اسی لیے شہر ان کی تحریر میں کلیدی حوالہ بن کر سامنے آتا ہے۔ شہری زندگی کے حوالے سے بہت سے ذاتی تجربات تھے جو مین را کی شخصیت پر گہرا اثر مرتب کر گئے۔ مین را نے اپنے بارے میں کہا تھا کہ یہ کہانیاں میرے اندرون کا اظہار ہیں۔ ظاہر ہے انسان اپنی زندگی میں کتنے ہی واقعات و حادثات اور تجربات سے گزرتا ہے، اور یہی واقعات و حادثات اور تجربات ادبی سرمایوں کی بنا قرار پاتے ہیں۔

مین را نے انسانی جذبوں اور قدروں کو آفاقیت بخش دی ان کی کہانی میں ایک شخص ماچس کی تلی کے لیے پریشان ہوتا ہے جسے سگریٹ کی شدید طلب ہے۔ ان کی کہانیوں میں نرس ہے، ہاسپٹل ہے۔ ان کی کہانیوں میں بس سٹاپ پر کھڑا ایک بیروزگار نوجوان ہے اور ان کی کہانیوں میں خودکشی ہے۔ ایک تخلیق کار جب انہی تجربات سے گزر کر آیا تو وہ مین را کہلایا۔ ظاہر ہے ان سب کی ظاہری طور پر کوئی وجہ نہیں ہے۔ تخلیق کار نے زندگی کے اس رخ کو اسی طرح کیوں دیکھا؟ اس کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں؟ ادب میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، ان کے ریزن تلاش کرنا بے معنی ہے۔ کردار کی خودکشی سے متعلق ایک سوال کے جواب میں مین را کہتے ہیں:

خودکشی زندگی کی ایک لاجک ہے جن کہانیوں میں وہ خودکشیاں ہیں وہ ان کی کہانیوں کے کرداروں کا Lagecend تھا۔"4

مین را کے افسانوں میں موضوعاتی تنوع کے ساتھ ایک بکھراؤ نظر آتا ہے جس میں کہانی کے حصے وسیع کینوس میں دکھائی دیتے ہیں لیکن یہی بکھراؤ ان کی

کہانیوں کا محور بن جاتا ہے۔ علامت و تجریدیت کے حوالے سے مین را کا نام ممتاز دکھائی دیتا ہے۔ مین را اپنے عہد کے ممتاز علامتی افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں ان کے زیادہ تر افسانے علامتی نوعیت کے ہیں جس وقت مین را اپنے تخلیقی وفور کو ہوا دے رہے تھے اور بطور علامتی افسانہ نگار اپنے تخلیقی جہان کو وسعت بخش رہے تھے اسی عہد میں علامت و تجریدیت کے حوالے سے ایک نام ابھر کر سامنے آیا وہ نیر مسعود کا تھا۔ نیر مسعود نے اپنے خواب کی معدوم ہوتی دنیا کو اپنی تخلیقی بافت کا حصہ بنایا جبکہ مین را کے افسانے ان کا حال تھا انھیں اپنے ماضی سے بہت زیادہ سروکار نہیں تھا، اس ضمن میں مین را کے کچھ مشہور افسانے جیسے 'کمپوزیشن سیریز' وہ 'پورٹریٹ ان بلیک اینڈ وائٹ' 'ریپ' اور 'مقتل' کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

مین را کے افسانوں میں احتجاج کا رنگ بھی صاف نظر آتا ہے۔ کوئی تخلیق اپنے آپ میں رنگین یا سادہ نہیں ہوتی، ترش اور تند و تیز نہیں ہوتی، بلراج کے افسانوں میں جو سرعت اور تیزابیت ہے وہ دراصل ان کی ذات کا حصہ ہے، جو علامتی طور پر کہانیوں میں در آئی ہیں۔ وہ ادب اور زندگی میں کسی بھی طرح کے سمجھوتے کے قائل نہیں تھے، ان کی حساسیت اور فطانت نے ان کے افسانوں کو احتجاجی رنگ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انھوں نے سریندر پرکاش سے متعلق کہا تھا کہ "انھیں عالمی مسائل سے ذرا سی دلچسپی نہیں ہے

جس سے ایک ادیب کو واقف ہونا چاہیے۔'' مین را کا یہی انداز ان کے افسانوں کو راستگی کا پابند بناتا ہے یہ راستگی بھی اپنے وقت کے حاوی رجحانوں سے ایک طرح کا احتجاج ہے۔ اپنی شرطوں پر افسانے تخلیق کرنا اپنے ڈھنگ سے کہانیاں بننا یہ ان کے احتجاجی ذہن و دماغ کا ایک حصہ ہے جس میں غم ہے، غصہ ہے، استفسار ہے، سوال ہے، جھنجھلاہٹ ہے اکتاہٹ اور یاس و بے بسی ہے۔ شاید اسی احتجاجی رویے نے ان کی تخلیقی جہان کو محدود کر دیا۔

مین را کا افسانوی جہان 37 کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان کا پہلا افسانہ بھاگوتی تھا جو رسالہ ساقی میں شائع ہوا، اس وقت ساقی اور پھر بعد میں رسالہ شب خون میں شائع ہونا تخلیق کار کے مستحکم ہونے کی ضمانت تھی اس کے باوجود انھوں نے صرف 37 افسانے ہی کیوں لکھے اس پر انھوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا تھا:

''میں کہانیاں کہاں بھیجوں؟ آپ ایک پرچہ بتائیے جس میں چھپنے کا میں عادی تھا۔ سویرا یا جس معیار کا پرچہ میں نے نکالا، آج کل میں 1942 میں میری کہانی چھپی تھی اس زمانے میں عرش ملسیانی تھے انھوں نے مجھے خط بھیجا تھا اور ان کا خط لاہور میں ملا تھا۔ میں یہاں آیا تو ان سے مل کر میں نے کہا'' آپ میری کہانی چھاپ نہیں سکتے ہیں میں بالکل دوسری طرح کی کہانیاں لکھنے والا ہوں، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی میرا لفظ ادھر سے ادھر کر دے۔''5

افق، وہ، کمپوزیشن، شہر کی رات، مقتل، بھاگوتی، دھنپتی، کوئی کوئی روشنی، یک مہمل کی کہانی، آتما رام، پورٹریٹ ان بلیک اینڈ وائٹ، ہوس کی اولاد، بس اسٹاپ، جسم کے جنگل میں ہر لحہ قیامت ہے مجھے اور ساحل کی ذلت ان کے نمائندہ افسانے ہیں ان میں سے بیشتر افسانے علامتی اور تجریدی نوعیت کے ہیں۔ افسانہ 'وہ' شہری زندگی سے مستعار کردار اس کہانی کا مرکز ہے جسے سکون کی تلاش ہے۔ سگریٹ سکون کا استعارہ ہے جس کے لیے اسے ماچس کی ضرورت ہوتی ہے۔ سکون جو ضرورت سے بڑھ کر ہے اس کی تلاش میں کردار اپنے شعور تک کھو دیتا ہے جو لاشعوری طور پر جا بجا بھٹکتا ہے۔ دراصل حزن اضمحلال اور پریشانی اس ذات کا اندرون ہے جو سگریٹ اور ماچس کی تلی کی صورت میں کہانی میں در آیا ہے ضرورت کی تکمیل نہ ہونے کی صورت میں اس پر لاشعوریت کی جو کیفیت طاری ہوتی ہے یہ صورتحال اسی شہری زندگی کا استعارہ ہے۔

مین را کا ایک نمائندہ افسانہ 'جسم کے جنگل میں ہر لحہ قیامت ہے مجھے' ہے اس میں زندگی کی اکتاہٹ اور بے بسی دکھائی پڑتی ہے۔ اندوہ زندگانی سے بازیابی کی ایک صورت موت بھی ہو سکتی ہے اس افسانے میں اسی مضمون کو باندھا گیا ہے۔ ادب میں گرچہ یہ مضمون نیا نہیں ہے لیکن جس کینوس پر مین را نے اس مضمون کو باندھا ہے آپ مین را کی حقیقت پسندی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

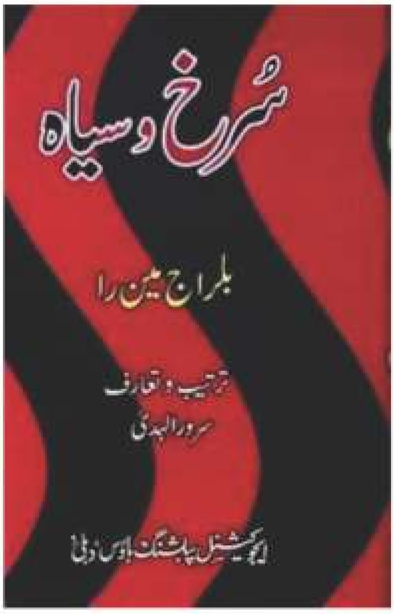

''حضور!

مجھے ان فضول و بے معنی سلسلے میں واقعی کچھ کہنا ہے۔

میں نے سوچا تھا کہ مر جاؤں گا اور پوری دنیا سے رشتہ ٹوٹ جائے گا مگر ایسا نہ ہوا اور اتفاقاً مجھے اپنی بات کہنے کا موقع مل گیا۔

جی ہاں! میں نے خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے میں اس الزام کو، بخوشی قبول کرتا ہوں میں سمجھتا ہوں کہ میری ہاں الزام کو ہر لحاظ سے جرم ثابت کرتی ہے اور اب مجھے کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے۔''6

انھوں نے کمپوزیشن سیریز کے تحت کئی کامیاب افسانے لکھے ہیں اس میں ایک افسانہ کمپوزیشن تین ہے۔ کمپوزیشن تین ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو قابل اور تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بے روزگار ہے جب کہیں سے امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں پڑتی تو انسان کسی طرح چھوٹی چھوٹی چیزوں پر قناعت کرنے کا عادی ہو جاتا ہے لیکن اس کے اندر ایک کسک ہوتی ہے جو اسے ہمیشہ ملعون و مطعون گردانتی ہے۔ مین را کا یہ افسانہ یاسیت اور حرماں نصیبی کی شاندار ترجمانی کرتا ہے۔

بلراج مین را سطحی افسانہ نگار نہیں تھے۔ عالمی ادب کے نمائندہ ادیبوں سے انھوں نے کسب فیض کیا تھا وہ اپنے وقت کے حاوی اور روایتی اسلوب سے ہٹ کر افسانے تخلیق کرنے والوں میں تھے۔ انھوں نے دستوئیسکی اور آسٹن چین جیسے مغربی ادیبوں اور نقادوں کو خوب پڑھا تھا جس کا اثر ان کے افسانوں میں صاف دکھائی پڑتا ہے۔ اچانک ہی انھیں احساس ہوا کہ ہمارے ادیب اس خول سے باہر نہیں نکل پا رہے ہیں جو تحریکات و رجحانات کے زیر اثر ادب میں در آیا تھا جسے مین را نے خود فریبی کے عظیم سرکس سے تعبیر کیا تھا تو انھوں نے تخلیقیت سے کنارہ کشی اختیار کر لی جسے مین را کی ادبی قناعت پسندی بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن صحیح معنوں میں یہ قناعت پسندی نہیں تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انھوں نے اپنے وقت کے روایتی طور طریقوں کو یکسر نکار دیا۔ مین را نے اپنے احساسات کا ایک بڑا ذخیرہ اپنی ذات تک ہی محدود رکھا اسے کسی اور پر وا نہیں ہونے دیا۔ مین را کے تندیٔ کلام سے کبھی کبھار اس کا اظہار ہو جاتا تھا۔ شاید وہ بہت کچھ کہنا چاہتے تھے، بہت کچھ لکھنا چاہتے تھے لیکن خاموش رہے اسی خاموشی نے ان کے اس مختصر سے ادبی سرمائے کو بہت بامعنی بنا دیا ادب میں ایسی بامعنی خاموشی بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔

حواشی

1. بلراج مین را ایک ناتمام سفر، مصنف: ڈاکٹر سرور الہدیٰ، ص 15
2. ایضاً، ص 19
3. مقتل
4. بلراج مین را ایک ناتمام سفر، ص 289
5 ایضاً، ص 99
6. سرخ و سیاہ، ص 272

■

Nisar Ahmad
Room No: 117, Chandrabhaga Hostel
Jawaharlal Nehru University
New Delhi- 110067
Mob.:8800973643
nisar.qasmijmi@gmail.com

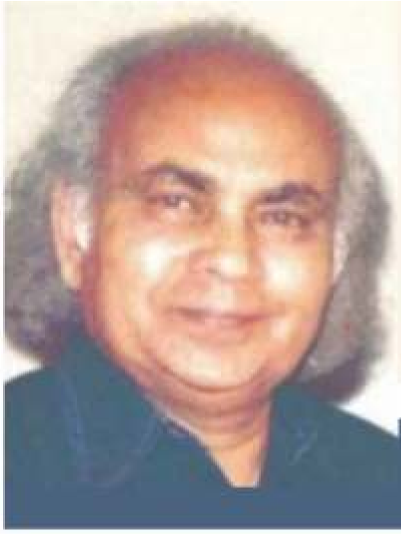

مناظر ارشد

شکیل الرحمن کی نظر میں
پریم چند کے المیہ کردار

شکیل الرحمٰن کی پیدائش 18 فروری 1931 کو مشرقی چمپارن کے شہر موتیہاری میں ہوئی اور وفات 9 مئی 2016 کو دہلی میں ہوئی۔

ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت گھر پر ہی ہوئی۔ مزید تعلیم میٹرک، انٹر اور بی اے کی تعلیم موتی ہاری میں رہ کر ہی حاصل کی جبکہ ایم اے اور ڈی۔لٹ کی ڈگری پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ سے حاصل کی۔ سب سے پہلے تقرری بحیثیت لیکچرر (بھدرک) اڑیسہ میں ہوئی۔ وہ بہار یونیورسٹی مظفر پور، کشمیر یونیورسٹی اور متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ، کے وائس چانسلر رہے۔

شکیل الرحمٰن صاحب ایک تخلیقی نقاد تھے اور ایک تخلیقی فنکار بھی، ان کا اصل شناخت نامہ ادب میں جمالیاتی مطالعہ ہے جمالیات کے موضوع پر ایک سے بڑھ کر ایک کتابیں لکھیں۔ انھوں نے تنقید کے علاوہ ناول، افسانہ، ڈرامہ اور ایک خودنوشت سوانح حیات 'آشرم' بھی لکھی۔ ویسے تو ان کی کتابوں کی ایک لمبی فہرست ہے جس میں سے چند قابل ذکر کتابیں کچھ اس طرح ہیں۔ ادب اور نفسیات، لاوے کا سمندر، میر شناسی، اساطیر کی جمالیات، تصوف کی جمالیات، منٹوشناسی، اقبال: روشنی کی جمالیات، فکشن کے فنکار پریم چند، ابوالکلام آزاد، قرآن حکیم جمالیات کا سرچشمہ، ابوالکلام آزاد وغیرہ۔ مذکورہ تمام کتابوں میں ایک اہم کتاب 'فکشن کے فنکار پریم چند' میں انھوں نے فکشن کے سمراٹ پریم چند (1880-1936) کے المیہ کرداروں کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔ فکشن کے فنکار پریم چند: تقریباً 216 صفحات پر مشتمل ہے جس میں شکیل صاحب نے پریم چند کے ناول اور افسانوں پر اپنا تنقیدی نظریہ پیش کرتے ہوئے ان کی کہانیوں کے المیہ کرداروں کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا ہے اور با قاعدہ، المیہ کردار، کے عنوان سے الگ باب باندھا ہے۔

شکیل الرحمٰن نے المیہ کردار نامی اس باب میں پریم چند کے المیہ کرداروں کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے مثال کے طور پر افسانہ (کفن) سے مادھو اور گھیسو (حقیقت) کا امرت، مراری لال (کفارہ) کاؤس جی (لعنت) ونود (دوسکھیا)، ہلکو (پوس کی رات)، دکھی چمار (نجات) ہرکو (قربانی)، میر صاحب اور مرزا صاحب (شطرنج کے کھلاڑی) جیون داس (دستِ عیب) مسٹر مہتہ (ریاست کا دیوان) وغیرہ. جیسے کرداروں کا محاکمہ کرتے ہوئے المیہ کے جوہر کو نمایاں کیا ہے۔

معروف نقاد حقانی القاسمی صاحب کا 'پریم چند' کے المیہ کرداروں پر ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''المیہ میں حسن کی تلاش بھی شکیل الرحمٰن کی تنقیدی تجسس کا ایک نیا منطقہ ہے اور کرداروں کی تفہیم کی ایک نئی منطق بھی۔ پریم چند کی کہانیوں کے المیہ کرداروں کی سائیکی کا معاشرتی عوامل اور تحرکات کے متناقص سے رشتہ جوڑ کر ایک اورنئی جہت پیدا کردی ہے۔ المیہ کرداروں کے حوالے سے کفن کے گھیسو اور مادھو کو انھوں نے بطور مثال پیش کیا ہے اور ان دونوں کرداوں کی نفسیاتی کیفیات کی تفصیلات درج کرتے ہوئے 'کفن' کو اردو کا شاہکار کہا ہے اور یہ لکھا ہے کہ جذباتی آسودگی حاصل کرنے کا یہ انداز اردو فکشن میں غیر معمولی ہے۔ پریم چند نے انسانی فطرت کی جس طرح نقاب کشائی کی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ کفن فنکار کے وژن اور فنکارانہ دروں بینی کا ایک نا قابل فراموش نمونہ ہے۔''

(بحوالہ فکشن کے فنکار پریم چند اور شکیل الرحمٰن، مرتب شیخ عقیل احمد ص 8/307)

مذکورہ اقتباس میں حقانی القاسمی صاحب نے پریم چند کے المیہ کرداروں پر شکیل الرحمٰن کے نقطۂ نظر کو انتہائی دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہوئے ان کے تخلیقی تنقید کو توانائی عطا کی ہے جس سے 'المیہ کا حسن' مزید نکھرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جمادھو کی بیوی بدھیا مرجاتی ہے تو اس کے کفن کے لیے گھیسو اور مادھو دونوں زمین دار کے پاس جا کر روتے ہیں، مہاجنوں سے پیسے مانگتے ہیں، زمین دار دو روپے دے دیتا ہے اس طرح سے مانگ مانگ کے ایک گھنٹے میں پانچ روپے جمع ہو جاتے ہیں، لکڑیاں بھی مل جاتی ہیں، گھیسو کہتا ہے 'چلو ہلکا سا کوئی کفن لے لو' مادھو جواب دیتا ہے 'ہاں اور کیا' لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی، رات کو کفن کون دیکھتا ہے۔ گھیسو پانچ روپے کو للچائی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔ 'کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کے چیتھڑے بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کفن چاہیے' مادھو ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ کفن تو لاش کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے۔ پھر دونوں شراب پیتے ہیں مچھلیاں کھاتے ہیں، ناچتے گاتے ہیں رات بھر میں پانچ روپے ختم ہو جاتے ہیں۔ شکیل الرحمٰن کا خیال ہے کہ ''یہ دونوں کردار طبقاتی زندگی کے المیہ کو لیے اور اپنی نفسیاتی کیفیتوں کے ساتھ، کیریکٹر، بن گئے ہیں، جذباتی آسودگی حاصل کرنے کا یہ انداز اردو فکشن میں غیر معمولی ہے' اقتباس دیکھیے:

''ایسے المیہ کرداروں کی اندورنی ویرانی غیر معمولی ہے کہ جس سے افسانہ پیتھوس کا ایک منظر بن گیا ہے۔ کرداروں کے عمل سے اندرونی ویرانی Havoc کا جھٹکا غیر معمولی ہے۔ یہ اردو کا شاہکار ہے، پریم چند نے انسانی فطرت کی جس طرح نقاب کشائی کی ہے۔ اس کی مثال نہیں ملتی ٹریجڈی فنکارانہ درون بینی کا تقاضا کرتی ہے۔ 'کفن' فنکار کے 'وژن' اور فنکارانہ درون بینی کا ایک نا قابل فراموش نمونہ ہے۔''

(فکشن کے فنکار پریم چند، ص 133-34)

شکیل الرحمٰن صاحب نے یہاں یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ مادھو اور گھیسو کی سائیکی جو اس المیہ کے جوہر کو نمایاں کرتی ہے جتنی گہری ہے اتنی ہی تاریک بھی ہے پھر بھی دونوں کردار اپنے زوال کے مکمل ذمہ دار نہیں۔ ان کی ذمہ داری معاشرہ اور اقدار پر بھی ہے۔

پریم چند کے جن کہانیوں میں یہ المیہ کردار موجود ہیں وہاں قدروں کی کشمکش اور ذہنی تصادم نے ٹریجڈی پیدا کی ہے۔ ان کے المیہ کردار اکہری شخصیت کے حامل نہیں ہیں بلکہ ان میں مختلف جہتیں ہیں۔ گہری پیچیدگی نفسیاتی تصادم - طبقاتی کشمکش نیز متصادم نقطہ نگاہ کی کشمکش ان کرداروں کو توجہ کا مرکز بناتی ہے اور ان کرداروں کے دم سے کہانیوں میں زندگی دھڑکتی نظر آتی ہے۔

شکیل الرحمٰن صاحب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ پریم چند کے کردار روایتی المیہ کرداروں کی مانند نہیں ہوتے۔ وہ نہ تو بلند مرتبہ ہوتے ہیں، نہ ہی ان کے زوال میں کوئی خارجی شے پوشیدہ ہوتی ہے، بلکہ وہ عام انسان ہوتے ہیں جن کی محرومیاں، دکھ، درد اور شکست خوردگی ایک داخلی کشمکش اور جذباتی ٹوٹ پھوٹ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پریم چند کے کردار ایک ایسے داخلی تضاد کا شکار ہوتے ہیں جہاں اخلاق اور معاشرتی اصولوں کے درمیان کشمکش انہیں نہ تو مکمل نیکی کا راستہ اختیار کرنے دیتی ہے اور نہ ہی مکمل برائی کا۔ یہی اندرونی ٹوٹ پھوٹ انھیں المیہ کا پیراہن عطا کرتی ہے۔

شکیل الرحمٰن کا دعویٰ ہے کہ پریم چند کا المیہ نہ تو خارجی طور پر مسلط کیا گیا ہے اور نہ ہی روایتی قسم کا 'عظیم المیہ' ہے، بلکہ وہ حقیقت پسندانہ اسلوب میں انسانی زندگی کی سفاک سچائیوں کی جھلک دکھاتے ہیں۔ یہ کردار اپنے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں، لیکن ان میں ایک داخلی سوال اور اضطراب موجود ہوتا ہے۔

شکیل الرحمٰن نے پریم چند کے کرداروں کی نفسیاتی ساخت کو ایک 'تضاد' سے تعبیر کیا ہے۔ ان کرداروں میں نیکی اور بدی، جذبہ اور عقل، امید اور یاس جیسے جذبات بیک وقت موجود ہوتے ہیں، اور یہی ان کی فنی گہرائی کا معراج ہے۔

پریم چند کے المیہ کردار صرف ہمدردی کے متقاضی نہیں ہوتے بلکہ وہ ایک ایسا جمالیاتی تجربہ بن جاتے ہیں جو قاری کو صرف رلاتا نہیں، بلکہ اسے انسانی وجود کی پیچیدگیوں سے آشنا کرتا ہے۔ یہی ان کا فنی کمال ہے اور فنکارانہ پیشکش۔

شکیل الرحمٰن کا مذکورہ اقتباس پریم چند کی افسانہ نگاری کی گہرائی کو نمایاں کرتا ہے۔ وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ پریم چند کے المیہ کردار جدید نفسیاتی اور سماجی شعور کا نمائندہ ہیں، اور ان کا دکھ صرف ذاتی نہیں بلکہ سماجی، اخلاقی اور انسانی المیہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسی طرح سے پریم چند کے ایک دلچسپ افسانہ (حقیقت) کے المیہ کردار 'امرت' کے بارے میں شکیل الرحمٰن کچھ یوں رقمطراز ہیں:

''امرت، (حقیقت)۔ ذہن اور حالات کے تصادم میں ایک المیہ کردار بن کر ابھرتا ہے، اس تصادم سے تمناؤں کی شکست ہوتی ہے اور ایک پر آشوب Catastrophic انجام ہوتا ہے۔ امرت کا ذہن وقت Time کی زنجیر توڑ کر آگے بڑھنا چاہتا ہے، اسی رجحان یا ذہنی کیفیت سے ٹریجڈی پیدا ہوتی ہے۔ جس عورت سے محبت کرتا تھا اسے برسوں بعد جبکہ اس کے تین بچے بھی ہو چکے ہیں اسی رومانی فضا میں دیکھنا چاہتا ہے۔ امرت کی عمر چالیس سال سے آگے نکل گئی ہے لیکن سوچ رہا ہے۔'' تقاضائے سن نے یقیناً اسے زیادہ مہر پرور بنا دیا ہوگا اور شوخی اور اکھڑ پن اور بے نیازی تو کب کی رخصت ہو چکی ہوگی اس دوشیزگی کی جگہ اب آزردہ کار نسائیت ہوگی جو محبت کی قدر کرتی ہے اور اس کی طلب گار ہوتی ہے...... وہ محض اس کے منہ سے یہ سن کر روحانی تشفی پائے گا کہ وہ اب بھی اسے یاد کرتی ہے، اب بھی اس سے وہی بچپن کی سی محبت ہے؟''

جب امرت پورنما سے ملتا ہے تو امرت سے ہمدردی ہو جاتی ہے، سفید ساڑی جھکی کمر، پتلی بانہیں، ابھری ہوئی رگیں، آنکھوں میں آنسو، زرد رخسار، کفن میں لپٹی ہوئی لاش— امرت کا ذہن وقت کی زنجیر سے ٹکراتا ہے تو اس کی آواز دیر تک سنائی دیتی ہے۔ پریم چند کے ایسے کردار اپنے نفسیاتی ذہن اور جذباتی رد عمل سے پہچانے جاتے ہیں، جب پورنما کی موسی پورنما کا حال بتاتی ہے تو وہی امرت سوچتا ہے کہ دل میں اگر مٹی کو دیوتا بنانے کی قدر ہے تو انسان کو دیوتا بنانے کی بھی قدرت ہے اور کہتا ہے'' تپسوی کو ہم جیسے غرض کے بندے کیا سمجھ سکتے ہیں، موسی ہمارا فرض اس کے قدموں پر سر جھکانا ہے، سمجھانا نہیں'' التباس ٹوٹتا ہے تو امرت بکھر نہیں جاتا سچائی کو تھام لیتا ہے تکمیل آرزو کی تمنا دم توڑتی ہے تو المیہ کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔''

(ایضاً ص 37-136)

مذکورہ اقتباس پریم چند کے المیہ کردار کے ایک دوسرے روپ کو پیش کرتا ہے جسے شکیل الرحمٰن نے بڑی خوبصورتی سے place کیا ہے۔ یہاں المیہ کا رنگ و روپ اور اس کا خد و خال بہ انداز دگر آیا ہے یہ المیہ کردار 'کفن' کے المیہ کردار سے بہت مختلف ہے جو دونوں کرداروں کے درمیان تطبیق کی ایک نئی جہت پیدا کرتی ہے۔ 'مادھو اور گھیسو' کے المیہ کی ذمہ داری تو معاشرے پر عائد ہوتی ہے لیکن مذکورہ اقتباس کا المیہ کس وجہ سے سامنے آتا ہے؟ اصل میں یہ المیہ کردار پریم چند کے تخلیقی ذہن کا کمال ہے اور شکیل الرحمٰن جیسے ادب کے پارکھ کا بھی جو المیہ کے جوہر سے اچھی طرح واقف ہیں۔ شکیل الرحمٰن صاحب کا تنقیدی ادراک اور تجزیاتی شعور نہایت روشن اور تابناک ہے۔ انھوں نے پریم چند کے المیہ کرداروں کو جس انداز میں سمجھا ہے اور سمجھایا ہے ایک ایک کردار کی سائیکی میں اتر کر ایسی سمجھ اور ایسا ادراک ہمیں کسی دوسرے کے یہاں نہیں ملتا، موصوف کسی بھی فن پارے کی فنی خصوصیات کا جائزہ خارجی سطح پر نہیں کرتے ہیں بلکہ پریم چند کے المیہ کرداروں کے اندرون میں داخل ہو کر ان کی سائیکی میں سما کر جمالیاتی نقطہ نظر سے محاکمہ کرتے ہیں اور پوری ایمانداری سے اپنی بات رکھتے ہیں۔

پریم چند کے تخلیق کردہ المیہ کرداروں میں جو جمالیاتی جہات اور بطون میں جو اسرار مضمر ہیں اس کی تفہیم ہر کسی کے لیے ممکن بھی نہیں 'کفن' پریم چند کی بڑی کامیاب فنی تخلیق ہے۔ اس میں اُن کا مشاہدہ فکر، تخیل، زبان و بیان اور فنی صلاحیتیں معراج کمال پر پہنچی ہوئی ہیں۔ کفن فنکار کے وژن، اور فنکارانہ درون بینی کا ایک نا قابل فراموش نمونہ ہے۔

غرض کہ المیہ کے اس باب میں شکیل صاحب منشی پریم چند کے المیہ کرداروں کو اپنے اندرون میں جذب کر کے زندگی کی داخلی معنویت کو منکشف کرتے ہیں جس سے فنکار کی فنکارانہ صلاحیتیں ابدیت کے ہاتھوں میں جذب ہونے لگتی ہیں۔ شکیل الرحمٰن کا اسلوب شکیل کا وصفِ خاص ہے جس سے قارئین کا کرہ علم وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ یہ باب اپنی نوعیت میں بالکل انوکھا ہے جو پڑھنے والوں پر بھی رقت طاری کر دیتا ہے۔ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ یہ باب بھی شکیل الرحمٰن کے 'وژن' تخلیقی تنقید اور فنکارانہ درون بینی کا ایک نا قابل فراموش نمونہ ہے۔

پریم چند کے المیہ کردار مصنوعی نہیں لگتے بلکہ عام زندگی کے جیتے جاگتے افراد محسوس ہوتے ہیں ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی اور معاشرتی ہوتے ہیں ان کرداروں کے ذریعے پریم چند نے اس استحصالی نظام پر تنقید کی ہے جو سماج کے لیے ناسور ہے۔

■

Monazir Arshad
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.:9891448601
monazirarshad@gmail.com

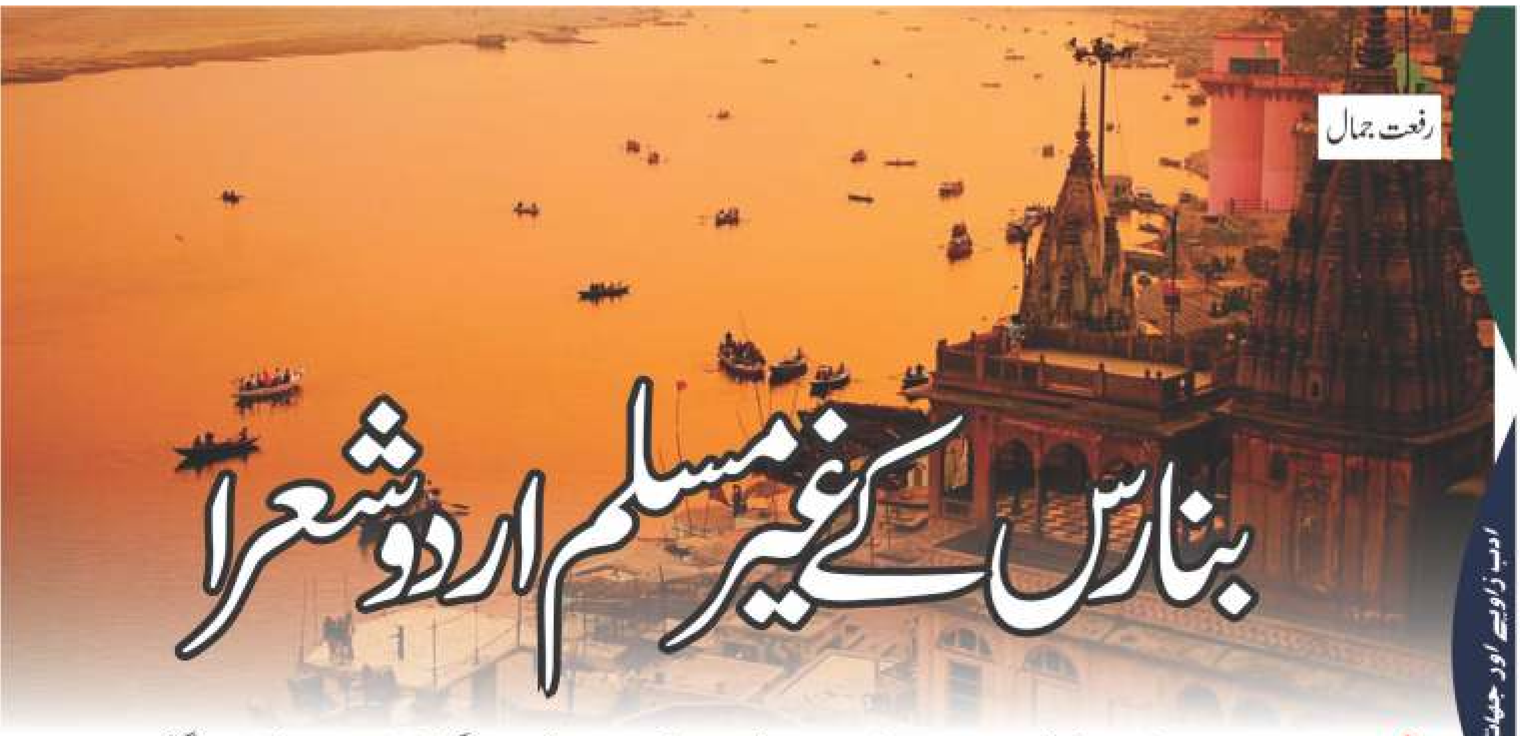

بنارس کے غیر مسلم اردو شعرا

رفعت جمال

ہندوستان کا سب سے مقدس شہر بنارس جس کو ہندوؤں کا کعبہ 'یعنی کاشی' کہتے ہیں اس شہر کے ساتھ ابتدا ہی سے یہ تصور وابستہ رہا کہ یہ سنسکرت اور ہندی کی تعلیم وتدریس کا گہوارہ ہے ہندی کا سرپرست ہے۔ آج اکیسویں صدی میں بھی لوگ بڑی حیرت سے پوچھتے ہیں 'بنارس میں اردو پڑھائی جاتی ہے' ہاں میں کہتی ہوں 'عربی اور فارسی کا بھی باقاعدہ شعبہ ہے یہاں'۔ یہ سن کر لوگ بہت حیران ہوتے ہیں کیونکہ وہ سوچتے ہیں اردو پر ان کا ہی حق ہے۔ یہ باتیں شعبۂ اردو سے باہر کے لوگوں کی ہیں ورنہ شعبۂ اردو کے لوگ تو بنارس آتے جاتے رہتے ہیں۔ دہلی یونیورسٹی علی گڑھ، جے این یو، حیدرآباد کے لوگ ایک دوسرے کو بخوبی پہچانتے ہیں اور اس بات سے باخبر ہیں کہ اہل بنارس نے اپنے خون جگر سے نخل اردو کی آبیاری کی ہے۔

اردو کا جنم سرزمین ہند پر ہوا۔ یہیں اس نے انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا اور پروان چڑھی۔ ہندوستانی مزاج میں مذہبی رواداری کو بڑی اہمیت حاصل ہے جس کی ترجمان اردو زبان ہے جو صرف محبت کی بات کرتی ہے اسی لیے اردو کے پودے کو سرسبز وشاداب کرنے میں اہل قلم نے بڑا اہم رول ادا کیا۔ خاص طور سے مذہبی رواداری اور قومی یکجہتی کے اس عظیم کلچر کے استحکام اور ارتقا میں بنارس کے غیر مسلم اردو شعرا نے اپنا کردار بخوبی نبھایا اور ان روایات کو پروان چڑھایا جن سے ایک صالح معاشرہ کی تشکیل عمل میں آئی۔

تلسی اور کبیر کی اس سرزمین پر مغلوں کے دور عروج میں اردو کے بڑے بڑے شعرا نے اپنا رنگ جمایا۔ جن میں شاہجہاں کے دور کے مشہور شاعر منشی چندر بھان برہمن کا نام بڑا اہم ہے۔ مرزا جہاں دار شاہ نے جب بنارس میں سکونت اختیار کی ان کے ہمراہ بہت سے شاعر بنارس آئے جن میں اندر سروپ بسیط اور ولمارام عاشق کے نام قابل ذکر ہیں۔ جہاں دار شاہ خود بھی اچھے شاعر تھے۔

شاعری زندگی کا آئینہ ہوتی ہے۔ بنارس کی آب وہوا میں جس شاعری نے جنم لیا اس کو پروان چڑھانے والے شاعروں کا تعلق دہلی اور لکھنؤ سے رہا ہے جس سے یہاں کی شاعری پر دہلی اور لکھنؤ کے مشترکہ اثرات نظر آتے ہیں۔ امر سنگھ خوش گو بنارسی کو بنارس کی شاعری کی ابتدائی کڑی تسلیم کرتے ہیں۔

انیسویں صدی میں سرسید احمد خاں پنڈت مدن موہن مالویہ جی اور مسز اینی بسنٹ کی تعلیمی واصلاحی تحریکات کی ابتدا بھی بنارس ہی سے ہوئی۔ یہاں کی علمی وادبی فضائیں بدلی تو شاعری میں اس کے عکس بھی ابھرے۔ جن میں خاص طور سے راجہ شو پرساد ستارۂ ہند، منشی ونایک پرساد طالب بنارسی کی اردو شاعری میں چار چاند لگ گئے اردو سے لگاؤ کے سبب خود مہاراجہ کے خاندان میں کئی اچھے شاعر پیدا ہوئے جن میں مہاراجہ بلوان سنگھ، راجہ منشی کالندی پرشاد بسمل کے نام شامل ہیں۔

ملک کی فضاؤں میں انتشار پیدا ہوا۔ مگر بنارس کا سماجی معاشی ومعاشرتی نظام تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ اپنی ڈگر پر چلتا رہا۔ دہلی ولکھنؤ کی بربادی نے اس دیار دلبراں کی آبادی میں مزید اضافہ کیا۔ دہلی کے شہزادوں اور لکھنؤ کے نواب زادوں کے قیام نے شنکر کی اس نگری کو گنگا جمنی کلچر کا بہترین نمونہ بنادیا جس کی جھلک شاعری میں نظر آتی ہے۔ صبح کے وقت مشرق کے افق سے سورج کی پرنور کرنیں گنگا کے گھاٹ مندر کے کلس اور مسجد کی مینار پر پڑیں تو منظر قابل دید ہوگیا۔ اس منظر پر جب ایران کی بہاروں اور کشمیر کے حسن سے متاثر شعرا کی نگاہیں پڑیں تو وہ صبح بنارس کی تجلی کے متوالے ہوگئے اور ان کی شاعری اس نئے جذبے کی ترجمان بن گئی۔ یہاں کا شاعر ان دلفریب نظاروں میں کھویا ہی نہیں بلکہ ملک کے سیاسی بحران سے بھی باخبر رہا۔ جنگ آزادی میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔

بنارس میں بڑی تعداد میں غیر مسلم شعرا ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ انسان دوستی کا سبق پڑھایا، جن میں پنڈت دیارام عاشق بنارسی، کشن نرائن کھدری بیتاب بنارسی، بھولا ناتھ فلک بنارسی منشی ٹھاکر بنارسی پرشاد اختر بنارسی، منشی گلاب چند سریواستو ناداں بنارسی اور شیو مورت لال قیس بنارسی کے نام سنہرے حروف میں جلوہ گر ہیں۔ ہندی ادب کی پہچان بھاتیندو ہرشچندر نے بھی رسا تخلص سے اردو میں ہندی کا رس گھولا ہے اور بہترین اشعار کہہ کر اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا یہاں کی گنگا جمنی تہذیبی روایات کے زیر سایہ پروان چڑھنے والی شاعری انسان دوستی کی لاجواب مثال ہے۔

نذیر بنارسی کے الفاظ میں ؎

جو ایک جہاں کے ٹوٹے دلوں کی ڈھارس ہے
ہمیں ہے ناز کہ اپنا ہی وہ بنارس ہے

اب اپنے ہی اس بنارس کے کچھ اہم شعرا کا میں

مختصر سا تعارف کرانا ضروری سمجھتی ہوں **منشی امر سنگھ خوش گو بنارسی**۔ امر سنگھ نام، خوش گو تخلص تھا۔ ان کا تعلق کائستھ گھرانے سے تھا۔ خوش گو کی ابتدائی تعلیم عربی فارسی میں ہوئی تھی۔ فارغ البالی کا دور تھا۔ شعر و شاعری کا شوق لے کر پیدا ہوئے تھے مزاج میں شاعری ایسی رچی بسی تھی کہ سنگلاخ زمینوں میں بھی اچھے شعر کہنے کا سلیقہ دکھایا۔ بڑے فکر انگیز شاعر تھے ریاض الوفاق میں لکھا ہے کہ اپنے ایک رسالہ مختصر نقشہ قلعہ اکبر آباد و روضۂ تاج محل سے متعلق بنام سر سر الممالک لکھا تھا۔ (ص 61)

2 **اختر:** منشی ٹھاکر پرساد نام تھا۔ اختر تخلص اختیار کیا محلہ کالا گلی میں مقیم تھے پیشے کے اعتبار سے انسپکٹر آب کاری تھے۔ فارسی کے علاوہ انگریزی اور ہندی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ غزل خوب کہتے تھے ہفتہ وار اخبار آواز خلق میں 1902 تا 1906 تک آپ کی غزلیں بہت چھپتی تھیں چند شعر۔

آئے وہ میری لحد پر تو یہ ہنس کر بولے
انتظار اب ہے کہاں تم کو تو نیند آئی ہے
کہتے ہیں وہ نقاب اٹھا کر کہ دیکھ لو
جس سے جلا ہے طور یہی وہ جمال تھا

3 **آزاد بنارسی بندہ باسنی پرشاد** نام، آزاد تخلص تھا۔ بنارس کے ایک مشہور محلہ کوچہ، شکہ قند میں رہتے تھے۔ بنارس کے رؤسا میں ان کا شمار ہوتا تھا وراثت میں بڑی زمینداری ہاتھ لگی تو زندگی عیش و آرام کا گہوارہ بن گئی۔ بڑے ہی انسان دوست اور نیک خصلت تھے دوستوں کا جمگھٹا ہر وقت گھر پر رہتا تھا۔ خود شعر کہتے اور دوسروں کی بھی ہمت افزائی کرتے۔ سنۂ پیدائش تو کسی کو پتہ نہیں بلکہ محشر بنارسی کی معلومات کی روشنی میں 1910 سنۂ وفات ضرور ملتا ہے۔ ان کا کلام بے حد سنجیدہ و عام فہم ہے زبان بے حد سلیس اور الفاظ سادہ ہیں۔ بطور نمونہ

کوئی پردہ نشیں آتا ہے دل میں
غم وحسرت نکل جاؤ یہاں سے
ہوا آزاد کیا جو ہر گھڑی خاموش رہتے ہو
کہ خود بت بن گئے تم ان بتوں کی آشنائی میں

4 **بسمل بنارسی منشی کالندی پرشاد** نام، بسمل تخلص تھا۔ بنارس کے مشہور سری واستو خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ انھوں نے کوئنس کالج بنارس سے میٹرک کیا۔ 1866 تا 1889 کائستھ پاٹھ شالہ الہ آباد میں ہیڈ ماسٹر رہے بعد میں مہاراجہ بنارس کے یہاں دیوان نظامت کے فرائض انجام دیے۔ 1893 تا 1930 الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کی۔ ایک ٹیچر ایک وکیل اور ایک ایڈمنسٹر کی حیثیت سے بہت کامیاب مانے جاتے ہیں آپ کے اخلاق بہت بلند تھے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے، حسن سلوک ایسا کرتے تھے کہ لوگ آپ کے گرویدہ ہوجاتے تھے۔ فارسی اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی

> ”
> بنارس میں بڑی تعداد میں غیر مسلم شعرا ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے انسان دوستی کا سبق پڑھایا، جن میں پنڈت دیارام عاشق بنارسی، کشن نرائن کھتری بیتاب بنارسی، بھولا ناتھ فلک بنارسی منشی ٹھاکر بنارسی پرشاد اختر بنارسی، منشی گلاب چند سری واستو ناداں بنارسی اور شیو مورت لال قیس بنارسی کے نام سنہرے حروف میں جلوہ گر ہیں۔
> “

میں بھی اچھی مہارت تھی جس سے اردو کو بڑا فائدہ ہوا۔ آپ کے خیالات پاکیزہ اور اشعار بلند پایہ کے ہیں۔

یہ درد دل نہ نکلے گا کبھی آہ و فغاں ہوکر
میں جیسا ہوں تیرے غم میں ستم گر بے زباں ہوکر
مئے وحدت پیا ہوں پھر رہا ہوں مست و دیوانہ
وطن ہو یا بیاباں اب تو ہے ہر جا دیار اپنا

5 **بسیط: لالہ اندر سروپ نام**، بسیط تخلص تھا۔ آپ بنارس میں تحصیلدار تھے ان کی پیدائش اور وفات پر تذکرے خاموش ہیں صرف یادگار شعرا میں گلشن بے خزاں کے حوالے سے صرف اتنا لکھا ہے۔ 'بسیط نور اندو سروپ' یہ بنارس یا اس کے قریب تحصیلدار ہیں۔ (ص 38)

6 **ذیدل: کملا پرشاد نام**، ذیدل تخلص تھا۔ بنارس کے مشہور شعرا میں آپ کا شمار ہوتا ہے ذہانت و ذکاوت کی کہانیاں آج بھی بنارس کے ادبی حلقوں میں بزرگوں کی زبانی سننے میں آجاتی ہیں مشہور زمانہ اخبار اور آواز خلق کے اکثر شماروں میں آپ کی غزلیں مل جاتی ہیں اسی اخبار کے یکم دسمبر 1908 کے شمارے سے آپ کی وفات کی تصدیق ان الفاظ میں ہوتی ہے۔ ”24 نومبر 1900 کو رائے کملا پرشاد صاحب ذیدل ادار فانی سے ملک جاودانی کو راہی ہوئے آواز خلق کے خاص قلمی معاون وعرصہ تک اس کے سب ایڈیٹر رہے“

آپ کا تخیل بہت بلند تھا لہٰذا کلام میں پختگی پائی جاتی ہے۔ زبان میں سادگی و سلاست کے دریا بہتے نظر آتے ہیں۔ جوان کو ایک خوش فکر شاعر بنا دیتے ہیں۔

اے کارساز ہم کو یہ توفیق کر عطا
غافل نہ بھول کر ہوں، تیری بندگی سے ہم
ہم کریں جان فدا، آپ نہ کچھ قدر کریں
تم ہمیں جان گئے، ہم تمھیں پہچان گئے

7 **راجہ: بلوان سنگھ نام**۔ راجہ تخلص تھا۔ مہاراجہ بنارس کا خاندان اپنی علم دوستی اور ادب نوازی کے لیے مشہور تھا اس خاندان نے اردو کو کئی بلند پایہ شاعر عطا کیے جن میں مہاراجہ بلوان سنگھ، راجہ چیت سنگھ کی اولاد میں سے تھے شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ راجہ اردو شعر کہنے پر فنکارانہ مہارت رکھتے تھے اردو کے اشعار نہایت ہی عمدہ اور پر اثر انداز سے کہے۔ اپنا ابتدائی کلام مرزا حاتم علی بیگ مہر کو دکھایا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور اصلاح کی۔ جس سے ان کے کلام میں جلا پیدا ہوئی۔ کلام میں نکھار آیا آپ صاحب دیوان شاعر ہیں۔ مگر دیوان نایاب ہے رسائل و جرائد میں چھپی غزلیں امانت ہیں جن پر اکتفا کرنا پڑے گا۔

دل پہ صدمہ ہو کہ جاں پر اذیت راجہ
آنے پائے نہ مگر حرف شکایت لب پر

ان کے مشہور خمسہ کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

تھی خراب آہ، ابتدا کیسے
پر ہوئی خراب انتہا کیسے
ہوگئی پاؤں تک رسا کیسے
مٹ گئی شکل نقش پا کیسے

بس گئی چال پر حنا کیسے

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زبان عام فہم سادہ اور صاف وشفاف ہے پروازِ تخیل بلند ہے جس سے کلام پراثر نظر آتا ہے کیا خوب کہتے ہیں۔

مرنے کا تو کچھ غم نہیں پر غم ہے یہ رلجہ
مہمان ہے دردِ جگری اور کوئی دم

ان کی شاعری بلند پایہ ہے جو اتنا وقت گزر جانے کے باوجود آج بھی دلوں پر راج کرتی ہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اردو ادب کے لیے وقف کردی تھی۔ وہ بڑے بڑے مشاعرے کرتے تھے۔ انھوں نے اپنا دیوان 'گل ریاض' کے نام سے 1854 میں بمقام آگرہ سے شائع کیا تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے وہ قیام آگرہ کے دوران بھی شاعری کرتے رہے۔ 'ترچندریکا' نام کی کتاب بھی ان کی یادگار ہے مگر افسوس صد افسوس آج سب نایاب ہے۔

8 **رسا: بھارتیندو بابو ہریش چندر نام تھا، رسا تخلص** اختیار کیا 9 ستمبر بروز پیر 1850 کو اس مقدس شہر بنارس میں ایک ایسا چاند طلوع ہوا جس کو ادبی دنیا نے بھارتیندو ہریش چندر کے نام سے جانا۔ ان کے والد بابو گوپال چندر عرف گردھر رائے شہر کے باحیثیت اور ذی شعور انسان تھے وہ ہندی، سنسکرت، بنگلہ اور اردو کے عالم مانے جاتے ہیں۔ برج بھاشا میں شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کا گھر علمی وادبی محفلوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ بھارتیندو نے ایسے ادبی ماحول میں شعور کی آنکھ کھولی۔ صرف پانچ سال کی عمر میں پہلا دوہا کہا اور والد سے شاباشی حاصل کی۔ ان کی بھی سنسکرت کے ساتھ ساتھ، عربی، فارسی اردو اور بنگالی کی باقاعدہ تعلیم کے ساتھ صحت مند تربیت ہوئی جس نے ان کی فکر کو وسعت عطا کی انھوں نے اپنی تخلیق کی ابتدا اردو غزل سے کی یہ بڑی اہم بات ہے۔

رسا کی اردو کی پہلی کتاب 1867 میں گلدستہ نام سے منظر عام پر آئی۔ اس وقت اردو شاعری اور غزل کا طوطی بول رہا تھا۔ اردو کی شیرینی اور غزل کی مقبولیت نے انھیں ایسا متاثر کیا کہ وہ اردو میں غزلیں کہنے لگے۔ بالکل اسی روایتی انداز میں جیسے میر اور غالب نے کہی تھیں۔ بعد میں ہندی کے سنہرے مستقبل کو دیکھ کر اس کی طرف توجہ کی لیکن ہندی کو اپنے گلے کا ہار بنانے کے باوجود اردو سے انکی دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ وہ دیوناگری میں بھی اردو ہی لکھتے تھے کیا خوب کہتے ہیں۔

خدا ملے تو ملے آشنا نہیں ملتا
کسی کا کوئی نہیں دوست سب کہانی ہے
شب جدائی کا صدمہ نہیں سہا جاتا
حرام موت نہ ہوتی تو زہر کھا جاتا

رسا اپنی سرمستی اور سرشاری کے باوجود حالات زمانہ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے غلامی کے احساس نے ہندوستانیوں کی جو حالت کردی تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اس کیفیت پر ان کے طنز سے بھرے بہترین شعر یہ ہیں۔

امرا جو کہے رات تو ہم چاند دکھا دیں
رہتا ہے سفارش سے بھرا جام ہمارا
کپڑا کسی کا، کھانا کہیں، سونا کسی جا
غیروں ہی سے ہے سارا سرانجام ہمارا

ان اشعار کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انھیں اردو الفاظ محاورات اور کہاوتوں پر قدرت حاصل تھی۔

رسا کی اردو کی پہلی کتاب 1867 میں گلدستہ نام سے منظر عام پر آئی۔ اس وقت اردو شاعری اور غزل کا طوطی بول رہا تھا۔ اردو کی شیرینی اور غزل کی مقبولیت نے انھیں ایسا متاثر کیا کہ وہ اردو میں غزلیں کہنے لگے۔ بالکل اسی روایتی انداز میں جیسے میر اور غالب نے کہی تھیں۔

دوسری طرف ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جن میں دہلوی رنگ جھلکتا ہے۔ یعنی ناپائیداری حیات کا تصور' غم پسندی' علامت نگاری' بندش کی چستی' سادگی اور موثر جذبات نگاری کی کلکاری ملتی ہے تو لکھنو کی رنگ کی آمیزش بھی نظر آتی ہے چونکہ بنارس وہ پناہ گاہ ہے جہاں دہلی اور لکھنؤ سے آنے والے شعرا نے چین وسکون کی سانس لی تھی اور اپنی شاعری کا جو رنگ جمایا تھا اس کا اثر بنارس کے شعرا پر بہت گہرا اثر پڑا۔ اور یہاں کے رنگ شاعری نے ایک نیا روپ لیا جس کو بنارسی رنگ سے تعبیر کرسکتے ہیں جس کی گنگا جمنی جھلک رسا کی شاعری میں نظر آتی ہے اور گنگا کی لہروں کی روانی دکھاتی ہے تو کبھی جمنا کے دھارے ان کی شاعری میں لہریں مارتے نظر آتے ہیں اور ان کی شاعری کو زندہ جاوید بنا دیتے ہیں جب تک اردو زندہ ہے اور شاعری کے آسمان پر بھارتیندو یعنی بھارت کا چاند جلوہ گر رہے گا جو بہت تھوڑے وقت کے لیے نمودار ہوا۔ اور پھر اصلی چاند کے مانند چھپ گیا۔ مگر پھر نکلتا ہے اور اپنی تابانی بکھیرتا رہتا ہے ایسے ہی صرف 34 چونتیس سال کے لیے آسمان شاعری پہ چاند نمودار ہوکر 6 جنوری 1885 کو نہ جانے کتنے ارمان اور تمنائیں لیے اس جہان فانی سے جہان جاودانی میں چلا گیا مگر اس کی چاندنی شاعری کے دامن میں آج بھی مسکرا رہی ہے۔

9 **شاد: ماسٹر شیوناتھ پرساد نام اور شاد تخلص تھا** یکم جنوری 1914 کو بنارس میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام دودھ ناتھ ورما تھا کائستھ خاندان سے تعلق ہونے کی وجہ سے ابتدائی تعلیم اردو فارسی سے ہوئی بعد میں انگریزی بھی پڑھی۔ ایم اے اردو فارسی دونوں زبانوں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔ تاریخ میں آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا اس کے بعد بنارس کے مشہور ڈی اے وی انٹر کالج میں اردو کے لیکچرر ہوگئے۔ آپ کو اردو سے بہت عشق تھا، اکثر نئے نئے موضوعات پر اردو میں مضامین تحریر کیا کرتے تھے۔ شاعری کا فطری ذوق وشوق بھی تھا۔ غزل نظم اور قطعہ وغیرہ اخبار اور رسائل میں چھپتے تھے حالانکہ اپنا کلام چھپوانے سے ہمیشہ کتراتے تھے لیکن احباب کی ضد آڑے آجاتی، وہ فرمائش کرتے پھر ان کی ایک نہ چلتی۔ ان حضرات کے ہم احسان مند ہیں جن کی بدولت آج شاد کا کلام ہمیں پڑھنے کو مل جاتا ہے۔

مجھے نہ دولتِ دنیا کی اب ضرورت ہے
فقط اطاعتِ مولا کی ایک حسرت ہے

شاد کی طرز فکر بلند تھی اور وہ غضب کا حوصلہ رکھتے تھے زبان فارسی سے متاثر ہے آپ تعلیم وتدریس کے ساتھ ساتھ مختلف سماجی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے

تھے۔ انجمن ترقی اور اتر پردیش کے نائب صدر، آریہ سماج وارانسی کے صدر اور کاشی انا تھالیہ کے صدر تھے اردو کی ترقی اور فلاح کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ وہ بڑے سیدھے سادے ملنسار انسان تھے خوش اخلاق طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی زندگی بھر اس کا ساتھ نبھایا۔ 18 مئی 1974 کو بنارس میں ان کی وفات ہوئی۔ کاشی کا بیٹا یہیں گنگا کی لہروں کے سپرد ہوگیا۔

10 **شاکر: شیوناتھ نام، شاکر تخلص تھا۔** قصبہ رام نگر میں پیدا ہوئے آپ کے بڑے بھائی پنڈت دیارام اپنے دور کے ممتاز شاعر تھے۔ ان کا خاندان بنارس کے روسا میں گنا جاتا تھا جو دولت علم سے بھی سرفراز تھا۔ گھریلو ماحول بھی بہت ہی مہذب اور شائستہ تھا۔ دستورِ زمانہ کے مطابق ابتدائی تعلیم اردو اور فارسی میں حاصل کی۔ ساتھ ہی ہندی اور انگریزی پر بھی عبور حاصل تھا جس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ مہاراجہ بنارس کی انتظامیہ میں نظامت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

شاکر کو شعر و شاعری کا ذوق ابتدا ہی سے تھا مشاعروں میں شرکت ان کا اہم مشغلہ تھا۔ آپ کے گھریلو حالات دستیاب نہیں۔ دیوان بھی ضائع ہوگیا۔ مگر چند اشعار مل گئے۔

نہ آئے گا، اگر وہ راحت جاں
تو ہم باز آئیں گے جان حزیں سے
مجھے باہر نکال اے وحشتِ دل
کہ تنگ آیا ہوں میں چرخ زمیں سے

11 **شریف: شریف ونایک پرشاد نام، شریف تخلص** تھا آپ کی پیدائش شہر بنارس کے قریب کٹھولی ضلع میں 1849 میں ہوئی۔ کائستھ گھرانے میں آنکھیں کھولنے کے سبب آپ کو اردو فارسی کی تعلیم دلائی گئی۔ مہاراجہ بنارس کی ملازمت اختیار کرلی۔ تقریباً پینتالس 45 سال تک اس فریضے کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا پھر پینشن لے لی۔ شعر و شاعری کا ذوق ایسا حاوی تھا کہ طالب علمی کے زمانے ہی سے شعر کہنے لگے تھے مذہبی انسان تھے فقیروں جیسا لباس پسند کرتے تھے مگر اشعار بلند پایۂ کے کہتے تھے۔ آوازِ خلق میں 1902 تا 1911 آپ کا کلام چھپتا رہا۔ لوگ لطف اندوز ہوتے رہے۔

12 **عاشق: شیوشنکر پرشاد نام، عاشق تخلص تھا۔** ان کے دادا کا نام منشی ہراتی لال تھا والد کا لکا پرشاد تھے۔ انکے دادا باپ دونوں مہاراجہ کے ملازم تھے اردو فارسی کی تعلیم آپ نے اپنے والد سے حاصل کی رام نگر میں رہتے تھے آج بھی آپ کے خاندان کے لوگ وہاں موجود ہیں انکے گھر میں شعر و شاعری کا بہت چرچہ تھا جس نے ان کے ذوقِ شاعری کو بھی جلا بخشی عاشق بڑے ذہین اور خوش مزاج انسان تھے اکثر مشاعروں میں شامل ہوتے تھے غزل بہت اچھی کہتے تھے اور 'آوازِ خلق' میں شائع ہوتے رہتے تھے آپ کی غزلوں کے اشعار عمدہ الفاظ سادہ اور عام فہم ہیں۔ خیالات بڑے پاکیزہ ہیں جذبات میں گہرائی ہے چند شعر۔

دیکھ کر میرا جنازہ وہ ستم گر بولا
روٹھ جاتے ہیں ذرا ان کو منائے کوئی
تن لاغر میں گو اب صرف جانِ زار باقی ہے
تمنا وصل کی تیرے اے میرے یار باقی ہے

6 ستمبر 1904 کے ایک اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ عاشق نے ترپولیہ رام نگر بنارس سے ایک رسالہ 1904 میں نکالا تھا۔ جس کا اشتہار اس طرح ہے:

''مسٹر عاشق رام نگری کے اہتمام میں ایک گلدستہ صبح بنارس نامی اکتوبر سے شائع ہوگا۔ نومبر 1904 کے شمارے سے معلوم ہوتا ہے کہ گلدستہ صبح بنارس بہ اہتمام منشی شیوشنکر پرشاد ورما کے شائع ہونا شروع ہوگیا۔''

13 **فضا: سنکٹھا پرشاد نام، فضا تخلص تھا۔** آپ کا تعلق کھتری گھرانے سے ہے جن کا شمار شہر کے بڑے روسا میں ہوتا ہے۔ تجارت کرتے تھے آپ بیتاب بنارسی کے شاگرد تھے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔

14 **ملک: بھولا ناتھ نام، ملک تخلص تھا** بنارس کے روسا میں شمار ہوتا تھا حسب دستور ابتدائی تعلیم عربی و فارسی میں حاصل کی۔ ان کا گھرانہ علم و ادب کا گہوارہ تھا جس کا اثر ان کے دل و دماغ پر بھی گہرا پڑا اور شعر و شاعری کی طرف رجحان بڑھا۔ مشاعروں میں بڑی شان شوکت سے شرکت کرتے تھے نولکشور پریس لکھنؤ میں ملازمت کرتے تھے آخری عمر میں بنارس آگئے اور نیپال سرکار کی ملازمت اختیار کی۔ بڑے ہی ذہین خوش اخلاق، خوش مزاج انسان تھے اشعار اعلیٰ درجہ کے کہتے تھے۔

رند ہوں بعد فنا ملی جو دنیا مجھ کو
مے ملا لیجیو اے اہلِ وطن پانی میں

جہاں میں اس خالقِ جہاں کا ظہور جلوہ گری یہ سب ہے
وہ ذاتِ واحد ہے، پر ہے ہر جا فلک کے اوپر زمیں کے نیچے

ملک نے یہیں 1905 میں اس دیارِ فانی کو خیر آباد کہا۔

15 **قیس: شیومورت لال نام قیس تخلص تھا۔** آپ کی پیدائش 10 جون 1903 میں بنارس کے مشہور محلہ پیڑی میں ہوئی۔ آپ کے والد گنپت سہائے نہایت ذہین اور سنجیدہ انسان تھے گھر میں ادبی فضائیں تھیں لہٰذا گھر پر ہی اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ہندی انگریزی بھی پڑھی۔ ابتدائی دور میں منشی شاہ سرن صوفی بنارسی سے اصلاح لی آپ کو مشاعروں میں شرکت کا بے حد شوق تھا۔ غزل میں خاص طور سے طبع آزمائی کی اشعار بلند پایہ اور عمدہ ہیں۔ بعد میں رحمت اللہ رحمت سے بھی تلمذ فیض اٹھایا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مقدر ہمارا، لکیریں تمھاری
جو چاہو بناؤ، جو چاہو مٹاؤ
تم شبِ غم میں ہمیں آکے پکارا نہ کرو
یہ بھی کٹ جائے گی، تکلیف گوارا نہ کرو
برستی ہے مستی، چھلکتا ہے ساغر
وہ کیفِ مجسم، جہاں ہوکے نکلے

16 **کامل: پیارے لعل سریواستو نام، کامل تخلص تھا** ان کی پیدائش محلہ اورنگ آباد میں 1898 میں ہوئی والد منشی تارا پرشاد ایک نامور وکیل تھے بنارس کے روسا میں شمار ہوتے تھے۔ کامل کی ابتدائی تعلیم اردو فارسی اور ہندی کی گھر پر ہوئی تھی اس کے بعد انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہوکر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ گھر میں ادب کا بول بالا تھا جس کا اثر ان کے ذہن پر بھی پڑا اور شعر کہنے لگے۔ فائز بنارسی جیسے استاد شاعر سے اصلاح لی۔ آپ بہت ہی منکسر المزاج، ادب نواز اور خوش طبع بھی تھے آپ صاحب دیوان شاعر ہیں افسوس دیوان شائع نہیں ہوا۔ آپ کے اشعار عمدہ ہیں۔ زبان سادہ سلیس ہے۔ چند اشعار۔

پلکوں پہ بے قرار ستاروں سی ہے چمک
ان کو بھی بے قرار بنانے لگا ہوں میں

ان اشعار سے ان کی اعلیٰ ذوق شاعری کا اندازہ ہوتا ہے ایک مدت تک آپ اسپیشل مجسٹریٹ درجہ اول بھی رہے۔ ادبی وسماجی دونوں میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دے کر آپ نے 1958 میں اس دارفانی سے کوچ کر مالکِ حقیقی سے جاملے۔

17 **کنور: چکرورتی سنگھ نام، کنور تخلص تھا۔** مہاراجہ بلوان سنگھ کے بیٹے تھے جو خود بہت اچھے شاعر تھے ادبی

مشتاق بے حد منکسر المزاج اور علم دوست تھے شعرا کی بڑی قدر کرتے تھے مشاعروں میں شرکت اپنا فرض سمجھتے تھے آپ کی ذات مقدس سے بنارس کی بزم شاعری مدتوں تک زندگی اور زندہ دلی کے چراغوں سے منور رہی۔ آپ کے اشعار عمدہ اور اعلیٰ معیار کے ہیں زبان سدھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

ذوق آپ کو ورثہ میں ملا تھا۔ مہاراجہ بنارس کا خاندان علم دوستی اور ادب پروری کے لیے بہت آگے تھا ان کے دربار سے اردو شعرا اور ادبا کو وظائف ملتے اس طرح ان کی حوصلہ افزائی ہوتی۔ ایسے ماحول میں چکروتی کی شاعرانہ صلاحیتوں کو نمو ملا وہ اچھے اشعار کہنے لگے بطور نمونہ

صدمے شب فرقت کے اٹھائے ہیں برابر
اے جانِ جہاں دل کوئی لائے یہ کہاں سے
اللہ کرے خیر کنور دل کو ہماری
ان روزوں ہے پھر سامنا اس آفتِ جاں سے

18 مشتاق: جگن ناتھ پرشاد نام، مشتاق تخلص تھا۔ ان کی پیدائش بنارس کے مقتدر کائستھ گھرانے میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اردو فارسی اور ہندی میں ہوئی یہ خاندان بھی علم وادب کی شمع سے منور تھا جس کا اثر مشتاق کے دل ودماغ پر گہرا پڑا۔ شعر وشاعری سے لگاؤ قدرتی تھا۔ لہٰذا اپنے دور کے مشہور شاعر آفاق بنارسی کے شاگرد بن گئے اور اصلاح لینے لگے۔

مشتاق بے حد منکسر المزاج اور علم دوست تھے شعرا کی بڑی قدر کرتے تھے مشاعروں میں شرکت اپنا فرض سمجھتے تھے آپ کی ذات مقدس سے بنارس کی بزم شاعری مدتوں تک زندگی اور زندہ دلی کے چراغوں سے منور رہی۔ آپ کے اشعار عمدہ اور اعلیٰ معیار کے ہیں زبان سدھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بطور نمونہ

غور سے دیکھا تو اے مشتاق یہ ثابت ہوا
کوئی بھی اپنا نہ تھا، جو تھا یہاں بیگانہ تھا

19 معروف: بلدیو سنگھ نام، معروف تخلص اختیار کیا۔ گوتم خاندان سے تعلق تھا بنارس کے روسا میں شمار تھا۔ عربی وفارسی زبان کے بلند پایہ استاد شاعر تھے۔ شعر وشاعری سے بے حد لگاؤ تھا ابتدا میں صدر الدین محمد خاں وحید کو اپنا کلام دکھایا۔ پھر ذاکر بنارسی کی شاگردی اختیار کی آپ بے حد ملنسار تھے۔ افسوس کہ ان کے اشعار دستیاب نہ ہو سکے۔

20 ناداں: گلاب چند نام، ناداں تخلص تھا آپ کے آبا واجداد جونپور سے تعلق رکھتے تھے۔ دادا بنارس آکر بس گئے۔ والد منی لال تھے۔ ناداں کی پیدائش 22 مئی 1880 کو بنارس میں ہوئی۔ منشی لال نے بیٹے کی تعلیم کا خاص انتظام کیا اور فارسی کی تعلیم خاص طور پر دلوائی۔ اس کے بعد 11 برس کی عمر میں انگریزی تعلیم کے لیے 1891 میں موجودہ کوئنس کالج میں داخل کرا دیا۔ ان کے پوتے رادھے کرشن آنند کے مطابق یہ بات سامنے آئی ہے کہ ان کو اردو عربی فارسی، انگریزی اور ہندی پر پورا عبور حاصل تھا۔ 1898 میں جبکہ زیر تعلیم تھے اخباروں کے لیے نامہ نگاری شروع کر دی تھی۔ اور ہندوستان کے مختلف انگریزی اخبارات میں آپ کے مضامین شائع ہوئے۔ 28 مئی 1900 میں آپ اخبار 'انڈین اپیل' کے سب ایڈیٹر ہوئے یہیں سے صحافت کا آغاز ہوا۔ مختلف اخبارات میں کام کرنے کے بعد یکم افروری 1902 میں اپنے ذاتی مطبع 'صبح بنارس' کی بنیاد رکھی اور اخبار 'آوازۂ خلق' نکالا۔ دسمبر 1909 میں اپنی علالت کے باوجود دوسرا ہندی رسالہ 'دیہاتی' جاری کیا۔

21 واصل: امبیکا پرشاد سنہا نام، واصل تخلص تھا۔ 16 ستمبر 1876 میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ رامیشور پال سنہا والد تھے۔ ان کا گھر علم وادب کا گہوارہ تھا 'اردو' ہندی فارسی کے علاوہ انگریزی اور بنگلہ بھی بخوبی جانتے تھے آپ نے ڈرامے بھی لکھے مگر نایاب ہیں فخر کی بات یہ ہے ڈاکٹر سمپورنانند کے حقیقی ماموں تھے۔ ان کا کلام بھی نایاب ہے مگر جو ملتا ہے اس میں تغزل کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ آپ کا تخیل بلند اور زبان سادہ ہے یہی آپ کی مقبولیت کا راز ہے چند اشعار

نہیں کچھ دین ودنیا سے ہمیں مطلب سن اے واعظ
ہم آزادوں کا بے ساغر گذارا ہو نہیں سکتا
میری آہ وفغاں کی قدر ہو کچھ یا نہ ہو پھر بھی
مگر دل بر کو درد دل سنایا ہی تو جاتا ہے

22 ہمسر: جگدما پرشاد نام، ہمسر تخلص تھا۔ آپ کے والد کا نام گنگا پرشاد تھا۔ فروری 1924 میں ہمسر کی پیدائش بنارس میں ہوئی۔ آپ کے والد کا شمار روسائے بنارس میں ہوتا تھا۔ پھر شاعری تو اس وقت کے روسا کا 'مشغلۂ دل لگی' ہوا کرتی تھی۔ شعر وشاعری کی گھن گرج ان کے گھر کی فضاؤں میں بھی گونج رہی تھی لہٰذا وہ بھی قیس بنارسی کی شاگردی میں اپنے ذوق شعر وسخن کی تشفی کرنے لگے۔ بے فکری کا زمانہ تھا اوپر والے نے ہر چیز سے نوازا تھا۔ اردو فارسی کے علاوہ انگریزی کی صلاحیت بھی رکھتے تھے ذوق میں پاکیزگی اور تخیل میں بلندی آگئی۔ آپ بڑے ادب نواز انسان تھے ادب سے دلچسپی مشاعروں کی محفل تک لے گئی۔ خوش مزاجی ان کی طبیعت میں رچی بسی تھی۔ جس کی جھلک اشعار میں نظر آتی ہے۔

کیوں مسکرا رہے ہیں ستارے فلک پہ آج
کیا اب سحر نہ ہوگی شبِ انتظار کی
دو دن بہار باغ میں رہ کر چلی گئی
پھولوں کے ساتھ کھیل کے پچھتا رہا ہوں میں
ساحل پہ کھڑے وہ طوفاں کا کیا خاک نظارہ کرتے ہیں
ہم ڈوب کے مرنا ساحل کے نزدیک گوارہ کرتے ہیں

زبان وادب سے محبت کرنے والا یہ انسان 1954 میں ہم سب کو چھوڑ کر چلا گیا۔

روشن لال روشن بنارسی کے علاوہ بھی کئی نام ہیں مگر اس چھوٹے سے مضمون میں مزید تفصیل کی گنجائش نہیں۔ مقام مسرت ہے کہ بنارس میں اردو کا پودا پروان چڑھ رہا ہے۔ اور نئی نسل اس کی آبیاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہے ہمارے لیے یہی مقام مسرت اور مستقل کی کرن ہے۔

■

Rifat Jamal
311, Amrosia Apartment
Lanka Varanasi- 221005 (UP)
humaparveen652@gmail.com

اردو کے غیر مسلم مثنوی نگار

محمد شارب

مثنوی ایک جامع، بلیغ ووسیع اور کامل صنف سخن ہے۔ اس کا مضمون مسلسل اور بیان مربوط ہوتا ہے لیکن ہر شعر جدا ہوتا ہے اس لیے اس میں لچک کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس میں شاعر کو جذبات نگاری اور واقعہ نگاری کا ایک وسیع میدان ملتا ہے جس میں وہ اپنی شاعری کے جوہر دکھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی شاہکار شاعری ہر زبان میں مثنوی میں موجود ہے۔

مثنوی کی ابتدا فارسی سے ہوئی اور فارسی کی پہلی مثنوی کلیلہ ودمنہ ہے جو رودکی نے 320ھ/932ء میں لکھی اور اس کا قصہ عربی زبان سے ماخوذ تھا۔ اس کے بعد یہ صنف سرد پڑ گئی اور امیر خسرو کی 'مطلع الانوار' 698ھ 1299ء تک صرف نظامی کی مخزن الاسرار اور چند مثنویاں قابل قبول رہیں۔ خسرو کے بعد جب اردو میں مثنوی لکھنے کا رواج ہوا تو اسے عروج حاصل ہوا۔ نصیرالدین ہاشمی نے 'دکن میں اردو' میں نظامی بیدری کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کو پہلی مثنوی قرار دیا ہے۔ اس سے قبل ایک عرصے تک وجدی کی تحفہ عاشقاں، خوب محمد چشتی کی خوب ترنگ، قطبن کی مرگاوتی کو اردو کی اولین مثنویاں سمجھا جاتا رہا ہے۔

اردو مثنوی سب سے پہلے کس غیر مسلم شاعر نے لکھی اس کا حتمی جواب ملنا مشکل ہے البتہ بیجاپور میں علی عادل شاہی خاندان کے آخری چشم و چراغ سکندر شاہ کے عہد میں ایک ہندو شاعر رام راؤ کا ذکر ملتا ہے جس کا تخلص سیوا ہے۔ نصیرالدین ہاشمی نے اسے واقعات کربلا کی مثنوی کا خالق بتایا ہے۔ یہ مثنوی اب نایاب ہے۔ رام راؤ گلبرگہ کا رہنے والا تھا اور بیجاپور میں مقیم تھا۔ وہ علی عادل شاہ ثانی کا معاصر تھا اور اس نے 1683ء میں روضۃ الشہدا کا منظوم ترجمہ کیا۔ قدرت اللہ قاسم نے درد کے ایک شاگرد منشی لچھمن لال کا ذکر کیا ہے جس نے 'بہار دانش' کا ترجمہ کیا ہے۔

ہم اس مقالے میں پہلے ان یورپی شعرا کے کلام پر نظر ڈالیں گے، بعد ازاں ہندو شعرا کی مثنویوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان مذہبی کتابوں کے تراجم کا ذکر کریں گے جو مثنوی کی شکل میں لکھی گئی ہیں۔

جارج سوم اور جارج چہارم کے زمانے میں ایک شاعر فراسو نام کا گزرا ہے۔ اس کا نام فرنسس گائیلیب کوئن اور فراسو تخلص تھا۔ والد کا نام جان آگسٹین گوبیلب کوین تھا۔ اس کی زندگی آسودگی سے بھری تھی۔ اس کی تربیت ایک ایسے ماحول میں ہوئی جہاں فارسی اور اردو کی حکمرانی تھی۔ شعر وشاعری کے چرچے تھے۔ ان کے سرپرست ظفریاب خان اردو کے شاعر تھے۔ شیفتہ نے اسے دل سوز کا شاگرد لکھا ہے۔ فراسو کو شاعری سے اس قدر لگاؤ تھا کہ اس نے نہ صرف غزلیات اور مثنوی تصنیف کی بلکہ منظوم خطوط بھی لکھے۔ احباب کے نام ان کے منظوم خطوط دستیاب ہوئے ہیں۔ ایک کلیات یادگار ہے جو طبع نہ ہو سکا، البتہ حسرت نے ان کے کلام کا انتخاب شائع کیا تھا۔ ان کی ایک مثنوی 'عشق افزا' ہے۔ اس میں بسم اللہ کے بجائے 'روح القدس' درج ہے۔ اس کے بعد حمد باری تعالیٰ اور پھر تیس اشعار پر مشتمل ایک نعت حضرت عیسیٰ روح اللہ کے نام سے درج ہے۔ بعد ازاں شاہ کشور لندن کی مدح ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور نظم 'در وصف عشق' کے عنوان سے ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

شہر دہلی یوں ہے ہندوستان میں
جیسے ہو رنگیں چمن بستان میں
اس کا اس رونق پہ ہر بازار ہے
جیوں نمو اک تختۂ گلزار ہے
بیچ میں بازار کے اک نہر ہے
آب کوثر کی سی جس میں لہر ہے
مالنیں سب ان درختوں کے تلے
بیٹھی ہیں پھولوں کے ہاروں کو لیے

شور یورپ کے شعرائے اردو میں سب سے زیادہ مشہور و معروف ہیں۔ نام جارج پیش اور تخلص شور تھا۔ اس کی پیدائش 1823 میں ضلع علی گڑھ کے مقام کوئل میں ہوئی تھی۔ والدین مستقل طور پر وہاں قیام پذیر تھے۔ والد فرانسیسی اور والدہ جرمن تھیں۔ صاحب طبقات الشعرا کریم الدین نے لکھا ہے کہ غدر سے چالیس سال قبل ان کے اجداد نواح دہلی میں آباد ہوئے اور والد ملازمت کے سلسلے میں علی گڑھ آئے۔ شور نے چھ دواوین، ایک مثنوی اور ایک بیاض یادگار چھوڑی ہے۔ اسے اپنی شاعری پر فخر تھا۔ لکھتا ہے۔

کر کے خوں خشک یہ اشعار کیے ہیں پیدا
تا کہ اے شور مرے بعد یہ اولاد رہے

شور کے زمانے میں اہل مغرب مشرق کے رنگ میں رنگ جانے کو باعث فضیلت سمجھتے تھے۔ اس وقت مغرب کی اندھی تقلید شروع نہیں ہوئی تھی۔ رسم و رواج، بود و باش، طرز معاشرت، لباس اور فیشن کے معاملے میں مشرقی اقدار کا اعتبار قائم تھا۔ شور اپنی وضع قطع کے

لحاظ سے مسلمان دکھائی دیتے تھے۔ کلام پر مرزا رحیم بیگ میرٹھی سے اصلاح لیتے تھے۔ بعد میں قطب الدین مشیر دہلوی اور ان کے بیٹے غلام دستگیر مبین سے اصلاح لے کر مرتبہ استاذ حاصل کیا۔ دیوان شور میں غزلیں قطعہ، رباعیاں، سہرا، تضمین اور مثنوی موجود ہیں۔ مشاہیر دہلی کے نام لکھی گئی ایک مثنوی سے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

تھے شعرا بھی دہلی میں وہ بے مثال
کہ تھا شعر گوئی میں ان کا کمال
ہوئے نامور ایسے تھے ایک میر
کہ دیوان ان کے ہیں چھ بے نظیر
ہوئے میر حسن اور دہلی میں ایک
کہ سو میں تھے وہ ایک ہی مرد نیک
کہی مثنوی خوب وہ انتخاب
نہیں ہند میں پایا اس کا جواب
اور ایک نامی گرامی تھے شاہ نصیر
کہ جوں مہر و ماہ تھے وہ روشن ضمیر
فراسو بھی شاگرد ان کے ہوئے
تھے قوم فرنگی میں شاعر بڑے

اردو میں آزاد کا نام آب حیات کی وجہ سے مشہور ہے لیکن یہاں جن آزاد کا تذکرہ کیا جا رہا ہے ان کا نام منشی بوڑامل اور تخلص آزاد تھا۔ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے یسوع مسیح کی شان میں حمد، نعت اور ثنا لکھی ہے جو مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ صنائع بدائع کا استعمال بھی خوب کیا ہے۔ ایک مثنوی میں مریض کو مسیح کے ہاتھ سے شفا پانے کے واقعے کو اس طرح رقم کیا ہے۔

ایک محتاج پُر ز رنج و بلا
مبتلا و مریض استسقا
بھوکوں مرتا تھا وہ بہ ناداری
تھا شکم پُر مگر ز بیماری
پیٹ پھولا تھا مثل نقارہ
عازم کوچ تھا وہ آوارہ
پانی کیا اپنا خون پیتا تھا
انتظار اجل میں جیتا تھا

ڈی ایچ ہیرئین قربان مرادآبادی نے الہ آباد سے منشی کامل فارسی اور اعلیٰ قابلیت اردو کے امتحانات پاس کیے۔ تعلیم کے دوران شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اور 1938 سے باقاعدہ شعر کہنے لگے تھے۔ ابتدا میں حکیم محبوب علی خان اختر فیروزآبادی کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ بعد میں منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی سے فخر تلمذ حاصل کیا۔ انھوں نے نثر میں شیکسپیئر کی کہانیوں کا ترجمہ کیا۔ انھوں نے غزلوں اور نظموں کے علاوہ ایک مثنوی 'داستان عجب' کے نام سے لکھی۔

پنڈت امرناتھ ہالو آشفتہ ایک کشمیری برہمن تھے۔ یہ اپنے عہد کے مشہور غزل گو شاعر تھے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر غزل گو شاعر کی حیثیت سے کیا ہے لیکن ان کی مثنوی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ انھوں نے اپنی مثنوی 'گلشن ہفت رنگ' میں حاتم طائی کا قصہ نظم کیا ہے۔ یہ دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا حمد سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد مناجات، سبب تصنیف، بیان سخن اور

پنڈت امرناتھ ہالو آشفتہ ایک کشمیری برہمن تھے۔ یہ اپنے عہد کے مشہور غزل گو شاعر تھے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر غزل گو شاعر کی حیثیت سے کیا ہے لیکن ان کی مثنوی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔

توصیف استاد ہے۔ اصل قصہ حاتم طائی کے اپنے وطن سے رخصت ہونے پر ختم ہو جاتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

عجب پُر فضا گلشن لالہ زار
وہ دلی کہ دل ہائے باغ و بہار
مصفا در و بام، رنگیں تمام
ہر اک خشت پر لاجوردی کا کام
وہ رستہ، وہ بازار رشک قصور
دکانیں برابر کہ بین السطور
وہ نہر ایسی بازار کے درمیاں
فلک پر ہو جیسے خط کہکشاں

منشی امیر بریلی کے رہنے والے خوش گو شاعر تھے۔ انھوں نے کتھا ست نرائن کے نام سے ایک مثنوی لکھی جو ساڑھے چار سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی کی زبان شستہ اور انداز بیان پاکیزہ ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

اسی کی ہر طرف جلوہ گری ہے
کہیں زہرہ، کہیں وہ مشتری ہے
جدا ہے سب سے لیکن ہے ہر اک جا
دوئی سے دور ہے، یکتا ہے یکتا
بیاں کیا کر سکے یہ پیکر خاک
بجز اس کے کہ ہے وہ ایزد پاک

آیئے اب ان شاہ کار فن پاروں پر نظر ڈالتے ہیں تو جو اپنی فصیح زبان اور سادہ بیان کے لیے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان میں رامائن، مہابھارت اور گیتا کے منظوم ترجمے شامل ہیں۔ رامائن کا سب سے پہلا منظوم ترجمہ مثنوی کی شکل میں منشی جگن ناتھ لال خوشتر لکھنوی نے 1852 میں کیا۔ اودھ سے رام اور لچھمن کے رخصت ہوتے وقت بادشاہ کی حالت زار کا قصہ، فضا اور ماحول کی سوگواری کی تصویر ملاحظہ ہو۔

کیا غم سے سحر نے پیرہن پاک
اڑائی سر پہ اپنے شام نے خاک
جہاں گریاں تھا سب آہ و فغاں سے
فرشتے گل فشاں تھے آسماں سے
زمیں پر شاہ تھا اس طرح بیتاب
کہ ہو جس طرح سے آتش پہ سیماب

1867 میں منشی شنکر دیال فرحت لکھنوی نے لکھنوی انداز میں رامائن کو پیش کیا۔ اس میں فصاحت کے ساتھ صنائع بدائع بھی ملتے ہیں۔ الفاظ بھی پُر شکوہ ہیں اور انداز بیان بھی باحشمت ہے۔ رام چندر جی کی شان سپہ گری کے ترجمے میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

قریب قوس پہنچے جب سری رام
قدم سے دامن غرا لیا تھام
دھنک کو توڑ پھینکا جب زمیں پر
اندھیرا چھا گیا عرش بریں پر
ہوئے آثار محشر مچ گیا شور
چھپے گوشوں میں مرغ و ماہی و مور

1880 میں منشی بانکے لال بہاری بہار دہلوی نے رامائن کا تیسرا ترجمہ کیا۔ اس مثنوی سے شاعر کی ذہانت و فطانت اور جولانی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کے مضمون کو شعر میں پیش کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔

بہار کی یہ مثنوی سلیس زبان میں لکھی گئی ہے لیکن اس میں وہ شاعرانہ حسن و جمال موجود نہیں ہے جو اس سے قبل خوشتر کی مثنوی میں نظر آتا ہے۔ اس میں وہ لطف بھی موجود نہیں ہے جو فرحت کی رامائن میں ہے۔

ویاس نے مہابھارت نام کی ایک شہرۂ آفاق مثنوی

بھی 500 ق م میں تصنیف کی۔ اب تک ہر بڑی زبان میں اس کا ترجمہ کیا جاچکا ہے۔ ہندوستان میں فیضی نے اس کا ترجمہ فارسی نثر میں کیا تھا۔ بنگالی میں کیشو رام مترا نے اور انگلش میں مرنوداس نے اس کا نثری ترجمہ کیا۔ البتہ شاعری میں اس کا پہلا ترجمہ منشی طوطا رام شایاں لکھنوی نے کیا۔ شایاں کی مثنوی 'مہابھارت' میں شاعرانہ جوش وخروش اور زمزمہ اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ کارفرما ہے۔ شایاں نے یہ ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ اگر لوگ اس کو ترجمہ نہ کہہ کر طبع زاد کہتے تو اس سے کوئی انکار نہ کرسکتا تھا۔ انھیں اپنے فن پر بھروسہ تھا۔ لکھتے ہیں۔

فن شاعری میں سر افراز ہوں
تخلص سے شایاں کے ممتاز ہوں
خدا نے کیا علم سے بہر ور
بنا فیض سے اس کے صاحب ہنر
کیے ہیں نئے طبع موزوں نے کام
کہ دلچسپ و شیریں ہے اپنا کلام

شایاں کو اس بات کا اندازہ تھا ہزاروں لوگوں نے اس کتاب کی عظمت کا اعتراف کیا ہے لیکن ان کی زور طبیعت نے انھیں اس بات پر آمادہ نہیں کیا اسے نظم کیا جائے۔ اسی لیے انھوں نے اسے ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا۔ لکھتے ہیں۔

مرے قلزم دل میں اٹھی ترنگ
کہ ہو اب صف آرائی نظم جنگ

شایاں نے اس مثنوی میں دکنی مثنویوں کے طرز پر حمد، تعریف سخن کے بعد مہابھارت کا ذکر کرنے سے قبل اپنے معاصرین باکمالوں پر سبقت جتانے کی کوشش کی ہے۔ اس مثنوی میں ایک سیل رواں ہے جو بہا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ شایاں اس کا اختتام کردیتے ہیں۔

بیاں سے ہے عاجز زبان قلم
بس اب ہو چکا امتحان قلم

مہابھارت میں اسلحوں کی الگ الگ تعریف میں اردو مرثیوں کا انداز نظر آتا ہے جس طرح میر انیس کرتے ہیں۔

زبان قلم پر ہے تیروں کا حال
دم رزم سنیے یہ ان کا کمال
کماں پر کوئی تیر رکھا اگر
جو کھینچا تو سب کو دس آئے نظر
ہوا جس گھڑی وہ کماں سے جدا
نظر آئے سو تیر بس برملا

یہ مثنوی زبان وبیان، جوش وخروش اور شکوت وشکوہ کے اعتبار سے ایک دل پذیر اور جاں نواز بے نظیر فن پارہ ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اس کو دوبارہ چھپنا نصیب نہیں ہوا۔

گیتا کے اردو زبان میں مختلف اصناف میں ترجمے کیے گئے۔ جس میں نثری اور شعری دونوں شامل ہیں۔ 1275ھ میں سب سے پہلے منشی جگن ناتھ لال خوشتر نے مثنوی کی شکل میں اس کا ترجمہ کیا۔ یہ مثنوی سلاست، نفاست اور صفائی و شگفتگی کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہے۔ اس کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے جو آگے چل کر مناجات کا رنگ لیے ہوئے ہے۔

1328ھ/1910 کو گیتا کا دوسرا ترجمہ منشی چھچی پرشاد صدر لکھنوی نے کیا۔ ان کی مثنوی کا نام 'خورشید معرفت' ہے۔ یہ ترجمہ سلیس ہے اور صدر نے کرشن جی کی تعلیم پر کافی زور دیا ہے۔ کرشن جی کے ذریعے ارجن کو دیے گئے اپدیش کو صدر نے اس طرح نظم کیا ہے۔

> **گیتا کے اردو زبان میں مختلف اصناف میں ترجمے کیے گئے۔ جس میں نثری اور شعری دونوں شامل ہیں۔ 1275ھ میں سب سے پہلے منشی جگن ناتھ لال خوشتر نے مثنوی کی شکل میں اس کا ترجمہ کیا یہ مثنوی سلاست، نفاست اور صفائی و شگفتگی کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہے۔ اس کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے جو آگے چل کر مناجات کا رنگ لیے ہوئے ہے۔**

عبث رنج کرتا ہے تو دمبدم
کہ بے فائدہ ہے یہ سب رنج و غم
کر ایشور کی طاعت، کر ایشور کا دھیان
کہ بے اس کے پائے گی تکلیف، جان
غم اس کا نہ کر جو نہ دے فائدہ
مری بات کو غور سے سن ذرا
یہ سامان دہر اور ماہ شما
رہیں گے قیامت تلک رونما
بدلتا ہے تن، جاں بدلتی نہیں
خلش تن پہ ہے، جاں پہ چلتی نہیں
سدا وقت پر اپنے آتی ہے موت
کسی کو نہیں چھوڑ جاتی ہے موت

درس عمل کو اس طرح پیش کیا ہے۔

عمل سے ہوا آشکارا جہاں
عمل سے ہے دوزخ، عمل سے جناں
عمل ہی بناتا ہے اہل کمال
عمل ہی مٹاتا ہے سارے وبال

1337ھ/1919 میں مثنوی کی شکل میں گیتا کا ترجمہ منشی میوہ لال عاجز عظیم آبادی نے کیا۔ اس مثنوی میں صرف اس حصے کا ترجمہ کیا گیا ہے جس میں کرشن جی نے ارجن پر عرفان الٰہی کے رموز اور اس سلسلے میں فرمان الٰہی کے اسرار منکشف کیے ہیں اور بتایا ہے کہ دھیان کیا چیز ہے۔ معرفت کسے کہتے ہیں، جسم وروح کا تعلق کیا ہے۔

1338ھ/1920 میں دیوکی نندن لال مبتدی عظیم آبادی نے گیتا کا ترجمہ کیا لیکن چونکہ یہ مثنوی محض زبان وادب کی خدمات اور وقت گزاری کے لیے لکھی گئی اور جوش اور شاعرانہ ذوق کو کوئی جگہ نہیں دی گئی تو اس میں ولولہ اور حسن کیوں کر پیدا ہوسکتا ہے۔ مثنوی میں فن کے لحاظ سے بھی جان نہیں ہے۔

1344ھ/1926 میں منشی بجرنگ سہائے صنوبر عظیم آبادی نے گیتا کا اردو مثنوی میں ترجمہ کیا۔ اس مثنوی میں سلاست بھی ہے اور روانی بھی۔ لسانی محاسن بھی موجود ہیں اور تاریخی رعایتیں بھی مل جاتی ہیں۔

1351ھ/1932 میں منشی راج کشور اختر جائسی نے 144 اشعار پر مشتمل منظوم ترجمہ کیا جس میں سے صرف ایک شعر ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ 1353ھ/1934 یوگی راج نے گیتا کا منظوم ترجمہ کیا۔

حوالہ جاتی کتب

ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں: گوپی چند نارنگ
اردو مثنوی شمالی ہند میں: گیان چند جین
اردو کے ہندو شعرا: جگدیش مہتہ درد
اردو کے مسیحی شعرا: ڈی اے ہریسن قربان مرادآبادی
تذکرہ یوروپین شعرائے اردو: محمد سردار علی
امر کہانی (منظوم رامائن): بیتاب بریلوی
مہابھارت: افق لکھنوی

■

Dr. Mohammad Sharib
Asst. Prof., P.G. Dept of Language
& Literature, Fakir Mohan University
Balasore-756089 (Odisha)
Mob: 7032775100
Email: mohdsharibkhan54@gmail.com

اردو ناولوں میں منفی کرداروں کی اہمیت وافادیت

محمد ابرار

حیات انسانی متنوع جہات کی حامل ہے۔ آدمی شروع سے ہی مختلف مدارج و مراحل سے گزرتا رہا ہے۔ اپنی روزمرہ کی زندگی میں حالات وتغیرات سے دوچار ہوتا ہوا مسلسل ترقی کے منازل طے کرتا رہا ہے۔ اس دوران پیش آنے والے نشیب وفراز کا تدریجی ارتقا انسان کے ذہن وفکر اور عادت و اطوار پر دیرپا اثرات مرتسم کرتا ہے۔ حیات انسانی کے اس اتار چڑھاؤ کو ادبی سطح پر قصے، کہانیوں اور افسانوں میں خوب برتا گیا ہے۔ ادب چونکہ انسانی زندگی اور فطرت کے لازوال خزانوں کا امین اور مختلف احساسات و واقعات کا مرقع ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے ذریعے انسانی زندگی کے مختلف کوائف سے بخوبی آگہی ہوتی ہے۔

ناول کا فریضہ زندگی کے مختلف گوشوں اور موضوعات کا احاطہ کر کے ایک فلسفہ حیات پیش کرنا ہوتا ہے۔ عام طور پر فلسفۂ حیات کی اساسی اکائی افراد قصہ کے ذہنی رجحانات سے پیدا ہوتی ہے، جسے (افراد قصہ) عوام و خواص 'کردار' سے موسوم کرتے ہیں۔ چونکہ ناول کا تانا بانا قصوں پر منحصر ہوتا ہے اور قصوں کا انحصار کرداروں پر، تو ایسی صورت میں کردار ناول کے لیے بالواسطہ جزو لازم کے مثل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کردار ناول کے بیانیے میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح کام کرتے ہیں۔ جس طرح ہمارا جسم ریڑھ کی ہڈی کی بدولت سیدھا کھڑا رہتا ہے ٹھیک اسی طرح کردار بھی ناول کے بیانیے کو آگے بڑھاتے ہیں اور اس کی ترتیب وتنظیم میں بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں۔ گویا ناول کرداروں کے توسط سے پروان چڑھتے ہیں اور حیات انسان کے مختلف گوشوں کو یا کسی ایک گوشے کو پیش کرتے ہیں۔ پھر ان ہی کرداروں کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کی وساطت سے آخر میں کوئی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔

یہ بات ضرور یاد رکھیں کہ ناول کے وہی کردار ابدی زندگی پاتے ہیں جن میں زمینی حقائق سموئے ہوئے ہوتے ہیں۔ جن کے مزاج اور ماحول میں ارضی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ انسانی سطح پر خطا اور نسیان سے مرکب ہوتے ہیں۔ ذہانت و فطانت اور فطرت کے پیش نظر جن کے اعمال و افعال میں مطابقت ہوتی ہے اور ان کے عمل اور ردعمل کے تمام مظاہر موزوں اور قرین قیاس صورت میں پیش ہوتے ہیں، ورنہ چھوٹی سی بھول ناول کے پورے بیانیے کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ فنکار کی فنی کمزوری کی وجہ بن جاتی ہے۔ اس لیے کرداروں کی تخلیق میں بڑی سنجیدگی، متانت اور احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اختر اورینوی اسی بابت لکھتے ہیں:

"کامیاب کردار نگاری صرف خدوخال کی پیش کش نہیں۔ بلکہ اساسی، جذباتی، تخیلی اور جذباتی زندگی کی رونمائی ہے... کرداروں کی نفسی زندگی کو ابھارنا اور نفسی زندگی کی ترجمانی ایک پیچیدہ عمل ہے۔ یہ عمل اور ردعمل، اثر و تاثیر، جبلتوں اور شعور کا پیچیدہ مرکب ہے... اس لیے زندہ کردار نگاری کے لیے تجزیہ نفس کی ضرورت ہے اور نفس انسانی کی نیرنگی سے واقف ناول نگار ہی عمدہ کردار نگاری کر سکتا ہے۔"

(اختر اورینوی، تحقیق وتنقید، مطبوعہ کتابستان الہ آباد، 1961، ص 137)

محولہ سطور کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کردار نگاری ناول کی جان ہوتی ہے، ناول صرف قصہ گوئی یا محض تسلسل واقعات نہیں بلکہ بے حد حزم واحتیاط اور فنی دسترس کے ساتھ عمدہ کردار نگاری کا نام ہے۔ اس لیے کردار محض کٹھ پتلی اور بازیچۂ اطفال نہ ہوں بلکہ جیتے جاگتے، سانس لیتے، متحرک اور فعال ہوں۔ ان کی رگوں میں خون رواں ہو اور سر میں مغز جواں۔ وہ محض تصویر بتاں اور سایہ دیوار نہ ہوں بلکہ حساس، سوچنے سمجھنے والے، اثر ڈالنے والے اور اثر قبول کرنے والے بھی ہوں۔ گویا ناول نگار کرداروں کا ایسا خد و خال ابھارے کی ان کی جیتی جاگتی شکلیں آنکھوں میں گھر کر جائیں، اجنبیت کا احساس بالکل نہ ہو اور ایسا لگے کہ یہ کردار ہمارے آس پاس موجود ہے۔

واقعات چاہے ارضی ہوں یا فرضی 'افراد قصہ' یعنی کردار سب کے لیے ناگزیر ہیں۔ بغیر کردار کے نہ تو ارضی واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں اور نہ ہی فرضی واقعات۔ ناول نگار واقعات کا جو ماحولیاتی بیانیہ پیش کرتا ہے، اس کے کردار بھی اسی ماحول اور فضا کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کے کینوس پر نمودار ہونے والے کرداروں کا تعلق حقیقی دنیا سے ماورا نہیں ہوتا ہے بلکہ ان کی جڑیں دنیائے ارض سے پیوستہ ہوتی ہیں۔ ناول کے کردار جتنے زیادہ زمینی، تہہ دار، پیچیدہ اور گنجلک ہوں گے قاری کے لیے اتنے ہی دلچسپی اور تجسس کا باعث ہوں گے۔ ناول نگار کی شدید آزمائش کرداروں کی پیش کش اور پلاٹ کی تخلیق میں ہوتی ہے۔ یہیں پر ناول نگار کی فنکارانہ مہارت اور گرفت کی سخت آزمائش ہوتی ہے۔ اس لیے ناول نگار کے لیے یہ مرحلہ کسی خار زار وادی عبور کرنے سے کم نہیں ہوتا ہے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر

سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

''ایک کامیاب ناول کے کردار ہمارے جیسے گوشت و پوست سے بنے ہوتے ہیں۔ ہماری ہی فضا میں وہ سانس لیتے ہیں ہماری ہی طرح خوشی اور غم کے وہ جذبات بھی رکھتے ہیں.. وہ (ناول نگار) مختلف کرداروں کو ہمارے سامنے پیش کرے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ان کا نقشہ پھر جائے اور ہم ان کی شکل و صورت اور گفتار و کردار کو بھی نہ بھول سکیں۔ بعض ناول نگار ایسی تصویر کھینچنے کے لیے رسمی طور پر ایک ایک جزو کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر یہ تجربہ بالکل ناکام رہا ہے۔ ایک ماہر فنکار یہ جانتا ہے کہ کن جزئیات کا ذکر کرنا چاہیے اور کن کو ترک کر دینا چاہیے، تاکہ ناظرین خود اپنی قوت تخیل سے اس خلا کو پر کرلیں۔''

(ڈاکٹر سلام سندیلوی: ادب کا تنقیدی مطالعہ، ص 59-157، پبلشر نسیم بک ڈپو لکھنؤ 1972)

مذکورہ قول سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ کرداروں کی کامیابی اور ناکامی دونوں کا انحصار ناول نگار کی فنکارانہ استعداد پر ہے۔ ناول میں چونکہ معاشرتی زندگی کے پیچ و خم کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کے کردار بھی بنی نوع انسان کی طرح مختلف رنگ و روپ اور صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ کبھی یہ مثبت رنگ و روپ میں متشکل ہوتے ہیں اور شر کے خلاف علم خیر بلند کرتے ہیں۔ کبھی یہی کردار منفی شکل و صورت میں سامنے آتے ہیں تو علم شر اٹھانے کی پیہم کوشش کرتے ہیں۔ جس میں یہ کامیاب ہوتے ہوتے بیشتر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں ناول نگار سماج اور معاشرے کے داخلی عناصر ظاہر کرتا ہے۔ مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو اجاگر کرکے کوئی نتیجہ منتج کرتا ہے۔ تاکہ معاشرے کا وہ رخ بھی لوگوں کے سامنے ظاہر ہو سکے جو دانستہ یا نادانستہ معاشرے کا حصہ ہے۔

مثبت کرداروں کی اہمیت اپنی جگہ بہ سروچشم تسلیم ہے۔ لیکن منفی کرداروں کی اہمیت بھی کسی صورت ان سے کم نہیں بلکہ بعض دفعہ ان سے بڑھ بھی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ منفی کرداروں کے اعمال و افعال ہی ہوتے ہیں جو زندگی کی ناہمواریوں اور معاشرے میں موجود غلط روشوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ سست اور مند سماج کو چاق و چوبند اور متحرک رکھتے ہیں۔ اشیا کے کھونے اور جان کے تلف ہونے کا ڈر پیدا کرتے ہیں۔ یہ اصول مبنی برحق ہے کہ جب تعمیری اور تخریبی عناصر کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو مثبت اور سود مند نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ حقیقی معنوں میں ایک مثالی معاشرے اور ایک اچھے سماج کی تشکیل اور پہچان منفی کرداروں کی بدولت ہوتی ہے۔ کیونکہ عربی کا مقولہ ہے 'تعرف الاشیاء باضدادھا' یعنی چیزیں اپنے مخالف سے جانی جاتی ہیں۔ گویا جہان رنگ و بو میں سوز و ساز، درد و داغ اور جستجو و آرزو سب منفی کرداروں کے دم سے ہے۔ ورنہ اگر معاشرے کے سارے افراد نیک سیرت، پاکیزہ طینت اور شریف الخصلت ہوتے، تو دل یزداں میں نہ ہی کوئی کانٹے کی طرح کھٹکتا اور نہ ہی کوئی راہ راست سے در بدر بھٹکتا۔ معلوم یہ ہوا کہ ناول میں تجسس و تحیر برقرار رکھنے کے لیے منفی کردار اتنے ہی اہم ہوتے ہیں جتنے مثبت کردار اہم ہوتے ہیں۔

ناول کے کردار جتنے زیادہ زمینی، تہہ دار، پیچیدہ اور گنجلک ہوں گے قاری کے لیے اتنے ہی دلچسپی اور تجسس کا باعث ہوں گے۔ ناول نگار کی شدید آزمائش کرداروں کی پیش کش اور پلاٹ کی تخلیق میں ہوتی ہے۔ یہیں پر ناول نگار کی فنکارانہ مہارت اور گرفت کی سخت آزمائش ہوتی ہے۔ اس لیے ناول نگار کے لیے یہ مرحلہ کسی خارزار وادی عبور کرنے سے کم نہیں ہوتا ہے۔

منفی کرداروں کو انگریزی میں 'ولن' اور ہندی میں 'کھلنا یک' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ادب میں عموماً منفی کرداروں سے مراد وہ کردار ہیں، جو اخلاقیات سے عاری، دوسروں کو تکلیف پہونچانے کے عادی، برے راستوں کے ہادی، اخلاق حسنہ اور اچھے برتاؤ سے خالی ہوتے ہیں۔ اسی سے ملتی جلتی منفی کرداروں کی تعریف کیمبرج ڈکشنری میں بھی کی گئی ہے۔ مثلاً؛

"A bad person who harms other people or breaks the law, or a cruel or evil character in a book, play, or film."

اسی طرح سے انگریزی ڈکشنری کولنس میں بھی اس کی تعریف کی گئی ہے:

"A villain is someone who deliberately harms other people or breaks the law in order to get what he or she wants.........The villain in a novel , film, or play is the main bad character."

مذکورہ دونوں تعریفوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ منفی کردار کہانیوں اور قصوں میں اعمال رذیلہ اور افعال قبیحہ کے حامل ہوتے ہیں اور جن کا کام عموماً دوسروں کو تکلیفیں پہنچانا ہے۔

اردو ناولوں میں شروع سے ہی منفی کرداروں کی روایت ملتی ہے چونکہ ناول داستان کی ترقی یافتہ صورت ہے، اس لیے داستانوی رنگ و آہنگ کا ہونا لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی ناولوں میں خیر و شر کی کشمکش، تصادم اور ٹکراؤ خوب دیکھنے کو ملتا ہے مگر جیسے جیسے اس فن میں پختگی آتی گئی ویسے ویسے داستانوی اثر ہوتا گیا۔ جیسے ڈپٹی نذیر احمد کا شروعاتی ناول 'توبۃ النصوح' جس میں کلیم اور نعیمہ کے باغیانہ رویے نصوح کی آنکھوں میں ہمیشہ کھٹکتے رہتے ہیں۔ جن کی اصلاح کے لیے نصوح شدت کی حد تک کب پہنچ جاتا ہے اس کا احساس اسے خود بھی نہیں ہو پاتا ہے۔ نتیجتاً کلیم ناخوش ہو کر گھر بار چھوڑ دیتا ہے اور نعیمہ کو اس کی خالہ کے گھر صالحہ کے پاس بھیج دیا جاتا ہے۔ ناول میں ڈپٹی نذیر احمد نے اگرچہ کلیم اور نعیمہ کو منفی کردار کے طور پر ضدی، اڑیل اور نافرمان بنا کر پیش کیا ہے مگر اس کے باوجود ان دونوں کے لیے قارئین کے دلوں میں ہمدردی اور محبت کا جذبہ ابھرتا ہے، جب کہ اس کے برعکس نصوح کے لیے ناراضگی اور خفگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں پر یہ سوال بھی قائم ہوتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نصوح کو زیادہ پاکباز اور فرشتہ صفت بنانے کی فراق میں کہیں ناکام تو نہیں ہوگئے، جس کی وجہ سے قاری کی محبت اور ہمدردی کلیم کے ساتھ ہو جاتی ہے اور ناول نگار سے در پردہ ناراضگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس

بات کی تائید محمد احسن فاروقی کے ذیل میں دیے گئے اقتباس سے بھی ہوتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''یہ مولانا کی نفرت کا خاص شکار ہے مگر ہمیں اس سے اس قدر ہمدردی ہو جاتی ہے کہ مولانا سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔''

(محمد احسن فاروقی، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ،ص 47، دوسرا ایڈیشن 1962)

اسی سلسلے میں آل احمد سرور بھی لکھتے ہیں:

''ان کے کردار فرشتے ہوتے ہیں یا شیطان.. نذیر احمد سب کچھ بھول سکتے ہیں مگر وہ مقصد نہیں بھول سکتے ،جس کے تحت وہ قصہ لکھتے ہیں۔''

(آل احمد سرور، تنقید کیا ہے،ص 16،مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنو،1964)

مذکورہ بالا دونوں اقوال کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد نے اگر چہ کلیم اور نعیمہ کے کردار کو مسخ کرکے لائق نفرت بنانے کی کوشش کی ہے مگر وہ کلی طور پر کامیاب نہ ہو سکے۔اس لیے اگر کلیم اور نعیمہ کے کردار کو نیم منفی کردار کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ دونوں ایسے منفی کردار ہیں جن سے نفرت کم ہمدردی اور لگاؤ زیادہ ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ کچھ ایسے بھی منفی کردار ہیں جن سے حد درجہ نفرت ہوتی ہے۔ جیسے ناول ''فردوس بریں ''میں فرقہ باطنیہ کا مبلغ شیخ علی وجودی۔ جو اردو ناول کی تاریخ میں سب سے بڑا ولن (منفی) کردار ہے اور عبدالحلیم شرر کا تخلیق کردہ ہے۔ شرر نے 'شیخ علی وجودی' کی کردار نگاری میں بڑی مہارت اور اعلیٰ فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے شیخ علی وجودی کا کردار اتنا فعّال، طاقتور اور متحرک بنا کر پیش کیا ہے کہ اس کے سامنے ہیرو (حسین) کا کردار بالکل سپاٹ اور بے بس نظر آتا ہے۔ فرقہ باطنیہ کا بانی کوئی بھی ہو مگر پورے ناول میں شیخ علی وجودی کی موجودگی سحر انگیزی اور تجسس کا باعث ہے۔اس کی وجہ سے ہی ناول میں قارئین کی دلچسپی از اول تا آخر برقرار رہتی ہے اور واقعات حادثات کے بارے میں جاننے کے لیے قارئین ہمہ وقت بے تاب و بے چین رہتے ہیں۔ یہی چیزیں ناول 'فردوس بریں' کی کامیابی اور دلچسپی کی ضمانت اور دلیل ہیں۔ ناول کو جو رفعت و عظمت شیخ علی وجودی کی موجودگی میں حاصل ہوئی ہے شاید ہی اس کی عدم موجودگی میں حاصل ہوتی۔ اسی طرح ناول 'امراؤ جان ادا' کا ولن دلاور خاں، جو انتقام کی شدید آگ میں جل رہا ہوتا ہے۔ وہ ایک شریف زادی امیرن کو اغوا کرتا ہے اور خانم کے کوٹھے پر پہنچا دیتا ہے۔ جہاں تعلیم و تربیت پا کر وہ امیرن سے امراؤ جان بنا دی جاتی ہے۔ خانم کے کوٹھے پر اس کی پرورش و پرداخت اگر چہ ہوتی ہے مگر اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون ایک شریف و نظیف نسل کا تھا، جس کی وجہ اس دلدل سے نکلنے کے لیے وہ کئی دفعہ راہ فرار اختیار کرتی ہے مگر سوئے قسمت ناکام ہوتی ہے۔ دکھ اور لاچارگی سے بھری ہوئی امیرن کی آپ بیتی قارئین کے دلوں میں ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا کرتی ہے جب کہ دلاور خاں کے لیے شدید نفرت کا۔ حالانکہ ناول کے آخری صفحات میں جہاں دلاور خاں کے گرفتار ہونے کا بیان ہے وہاں دلاور خاں کی حالت بھی قابل رحم ہوتی ہے۔ اس کی موجودہ حالت نفرت کے جذبات ختم تو نہیں کر پاتی ہے مگر کم ضرور کر دیتی ہے۔ لیکن ظالم پر رحم مظلوم پر ظلم کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ دلاور خاں کے ظالم اور بے رحم ہونے میں کوئی شک نہیں۔

کچھ ایسے ہی منفی کردار ان کے بعد آنے والے ناول نگاروں کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہاں پر ہم تفصیلات سے اعراض کرتے ہوئے چند منفی کرداروں کے فقط ذکر پر اکتفا کریں گے۔ ان میں سے چند مشہور و معروف اور قابل ذکر منفی کردار جیسے دلاور خاں ('امراؤ جان ادا' از مرزا محمد ہادی حسن رسوا)، پنڈت داتا دین اور ماتا دین ('گئودان' از پریم چند)، پنڈت سروپ کشن ('شکست' از کرشن چندر)، نیاز اور خان بہادر ('خدا کی بستی' از شوکت صدیقی)، احسان میاں ('معصومہ' از عصمت چغتائی)، مہربان داس ('ایک چادر میلی سی' از راجندر سنگھ بیدی)، مرزا صاحب عرف بڑے سرکار ('شب گزیدہ' از قاضی عبد الستار)، وینکٹ ریڈی اور ملیشیم ریڈی ('بارش سنگ' از جیلانی بانو)، شہوار خانم اور نگار خانم ('گردش رنگ چمن' از قرۃ العین حیدر)، بھاردواج اور پی این ورما ('فائر ایریا' از الیاس احمد گدی) اور جہانگیر اعوان ('نادار لوگ' از عبداللہ حسین) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح ہمیں منفی کردار بیسویں اور اکیسویں صدی کے دیگر ناول نگاروں کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جن میں سے بعض کرداروں کو دنیائے اردو ادب میں شہرت عام کے ساتھ ساتھ بقائے دوام بھی حاصل ہوئی اور بعض کو شہرت عام تو نہیں مگر حیات ابدی ضرور حاصل ہوئی۔ وہ (کردار) اپنی منفرد شناخت و پہچان قائم کرنے میں کامیاب ہوئے اور ان کی موجودگی قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ یہی چیزیں ناول نگار کو ایک کامیاب تخلیق کار کے زمرے میں شمار کرواتی ہیں، مثلاً قاری ان کے کرداروں سے متاثر ہو، ان کی طرف توجہ دے، ان کے اثرات ان پر مرتسم ہوں اور وحدت تاثر قائم ہو۔ اس طرح کے کامیاب اور اہم ناول نگاروں میں رتن ناتھ شرشار، قاضی عبدالغفار، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ احمد عباس، عزیز احمد، خدیجہ مستور، ممتاز مفتی، انتظار حسین، حسین الحق، انور سجاد، شمس الرحمٰن فاروقی، مشرف عالم ذوقی، ترنم ریاض، طارق چھتاری، سید محمد اشرف، غضنفر، رحمٰن عباس، خالد جاوید، انیس اشفاق اور صادقہ نواب سحر وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

ان تمام ناول نگاروں نے فقط کردار نگاری سے ہی کام نہیں لیا ہے بلکہ بہترین فنکاری، عمدہ تکنیک، دلکش اسلوب اور اعلیٰ ادبی شان و شوکت کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ انھوں نے اپنے پیچھے منفی اور مثبت کرداروں کی ایسی انمول اور ناقابل فراموش مثالیں اور روایتیں چھوڑی ہیں کہ جن سے صرف نظر کسی بھی ادیب اور تخلیق کار کے لیے ناممکن ہے۔

■

Mohd Abrar
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh- 202001 (UP)
Mob.:8009386712
mohdabrar253@gmail.com

راشد قادری

مصنوعی ذہانت (AI) اور اردو

امکانات اور جدید رجحانات

مصنوعی ذہانت (AI-Artificial Intelligence) ایک ایسی جدید ٹیکنالوجی ہے جو کمپیوٹروں اور مشینوں کو انسانی طرز پر سوچنے، سیکھنے، اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت فراہم کرتی ہے۔ اس ٹیکنالوجی میں مشین لرننگ، ڈیپ لرننگ (Deep Learning)، نیورل نیٹ ورکس اور دیگر سسٹمز شامل ہیں جو مختلف تجربات سے سیکھ کر، ڈیٹا کو پروسیس کرکے، خودبخود ردعمل ظاہر کرنے یا فیصلے کرنے کے قابل بنتے ہیں۔ بنیادی طور پر، اے آئی (AI) کی کوشش ہوتی ہے کہ مشینوں کو اس طرح بنایا جائے کہ وہ انسانوں کی طرح مسائل کا حل تلاش کرسکیں اور اپنی کارکردگی کو بہتر بناتے ہوئے پیچیدہ کام انجام دے سکیں۔ اسٹیورٹ رسل (Russell Stuart) اور پیٹر نارویگ Peter Norvig، نے اپنی کتاب، مصنوعی ذہانت: ایک جدید نقطہ نظر میں اے آئی کی تعریف یوں کی ہے:

"A Modern Approach, where they define AI as “the study of agents that receive percepts from the environment and perform actions”[1]

ڈاکٹر ذیشان الحسن عثمانی مصنوعی ذہانت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مصنوعی ذہانت مشین کی صلاحیت کا نام ہے جس کے ذریعے وہ قدرتی یا انسانی ذہانت کی نقالی کر سکتے ہیں۔''

آگے لکھتے ہیں:

''مصنوعی ذہانت ایجنٹ کی وہ صلاحیت ہے جو اپنے ماحول کو پہچانے اور وہ اقدامات کرے جن کی مدد سے اسے اپنے متعین کردہ یا مطلوب مقصد میں کامیابی حاصل ہو یا اس کے امکانات میں اضافہ ہو۔''[2]

موجودہ دور میں، اے آئی (AI) ہماری زندگی کے مختلف شعبوں میں نہایت اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ ہم روزمرہ زندگی میں شاید یہ محسوس نہیں کرتے، مگر مصنوعی ذہانت ہماری زندگی کا ایک لازمی حصہ بن چکی ہے۔ مثال کے طور پر، موبائل فونز کے وائس اسسٹنٹس (جیسے Siri اور Assistant Google)، سرچ انجنز کی کارکردگی اور سمارٹ ہوم ڈیوائسز اے آئی (AI) کی مدد سے کام کرتی ہیں۔ اس کی بدولت نہ صرف ہماری زندگی میں آسانی پیدا ہوئی ہے بلکہ صحت، تعلیم، کاروبار، اور سیکیورٹی جیسے اہم شعبوں میں بھی انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ اے آئی (AI) ہمارے لیے ڈیٹا کی بڑی مقدار کو فوری پروسیس کرنے، درست معلومات فراہم کرنے اور وقت کی بچت کرنے جیسے فائدے بھی لے کر آیا ہے۔

مصنوعی ذہانت: اے آئی کا آغاز بیسویں صدی کے وسط میں ہوا، جب سائنسدانوں نے کمپیوٹروں کو انسانی سوچ اور سمجھ کے انداز میں کام کرنے کی صلاحیت دینے کی کوششیں شروع کیں۔ 1950 کی دہائی میں اے آئی (AI) کی بنیاد اس وقت رکھی گئی جب مشہور برطانوی سائنسداں ایلن ٹیورنگ (Alan Turing) نے ایک تجربہ پیش کیا جسے آج 'ٹیورنگ ٹسٹ' (Turing Test) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ٹیورنگ ٹسٹ کا مقصد یہ جانچنا تھا کہ کمپیوٹر انسانی ذہانت کی نقل کرسکتا ہے یا نہیں۔ اس تجربے نے ذہانت اور مشینوں کے درمیان رشتہ استوار کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا اور اے آئی (AI) کے بنیادی اصولوں کو واضح کیا۔

1956 میں، 'ڈارٹ ماؤتھ کانفرنس' (Dartmouth Conference) کو مصنوعی ذہانت کا نقطۂ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ اس کانفرنس میں جان مکارتھی (John McCarthy)، ماروِن مینسکی (Marvin Minsky)، اور کلاڈ شینن (Claude Shannon) جیسے ماہرین نے پہلی بار Artificial Intelligence کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے اس ٹیکنالوجی کے مختلف پہلوؤں پر بات کی۔ اس کانفرنس میں یہ خیال پیش کیا گیا کہ کمپیوٹروں کو ایسا بنایا جاسکتا ہے کہ وہ انسانوں کی طرح سوچ سکیں، سیکھ سکیں اور پیچیدہ مسائل حل کرسکیں۔[3]

سنہ 1970 اور 1980 کی دہائیوں میں مصنوعی ذہانت میں خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ اے آئی (AI) ریسرچرز نے نیورل نیٹ ورکس اور ایکسپرٹ سسٹمز (Expert Systems) کا تصور پیش کیا۔ ایکسپرٹ سسٹمز نے کمپیوٹروں کو خاص شعبوں میں ماہرین کے مشورے فراہم کرنے کی صلاحیت دی، جیسے میڈیکل تشخیص یا انڈسٹریل پلاننگ وغیرہ۔ ان کوششوں کے باوجود، ان کے نتائج محدود تھے اور اے آئی (AI) کی ترقی میں کئی برسوں تک پیش رفت نہ ہوسکی جسے اے آئی 'Winter' کہا جاتا ہے۔

1990 کی دہائی میں کمپیوٹنگ پاور اور ڈیٹا کے بڑھتے ہوئے ذخائر نے اے آئی میں مشین لرننگ کی

ترقی کو فروغ دیا۔ مشین لرننگ ایک ایسا شعبہ ہے جس میں کمپیوٹر خود بخود ڈیٹا سے سیکھتے ہیں اور بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ 1997 میں آئی بی ایم(IBM) کے کمپیوٹر، ڈیپ بلیو(Deep Blue) نے شطرنج کے عالمی چیمپئن گیری کسپارو(Garry Kas Parov) کو شکست دی، جو اے آئی(AI) کی دنیا میں ایک سنگ میل تھا۔4

2000 کی دہائی میں انٹرنیٹ اور ڈیجیٹل ڈیٹا میں تیزی سے اضافے نے مشین لرننگ اور ڈیٹا سائنس کے میدان کو اور زیادہ ترقی دی۔ 2010 کی دہائی میں ڈیپ لرننگ(Deep Learning) اور نیورل نیٹ ورکس (Neural Networks) کی ترقی نے اے آئی کو ایک نئی جہت دی۔ ڈیپ لرننگ نے بڑے ڈیٹا سیٹس اور طاقتور کمپیوٹرز کے ذریعے پیچیدہ مسائل کے حل کو ممکن بنایا۔ اے آئی اب تصویری شناخت، وائس اسسٹنٹس اور خودکار(Autonomou یا Automatic) گاڑیوں جیسے ایپلی کیشنز میں وسیع پیمانے پر استعمال ہونے لگا۔ گوگل، ایپل، اور ٹیسلا جیسی بڑی کمپنیاں اے آئی میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری(Investment) کرنے لگیں، جس نے اس شعبے کو مزید مستحکم کیا۔

مصنوعی ذہانت میں آرٹیفیشل جنرل انٹیلی جنس (AGI) اور آرٹیفیشل سپر انٹیلی جنس (ASI) کے تصورات پر کام کیا جا رہا ہے، جن سے یہ امید کی جاتی ہے کہ اے آئی انسانوں جیسی یا اس سے بھی زیادہ ذہانت حاصل کر لیں گے۔ مستقبل میں اے آئی مزید پیچیدہ اور ترقی یافتہ ہو سکتی ہے۔

مصنوعی ذہانت سے ہماری زندگی کے کئی شعبوں میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اس کی مدد سے پیچیدہ کاموں کو تیزی سے اور مؤثر طریقے سے انجام دینا ممکن ہوا ہے۔ مصنوعی ذہانت (AI) نے مختلف شعبوں میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ صحت میں یہ بیماریوں کی تشخیص اور ادویات کی تحقیق میں مؤثر ثابت ہوئی ہے۔ تعلیم میں AI نے ذاتی نوعیت کی تعلیم اور خودکار تشخیص کو ممکن بنایا ہے۔ کاروبار میں، AI ڈیٹا کے تجزیے کے ذریعے بہتر کاروباری فیصلے اور کسٹمر سروس میں بہتری فراہم کرتی ہے۔ روزمرہ زندگی میں، AI پر مبنی سمارٹ آلات نے زندگی کو آرام دہ بنایا ہے، جب کہ سائبر سیکیورٹی (Cybersecurity)، میں یہ خطرات کی نشاندہی اور ردعمل کو تیز کرتی ہے۔ زرعی شعبے میں AI فصل کی دیکھ بھال اور پیداوار بڑھانے میں معاون ثابت ہو رہی ہے۔ تفریح اور میڈیا میں AI نے صارفین کے لیے پسندیدہ مواد کی فراہمی کو ممکن بنایا ہے، اس طرح دیکھیں تو اے آئی نے زندگی کے کئی پہلوؤں کو بہتر اور آسان بنایا ہے۔

مصنوعی ذہانت (AI) نے ادب کے میدان میں بھی کئی اہم کارنامے انجام دیے ہیں، جن سے نہ صرف تخلیقی عمل میں جدت آئی ہے بلکہ ادبی مواد کو زیادہ وسیع پیمانے پر سمجھنا ممکن ہوا ہے۔ ذیل میں AI کے ادب میں فوائد کو بیان کیا گیا ہے:

اے آئی کی مدد سے ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا بے حد آسان ہو گیا ہے آرٹیفیشل انٹیلی جنس پر مبنی ترجمہ سافٹ ویئر جیسے گوگل ٹرانسلیٹ اور ڈیپ ایل(DeepL)، کے ذریعے مختلف زبانوں کے ادب کو تیزی اور مؤثر طریقے سے ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے بین الاقوامی قارئین کو مختلف زبانوں کی ادبی تخلیقات تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔ حالاں کہ مشینی ترجمہ کے مقابلے میں انسانی ترجمہ زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اے آئی کی مدد سے مخصوص زبانوں اور بولیوں کی شناخت کے نظام کو بہتر کر کے ترجمے کو اصل مفہوم کے قریب تر کیا جا رہا ہے، جس سے مقامی زبان اور ادب کی بقا میں مدد ملتی ہے۔

چیٹ جی پی ٹی (Chat GPT) ٹولس کے ذریعے تخلیقی تحریر کے نئے امکانات فراہم کیے جا رہے ہیں۔ ان ٹولس کی مدد سے کہانیاں، شاعری، اور دیگر تخلیقی مواد فوری طور پر تیار کیا جا سکتا ہے۔ اے آئی تخلیق کاروں کے لیے ابتدائی خیالات فراہم کرتا ہے، جسے وہ مزید بہتر بنا سکتے ہیں۔ اے آئی مصنفین کو لکھنے کے لیے نئے خیالات فراہم کرنے اور ان کے موجودہ مواد کو بہتر بنانے میں مدد کرتا ہے۔

مصنوعی ذہانت کی مدد سے مختلف ادبی تخلیقات کا تجزیہ کر کے مختلف رجحانات، موضوعات اور اسلوب کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ مثلاً اس کی مدد سے کسی بھی طرح کے ناول، شاعری، افسانہ میں موجود پلاٹ، کردار، اسلوب، زبان کا تجزیہ بہت ہی بہتر انداز میں کیا جا سکتا ہے۔

مصنوعی ذہانت پر مبنی جدید اردو لرننگ ایپلی کیشنز اردو زبان سیکھنے کے عمل کو نہایت آسان اور دلچسپ بنا رہی ہیں۔ ان ایپلی کیشنز میں طلبا کے لیے انٹرایکٹو اسباق، صوتی تربیت، گرامر کی مشقیں، اور روزمرہ کی گفتگو کے لیے مشقیں شامل ہوتی ہیں۔ مزید برآں، ان ایپس کے ذریعے غالب یا اقبال کی شاعری کو سمجھنے اور مشکل الفاظ کے معانی کو آسانی سے جاننے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ ایپلی کیشنز اردو ادب کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔

اے آئی نے اردو میں خودکار تحریری نظام (-Auto matic Writing System) کو بھی ممکن بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر مصنوعی ذہانت پر مبنی سافٹ ویئر، جیسے ٹیکسٹ جنریشن (Text Generation) اور ورڈ پریڈکشن (Word Prediction)، مواد کی تیز رفتار تخلیق میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ یہ خودکار نظام اردو زبان کے قواعد وضوابط کو سمجھ کر قدرتی اور روانی سے مواد تخلیق کرتے ہیں، جس سے اردو ادب، صحافت، اور دیگر شعبوں میں تخلیقی مواد کی فراہمی آسان ہو گئی ہے۔

اے آئی محققین کے لیے مختلف ذرائع، جیسے کتابوں اور مقالوں سے مطلوبہ مواد تلاش کرنے اور اس کا تجزیہ کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اس سے محققین کا وقت بچتا ہے اور تحقیق کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔ مصنوعی ذہانت قارئین کی پسند اور دلچسپیوں کو مدنظر رکھ کر کتابوں، مضامین اور دیگر ادبی مواد کی سفارشات فراہم کرتی ہے۔ جیسے نیٹ فلکس یا یوٹیوب کی طرح، قارئین کو ان کے پسندیدہ موضوعات پر بہترین ادبی مواد تجویز کر سکتا ہے۔ اے آئی کی مدد سے ای بکس میں ایسی خصوصیات شامل کی جا سکتی ہیں جو قارئین کو مطالعے کے دوران مخصوص لفظوں کے معنی یا پس منظر سمجھانے میں مدد دیں۔

عصر حاضر میں اے آئی کی مدد سے قدیم کتابوں، نایاب مخطوطات اور اہم دستاویز کو ڈیجیٹلائز (Digitalize) کرنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ او سی آر (Optical Recognition Character) ٹیکنالوجی کی مدد سے پرانی تحریروں کو کمپیوٹر فارمیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے، جس سے ان کتابوں اور دستاویز کو محفوظ رکھنے اور ان تک رسائی کو آسان بنایا جا سکتا ہے۔ ادب کے ڈیجیٹل آرکائیوز (Digital archives) کی مدد سے مختلف زبانوں اور ثقافتوں کے ادبی ذخائر کو ڈیجیٹل فارمیٹ میں محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

مصنوعی ذہانت (AI) نے ادب میں تخلیقی امکانات

اور جدت کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ کہانی نویسی، ناول اور شاعری کی تخلیق میں اے آئی کا کردار نہایت اہم ہے، جہاں یہ مصنفین کو پلاٹ، کردار اور مکالمات کے لیے تخلیقی تجاویز فراہم کرتا ہے۔ ایپلی کیشنز جیسے 'AI Dungeon' قارئین کو کہانیوں کا رخ متعین کرنے کا موقع دیتی ہیں، جبکہ 'Verse by Verse' جیسے ٹولز کلاسیکی شاعرانہ اسلوب کو جدید تقاضوں کے مطابق پیش کرتے ہیں۔ انٹرایکٹو تجربات، جیسے 'Netflix's Bandersnatch' قارئین کو ادب کے ساتھ ذاتی تعلق قائم کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اے آئی نہ صرف مصنفین کے لیے نئے اسلوب دریافت کرنے میں معاون ہے بلکہ قارئین کے لیے ادب کو مزید دلچسپ اور ذاتی بنا رہا ہے، جو مستقبل میں ادبی تخلیقات کے نئے افق تلاش کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اے آئی نے ادب کے میدان میں کئی اہم فوائد فراہم کیے ہیں، جن میں ترجمے کی آسانی، تخلیقی تحریر کی تیاری، ادبی تجزیہ، ذاتی نوعیت کا مواد فراہم کرنا، کلاسیکی ادب کو محفوظ کرنا اور ڈیجیٹلائز کرنا اور ادب میں نئی اصناف کی تخلیق شامل ہیں۔ AI کی مدد سے ادب کو عالمی سطح پر پہنچانا، مقامی لسانی تاثرات کی حفاظت، تخلیقی عمل میں جدت لانا، اور محققین اور قارئین کے لیے آسانیاں فراہم کرنا ممکن ہوا ہے۔ اس سے ادب کی دنیا میں نئے تجربات، نئے اصناف اور زیادہ وسیع پیمانے پر رسائی ممکن ہوئی ہے۔

اے آئی کے جہاں بہت سارے فوائد موجود ہیں، وہیں اس کے استعمال کے ممکنہ خطرات اور چیلنجز بھی درپیش ہیں۔ مثلاً اے آئی کے استعمال سے لکھنے والوں کی تخلیقی انفرادیت متاثر ہوسکتی ہے۔ اے آئی موجود ڈیٹا کی بنیاد پر مواد تیار کرتا ہے، جس سے ادب کی وہ انفرادیت اور جدت ختم ہوسکتی ہے جو ہر مصنف کے تخلیقی انداز میں جھلکتی ہے۔ اس طرح ادبی تخلیق میں مصنف کی ذاتی بصیرت اور جذباتی گہرائی کا عنصر کمزور ہو جاتا ہے۔ ادب میں ہر ثقافت کی روایات، محاورات، اور دیسی زبانیں مخصوص اور منفرد ہیں۔ اے آئی میں جو ڈیٹا موجود ہیں وہ اسی کے استعمال سے مواد فراہم کرتا ہے جس بنا پر وہ ہر ادب کی روایات اور ان ثقافتوں کی گہرائیوں کو مکمل طور پر سمجھنے اور بیان کرنے سے قاصر ہو سکتا ہے، جس کے نتیجے میں مقامی روایات اور زبان کی نزاکت کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

اے آئی کا استعمال ادب میں اگر عام طور پر ہونے لگے تو اس سے ان مصنفین کو نقصان پہنچ سکتا ہے جو روایتی طور پر لکھتے رہتے ہیں۔ اسی طرح اگر اشاعت اور میڈیا کے شعبوں میں اے آئی کا استعمال بڑھتا ہے تو مصنفین کی خدمات کی ضرورت کم ہوسکتی ہے، جس سے لکھنے والوں کے روزگار اور مواقع پر منفی اثر پڑے گا۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اے آئی نے ادب کے میدان میں کئی اہم فوائد فراہم کیے ہیں، جن میں ترجمے کی آسانی، تخلیقی تحریر کی تیاری، ادبی تجزیہ، ذاتی نوعیت کا مواد فراہم کرنا، کلاسیکی ادب کو محفوظ کرنا اور ڈیجیٹلائز کرنا اور ادب میں نئی اصناف کی تخلیق شامل ہیں۔

مصنوعی ذہانت کی تحریروں میں انسانی جذبات اور گہرائی کی کمی کی ایک مثال AI کے ذریعے تخلیق کی گئی کہانیوں اور ناولوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً "Harry Potter and the Portrait of What Looked Like a Large Pile of Ash"، ایک مشہور مثال ہے، جو کہ ایک اے آئی ماڈل نے لکھی تھی۔ یہ کہانی بظاہر دلچسپ اور عجیب تھی لیکن اس میں پلاٹ کے تسلسل، کرداروں کی گہرائی، اور جذباتی تعلق کا فقدان تھا، جو انسانی مصنف کے کام کا خاصہ ہے۔ اسی طرح، اے آئی کے ذریعے لکھی گئی شاعری اکثر تکنیکی طور پر درست لیکن جذباتی اثر اور تخلیقی بصیرت سے محروم ہوتی ہے، جیسے کہ "GPT-3 poetry experiments" جہاں اشعار تو موزوں تھے لیکن ان میں انسانی تجربات یا جذبات کی عکاسی کمزور تھی۔ یہ مثالیں ظاہر کرتی ہیں کہ AI کی تحریریں انسانی ذہانت اور فکر کی گہرائی کے بغیر مکمل ادبی معیار پر پورا نہیں اتر سکتیں۔5

اے آئی کی مدد سے مواد تیار کرنے کا ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ پہلے سے موجود تحریروں کو بغیر اجازت شامل کر کے انھیں نیا بنا کر پیش کر سکتا ہے۔ اس سے ادبی چوری کا خطرہ بڑھ جاتا ہے اور مصنفین کے حقوق کی پامالی ہوسکتی ہے۔

ادب میں ہر مصنف اپنے ذاتی تجربات اور احساسات کو متن میں شامل کر کے، قاری کے ساتھ ایک ذاتی تعلق قائم کرتا ہے۔ اے آئی میں یہ شخصی تعلق پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، کیوں کہ وہ انسانی تجربات اور احساسات کو براہ راست محسوس نہیں کر سکتا۔ اس طرح کی ادبی تخلیقات زبان کی باریکیوں اور انسان کی جذباتی دنیا کی عکاسی سے محروم ہوسکتی ہیں۔

ان تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے، یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ادب میں مصنوعی ذہانت اے آئی کا استعمال تخلیقی عمل میں کچھ آسانیاں تو فراہم کر سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ کئی بڑے نقصانات کا امکان بھی ہے۔

مستقبل میں اے آئی کی ترقی نئی ایجادات اور اسمارٹ ٹیکنالوجیز کی شکل میں متوقع ہے، جس سے انسانی روابط میں بھی تبدیلی آ سکتی ہے۔ اگرچہ AI ہمیں زیادہ موثر طریقے سے زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کرتا ہے، لیکن ضروری ہے کہ ہم اس کی ترقی کو اخلاقی اصولوں اور قانونی فریم ورک کے تحت منظم کریں تاکہ ہم ایک ایسی دنیا تخلیق کر سکیں جہاں ٹیکنالوجی انسانی بھلائی کے لیے مفید ثابت ہو۔ اس طرح اے آئی کے ذمہ دارانہ استعمال کے ذریعے ہم ایک مثبت مستقبل کی تشکیل کر سکتے ہیں۔

حواشی

1. Stuart J.Russell, & Petter Norvig, Artificial Intelligence: A Modern Approach (3rd ed.). Prentice Hall. P. 1
2. مصنوعی ذہانت، مصنفین ذیشان الحسن عثمانی، ص34
3. McCarthy, J., Minsky, M. L., Rochester, N., & Shannon, C. E.(1956). A Proposal for the Dartmouth Summer Research Project on Artificial Intelligence .
4. Stuart J.Russell, & Petter Norvig, Artificial Intelligence: A Modern Approach (3rd ed.). Prentice Hall. Section 1.5 Page No.29
5. Harry Potter and the Portrait of What Looked Like a Large Pile of Ash (29 Novmber) 2004، وکی پیڈیا: آزاد دائرۃ المعارف https://harrypotter.fandom.com/wiki/Harry_Potter_and_the_Portrait_of_what_Looked_Like_a_Large_Pie_of-Ash

■

Rashid Kadaree
4/145 Shibli Bagh,Dhorra Mafi,Aligarh
Research Scholar,Department Of Urdu,
Aligarh Muslim University,
Aligarh-202002 (U.P.)
Email.rashidqadri786@gmail.com
Mob.: 7376925305

عبدالحئی

تصوف اور بھکتی: ایک ناتمام مطالعہ

تصوف یا صوفی ازم اسلامی روحانیت کا ایک اہم حصہ ہے۔ یہ روحانیت اسلام کے ساتھ دوسرے مذاہب سے بھی وابستہ ہے۔ روحانیت کا تجربہ انسان کو اپنے خدا سے قرب حاصل کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ خدا کے ساتھ یا اپنے خالق کے ساتھ ایک ہوجانا۔ یہ روحانیت ہے اور یہی تصوف کا اصل معنی بھی ہے۔ یہ روحانیت اور تصوف ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ہندوستان میں جب صوفیائے کرام آئے اور انھوں نے مذہب کی تبلیغ کی تو ان کے نزدیک مذہب کا مقصد عبادات اور پرہیزگاری یا فرائض دینوی کو بجالانا ہی نہیں تھا بلکہ انسان اور اس کے وجود کی شناخت، اس کے باطن کی کھوج بھی تھا۔ انسان کون ہے، کیا ہے اور کیوں ہے؟ یہاں یہ بھی واضح کردینا ضروری ہے کہ یہ روحانیت ہندوستان میں اسلام کی آمد کے پہلے سے موجود تھی۔ ہندوستان میں روحانیت کا سلسلہ ہزاروں سال پرانا ہے۔ وادی سندھ کی تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیب تصور کی جاتی ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق تقریباً 5 ہزار سال پہلے بھی یہ تہذیب موجود تھی۔ رگ وید کا زمانہ بھی کافی قدیم ہے۔ رگ وید میں خدا کی حمد وثنا اور نغموں کو شامل کیا گیا ہے۔ ویدوں کے بعد اپنشدوں کا زمانہ آتا ہے۔ ویدانت اور اپنشد کے فلسفے نے پوری دنیا میں اپنا اثر پھیلایا تھا۔ ایک روایت کے مطابق یونان کا عالم سقراط برہمنوں کی محفل میں اپنشد سننے جاتا تھا اور جو باتیں اسے سمجھ میں نہیں آتی تھیں وہ ایتھنز میں رہنے والے برہمنوں سے دریافت کرتا تھا۔ ہمارے ملک میں اپنشد کے بعد جین منیوں، بودھ بھکشوؤں نے بھی اپنی تعلیمات کے ذریعے عوام میں بیداری پیدا کی۔ یہ سارے سلسلے روحانیت سے ہی جڑے ہوئے ہیں۔ بعد میں جب صوفیوں اور بزرگان دین کی ہندوستان میں آمد ہوئی تو یہ ملک رشی منیوں، سادھو سنتوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ صوفیوں نے یہاں کی قدیم روایتوں اور تہذیبی اقدار کو پیش نظر رکھا۔ صوفیوں نے ایک عام انسان میں ویسی ہی تعلیمات کو عام کیا جو تمام مذاہب میں یکساں قابل قبول تھیں۔ یہ روحانیت کا سلسلہ اسلام میں تصوف، عیسائیت میں رہبانیت، یہودیت میں قبالہ، ہندوؤں میں اپنشد کی تعلیمات اور جین و بودھ بھکشوؤں کی تبلیغ سے ہوتا ہوا گزرتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک نام یہاں لینا مناسب سمجھتا ہوں اور وہ نام سنت دادو کا ہے۔ انھوں نے روحانیت میں ایک نیا تجربہ کیا اور خالق سے یکتائی کا نظریہ پیش کیا۔ کچھ انھیں صوفی امداد کہتے ہیں تو کچھ انھیں سنت دادو دیال۔ ان کا یہ شعر دیکھیں۔

عشق اللہ کی جاتی ہے، عشق اللہ کا رنگ
عشق اللہ کا وجود ہے، عشق اللہ کا رنگ

صوفی سلسلے نے ہر دل میں محبت و اتحاد اور رواداری کو جگایا اور ایک قوم یا ملک سے اوپر اٹھ کر پوری بنی نوع انساں کی بات کی۔ ذات پات، مذہب، رنگ و نسل یا ملک کی بنا پر تفریق کو ختم کیا اور یہاں تک کہ چھوٹے سے چھوٹے جاندار اور نباتات، حیوانات کو بھی خدا کی مخلوق تسلیم کیا اور اس سے محبت کا پیغام دیا۔ ایک صوفی کا قول دیکھیں: زمین پر آہستہ قدم رکھو کیونکہ ہر جگہ زندگی موجود ہے۔

یہی زندگی اور اس کی بقا کا مقصد ہی روحانیت ہے اور اس کا تجربہ انسان کو خدا کی قربت عطا کرتا ہے۔

صوفی ازم اور بھکتی دونوں ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔ ان کی تعلیمات میں اتنی زیادہ مماثلت ہے کہ کبھی کبھی یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ کون ہندو تھا اور کون مسلمان۔ کبیر نے شیخ فریدالدین عطار کا پند نامہ پڑھ رکھا تھا اور جلال الدین رومی اور سعدی کے کلام سے بھی شناسائی تھی۔ کبیر کہتے ہیں کہ: جب تم دنیا میں آئے تو لوگ ہنستے تھے اور تم رو رہے تھے، تم دنیا میں اسی طرح زندگی گذارو کہ لوگ تمھاری موت پر روئیں اور تم ہنسو۔ یہ شیخ سعدی کی ایک رباعی کا ترجمہ ہے۔ کبیر کے چیلوں کی تعداد بھی سیکڑوں میں پہنچتی ہے۔ ان کے روحانی سلسلے کی بارہ شاخیں ہیں۔، ان کے کچھ اہم شاگردوں کے نام ہیں۔ مکھر، جگن ناتھ، دوارکا، بھگوداس، دھرناداس، جیون داس، کمال ابن کبیر، دادو دیال جن کا ذکر گذشتہ سطروں میں آچکا ہے۔ ان کا ایک دوسرا قول دیکھیں جن میں صوفیائے کرام کی تعلیمات کا پورا عکس دکھائی دے جاتا ہے۔

جب نفس غالب آجاتا ہے تو تکبر، غصہ، خودی، دوئی، جھوٹ، حرص، ضد ابھر آتے ہیں اور نیکی ختم ہوجاتی ہے۔ ارواح کا مقام یہ ہے کہ جب محبت، عبادت، اطاعت، وحدت، تزکیہ، رحم، حق اور نیک خوئی جمع ہوجاتے ہیں تو آدمی راہ راست پر آجاتا ہے۔ یہ صوفیائے کرام کی اصطلاحات تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب ہے۔

کبیر کے شاگردوں میں ملک داس، سندر داس، ویربھان وغیرہ کی تعلیمات میں صوفیائے کرام کی تعلیمات کا اثر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ سکھ مذہب کے بانی گرونانک جو کسی زمانے میں نواب دولت خان کے یہاں منشی بھی رہے۔ بعد میں انھوں نے ملازمت چھوڑ دی اور فقیری

اختیار کرلی۔ انھوں نے ایران، سری لنکا اور عرب وغیرہ کے اسفار بھی کیے تھے۔ شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی، شیخ فرید الدین اور ملتان کے مشائخ کی صحبت میں رہے اور ان کا مشن ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فاصلوں کو ختم کرنا تھا۔

اسلام میں لفظ صوفی کا آغاز دوسری ہجری سے ہوتا ہے اور سب سے پہلے ابو ہاشم کوفی کے لیے صوفی کا لقب استعمال کیا گیا۔ کچھ لوگوں نے حضرت ذوالنون مصری کو بھی پہلا صوفی بتایا ہے اور ساتویں صدی بتائی ہے۔ خواجہ حسن بصری اور رابعہ حسن بصری کے بھی نام آتے ہیں۔ ابو ہاشم کوفی ابوسفیان ثوری کے استاد تھے اور 16 ہجری میں وفات پائی۔ صوفی کے لیے عارف کی اصطلاح تیسری ہجری میں رائج ہوئی۔ ابونصر سراج طوسی کی کتاب اللمع فی التصوف کے ص 427 پر درج یہ اقتباس دیکھیں جو مشترکہ تہذیب اور انسانی دلوں میں محبت و اخوت کو جاگزیں کرنے کا پیغام بھی دیتا ہے اور اس کتاب میں بھی صوفی کے لیے لفظ عارف کا استعمال کیا گیا ہے۔

کوئی شخص اس وقت تک عارف نہیں کہلا سکتا جب تک کہ وہ زمین کی طرح نہ ہو جائے کہ سب کو وہ اپنے سینے پر روندنے کا موقع دیتی ہے۔ اور بادل کی طرح نہ ہو جائے جو ہر چیز پر سایہ کرتا ہے اور سورج کی طرح نہ ہو جائے جو ہر کسی کو روشن کرتا ہے اور بارش کی طرح نہ ہو جائے جو ہر چیز کو سیراب کرتی ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں سب سے پہلے جس صوفی اور بزرگ کا نام آتا ہے وہ حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویری عرف داتا گنج بخش ہیں۔ ان کے شاگردوں میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، حضرت نظام الدین اولیا، حضرت خواجہ بختیار کاکی، شیخ فرید الدین گنج شکر، شیخ برہان الدین بلخی، قاضی حمید الدین ناگوری، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، شیخ نصیر الدین چراغ، حضرت امیر خسرو، شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی، حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی وغیرہ کے نام نامی قابل ذکر ہیں جو سب اپنے آپ میں ہندوستان میں صوفی سلسلے کو فروغ دینے اور تصوف کی تعلیمات کو عام کرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔

صوفیائے کرام نے ہمیں ہمیشہ امن و آشتی کا پیغام دیا ہے۔ ہندو گرو ہوں یا مسلم صوفی دونوں ہی معاشرے میں امن و سکون کا قیام چاہتے تھے۔ جہاں وہ فرض عبادات اور تسبیح و اذکار سے خدا سے جڑے رہنے کی تعلیمات دیتے ہیں وہیں خدا کی مخلوق سے محبت کرنے پر بھی زور دیتے ہیں۔ مساوات، بھائی چارہ، ہم آہنگی کا قیام تب ہی ہوگا جب لوگ عشق حقیقی کو سمجھیں گے اور عشق حقیقی کی معنویت کو سمجھنا ہی تصوف اور بھکتی ہے۔ جس نے خدا سے لو لگائی وہ کبھی خدا کے بندوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ رامانج نے عبادت کے لیے بہت سارے مراکز کا قیام کیا تھا اور لوگوں کو یہی تعلیم دیتے تھے کہ اگر آپ نجات چاہتے ہیں تو آپ کو مراقبہ اور عشق الٰہی میں اپنے آپ کو گم کرنا ہوگا۔ انھوں نے تمام مذاہب سے رواداری کو بھی ضروری بتایا ہے ساتھ ہی لوگوں کے درمیان مساوات کا قیام ہی آپ کو خدا کا قرب دلوا سکتا ہے۔ مسلم اور ہندو صوفیائے کرام کے یہاں تو ملتا جلتا تصور ہے۔ یہ ہم سب جانتے ہیں لیکن دنیا کے دیگر مذاہب میں بھی یہ تصور موجود ہے کہ خدا سے قربت کے لیے آپ کو خدا کے بندوں سے محبت کرنی ہوگی اور ان کے لیے فلاح و بہبود کے کام کرنے ہوں گے۔ لبریشن تھیالوجی کا تصور (آزادی مرکوز الہیاتی نظریہ) بھی اسی تھیوری پر مبنی ہے۔ جس کے تحت غریبوں کی حالت کو سدھارنے کے لیے ان میں کلام مقدس کی تشریح کی جانی چاہیے، ساتھ ہی ان میں معاشرتی اور سیاسی تبدیلی لانے کے لیے ان کے کام کاج اور رہن سہن میں بھی ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ کلیسا نے ایک دور میں غریبوں، مزدوروں اور لاچاروں کو وہ ترجیح نہیں دی تھی جس کے وہ حقدار تھے۔ ان کا استحصال کیا جاتا رہا تھا لیکن لبریشن تھیالوجی میں غریبوں کے حقوق کا دفاع کرنے اور انجیل مقدس کے پیغام کو مرکزی مقام دینے کی بات کہی گئی ہے۔ آزادی مرکوز الہیاتی نظریہ لاطینی امریکی کیتھولک فرقے کے ساتھ وابستہ ہے۔ یوں تو اس تصور کی تاریخ کافی قدیم ہے لیکن 1971 میں اسے گستاؤ گوتیرز نے باضابطہ ایک تصور کی شکل دی اور اپنی کتاب A Theology of Liberation میں تفصیل سے بیان کیا۔

رامانج کی طرح رامانند نے بھی ذات پات اور چھوا چھوت اور ورن آشرم کو ایک بہتر معاشرے کی تشکیل میں رکاوٹ بتایا۔ کبیر بھی رامانند کے ہی شاگرد تھے جن کا قول بہت مشہور ہے کہ ذات پات ہندومت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ انھوں نے مذہب کو بھکتی بتایا اور بھکتی عشق الٰہی تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ بعد کے تمام ہندو صوفیوں دادو دیال، ملوک داس، بابا لال، رام موہن رائے، کشیپ چندر سین، سوامی دیانند سرسوتی وغیرہ نے بھی تمام انسانوں کے ساتھ محبت کا سلوک اور انصاف کرنے کی بات کہی ہے۔ مسلم صوفیائے کرام کے یہاں بھی باہمی تعاون کا تصور موجود ہے۔ صوفیائے کرام نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا اور ایک اچھے معاشرے کے قیام کے لیے دونوں قوموں کو باہمی پیار و محبت سے رہنے کا درس دیا ہے۔ ترقی کے حصول کے لیے معاشرے میں امن و سکون کا قیام بہت ضروری ہے۔ سماج، معاشرے اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ہمیں تصوف اور بھکتی کی تعلیمات اور تصورات کو فروغ دینا ہوگا تاکہ معاشرے میں امن و آشتی کی فضا قائم ہو سکے اور تمام انسان آپس میں اتحاد و اتفاق سے رہ سکیں۔

ہندوستان میں آٹھویں صدی میں شنکر اچاریہ نے دھرم میں سدھار کرنے کی کوششیں کیں۔ ان کی کوششوں نے ہی بعد میں بھکتی تحریک کا روپ لے لیا۔ بھکتی تحریک کے بانی رامانج وشنو تھے اور ان کے پیروکار وشنو کہلاتے ہیں۔ صوفی ازم اور بھکتی میں عشق الٰہی کی بات سرفہرست رکھی گئی ہے۔ اتھر وید میں لکھا ہے کہ صرف اپنے لیے زندہ نہ رہو سب کے ساتھ مل کر جیو۔ گیتا کا اپدیش ہے کہ جو شخص کسی انسان سے نفرت نہیں کرتا وہی بہتر ہے۔ جبکہ حدیث میں ہے کہ الخلق کلھم عیال اللہ۔ ساری دنیا خدا کا کنبہ ہے۔

مختصر یہ کہ ہندو مسلم صوفی سنتوں کی تعلیمات تمام انسانوں کے لیے تھیں اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دینے میں صوفیوں اور سنتوں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے اور ان کی کوششوں کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بھکتی اور تصوف کے درمیان جو ایک سب سے اہم نکتہ نظر آتا ہے وہ یہ کہ اپنے خالق سے اپنے تخلیق کرنے والے سے وفا کی جائے اور اسی کی پرستش کی جائے اور اس کی کسی بھی تخلیق کو کوئی تکلیف نہ دی جائے۔

(اس مضمون کی تیاری میں اسرار روحانیت، تاریخ تصوف، تصوف کا انسائیکلو پیڈیا، عشق اور بھکتی، تصوف اور بھکتی جیسی کتابوں سے مدد لی گئی ہے)۔

■

Dr. Abdul Hai
GayaCollege, Sherghati Rd
A P Colony
Gaya-823001 (Bihar)
Mob.:9899572095
ahaijnu@gmail.com

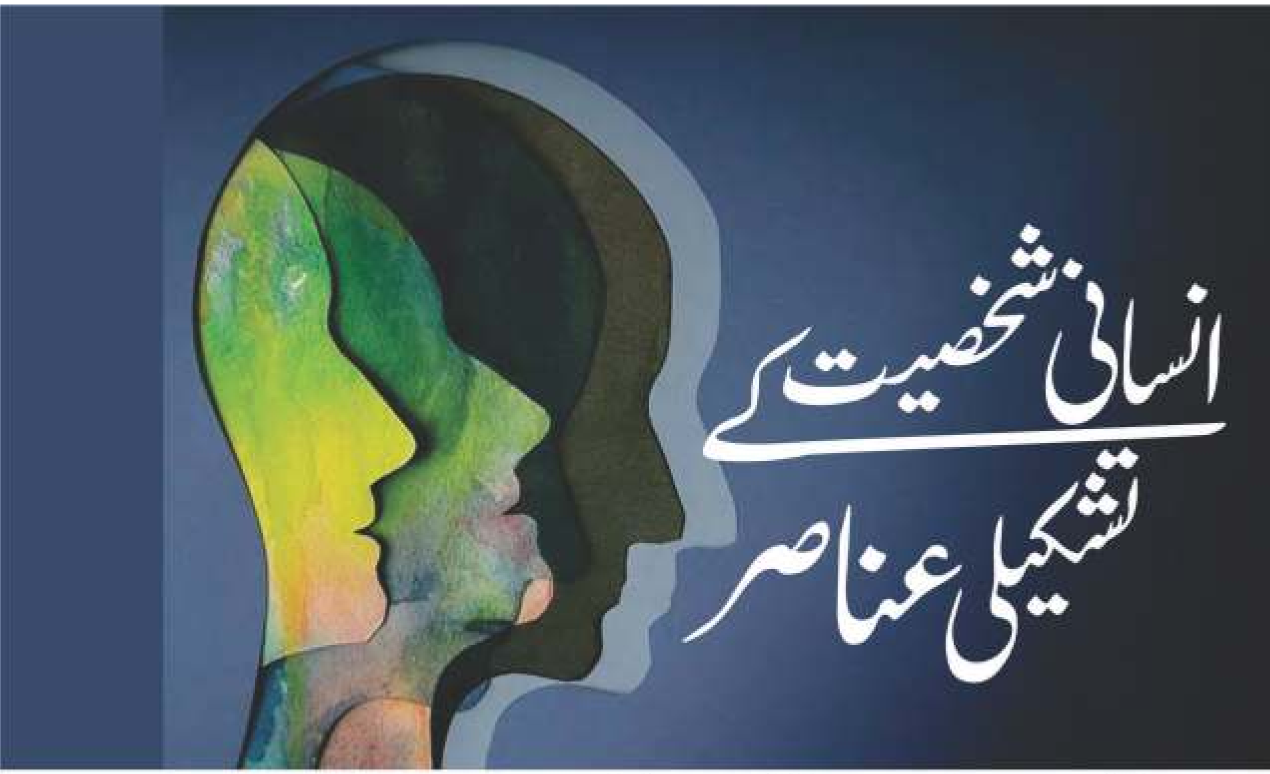

احسان حسن

انسانی شخصیت کے تشکیلی عناصر

سماج میں مختلف انواع و اقسام کے لوگ رہتے ہیں۔ سب کے مزاج، عادات و اطوار الگ الگ ہوتے ہیں، سب کی پسند و ناپسند اور پھر اسی حساب سے ترجیحات بھی جدا جدا ہوتی ہیں۔ لوگوں کا عمل جو کہ بظاہر ہمارے سامنے ہوتا ہے وہی ان کے بارے میں ہماری رائے قائم کرنے کا ایک واضح اور تقریباً واحد ذریعہ ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ اسی عمل میں پختگی کی صورت بنتی ہے، جس کو ہم کسی کے اندر مستحکم دیکھتے ہیں اور پھر اسی مناسبت سے شخصیت کا تعین کرنے لگتے ہیں۔ ندا فاضلی کا ایک شعر ہے۔

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

شخصیت کے حوالے سے اس شعر کی اہمیت مسلم ہے اور جب بھی ایسی کوئی گفتگو ہوتی ہے جس میں انسان کی شخصیت پر بحث ہو تو یہ شعر بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے۔ شخصیت کو انگریزی میں Personality کہتے ہیں۔ Personality لیٹن لفظ Persona سے بنا ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے نقاب یا مکھوٹا۔ سب سے پہلے گریک آرٹسٹوں نے تھیٹر میں اپنے کام کے مطابق منھ پر ایک مکھوٹا لگانے کا چلن شروع کیا۔ اس مکھوٹے کو Persona کہا جاتا تھا۔ اس پرسونا سے شخصیت کا لفظ پرسونالٹی وجود میں آیا۔ ایک انسان حقیقت میں کیا نظر آتا ہے۔ اس کی شکل و صورت کیسی ہے؟ دوسروں کے سامنے خود کو کس طرح پیش کرتا ہے جب کہ واقعی وہ ویسا نہیں ہوتا، یہ بھی شخصیت ہے۔ شخصیت ایک طرح کا رول (ROLE) ہے جس کو انسان اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں طرح طرح سے انجام دیتا ہے، جیسے تجارتی کام، سیاسی کام، مذہبی کام، معاشرتی کام اور خاندانی و گھریلو کام وغیرہ۔ ایک شخص کی اپنی پوری خصوصیات ہی شخصیت ہے اس میں جسمانی و دماغی دونوں ہی خوبیاں شامل ہیں۔

ایک انسان کی شخصیت کی تشکیل میں ماحول، خاندان، اسکول، کالج، دوست، عزیز و اقارب وغیرہ غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اندر سے ایک انسان کیا ہے اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ بظاہر ایک انسان اپنے کام، اپنے اخلاق کے ذریعے دوسروں پر جیسا اثر ڈالتا ہے اسی کے مطابق اس کی شخصیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ لیکن انسان حالات کے مطابق اپنے مزاج، ڈھنگ، برتاؤ، اخلاقی رویے کو بڑی حد تک تبدیل کرتا رہتا ہے ایسی صورت میں شخصیت کو سمجھنا کافی مشکل ہے۔ اب ہم مختلف دانشوروں کے ذریعہ دی گئی شخصیت کی چند تعریفیں پیش کرتے ہیں جو کسی حد تک شخصیت کو سمجھنے و پرکھنے میں مددگار ہو سکتی ہیں۔

آلپورٹ کے مطابق:

"شخصیت ان تمام خصوصیات کی محرک ہے جو ذاتی طور پر ایک انسان کی اندرونی، دلی، دماغی اور جسمانی خصوصیات ہوتی ہیں اور انھیں خصوصیات کی بنا پر ایک انسان کے ذاتی چال چلن، برتاؤ سلوک اور خیالات کو متعین کیا جاتا ہے۔"

(بحوالہ 'منووگیان کی پدھتیاں اور سدھانت' از ڈاکٹر جے ڈی شرما، ص 545)

آل احمد سرور کے لفظوں میں:

"شخصیت اس مجموعی، انوکھی، ممتاز اور منفرد خاصیت کا نام ہے جو وراثت اور ماحول کے ایک دوسرے پر پیہم کبھی مخالف اور کبھی موافق اثرات سے وجود میں آتی ہے۔" (نظر اور نظریہ از آل احمد سرور، ص 14)

اس طرح شخصیت کی تعمیر میں جسمانی خصوصیات کے ساتھ بچپن کی تربیت کا اثر ابتدائی عمر ہی سے پڑتا ہے۔ سماجی رشتے اس پر مختلف طریقوں سے اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ کوئی بڑا واقعہ، کوئی غیر معمولی شخص، کوئی بڑی مذہبی سماجی یا سیاسی تحریک ذہن کو متاثر کر سکتی ہے اور شخصیت کی تشکیل میں اہم رول ادا کر سکتی ہے۔

سائیکوجسٹ کے۔ یگ نے شخصیت کی دو قسمیں بتائی ہیں، ایکسٹروورژن اور انٹروورژن، ایکسٹروورژن انسان اندرونی دنیا کے مقابلے میں اپنی باہری دنیا کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ جب کہ انٹروورژن قسم کے لوگوں میں ایک خود مشغولیت سی پائی جاتی ہے اور یہ اپنی اندرونی دنیا کو باہری دنیا کے مقابلے میں زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ کے۔ یگ کے لفظوں میں:

"انٹروورژن ایک ایسی خاصیت ہے کہ یہ جس انسان میں پائی جاتی ہے وہ سب سے پہلے اپنے بارے میں سوچتا ہے اور فکر کرتا ہے۔ اس کے برعکس ایکسٹروورژن ایک ایسی خاصیت ہے کہ وہ جس انسان میں ہوتی ہے وہ دوسروں کے متعلق یعنی قوم اور عوام کی بھلائی کے متعلق زیادہ سوچتا ہے۔"

(بحوالہ 'چارٹ ڈائل سائیکولوجی' ازالبرٹ جیمس، ص 417)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ انٹروورٹ شخصیت کے انسان اپنے ہی متعلق زیادہ سوچتے ہیں۔ وہ دنیا کو اپنے خیالات ، احساسات اور کاموں کے لحاظ سے دیکھتے ہیں اور سخت مزاج ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ایکسٹروورٹ شخصیت کے لوگوں کا رجحان باہری دنیا کی طرف ہوتا ہے' وہ ان چیزوں میں زندگی کی قیمت سمجھتا ہے اور اس کے قریب آتا ہے۔ وہ آسانی سے مختلف حالات میں خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیتا ہے اور معاشرے سے پیار کرتا ہے۔ انٹروورٹ انسان ایکسٹروورٹ کی بنسبت ترنم کو زیادہ پسند کرتا ہے اور ہنسی مذاق کو زیادہ ترجیح دیتا ہے۔ اس کے علاوہ انٹروورٹ احساس کمتری کا شکار ہوتا ہے اور اس کی خواہشات ضرورت سے زیادہ ہوتی ہیں۔ بڑے سے بڑا کام کرنے کے باوجود وہ احساس کمزوری کا شکار رہتا ہے اور اپنی کامیابیوں کو ہمیشہ کمتر ہی آنکتا ہے۔ لیکن ایکسٹروورٹ اپنی مرضی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اپنی ہی مرضی کے مطابق سب کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جو کچھ سوچتے اور سمجھتے ہیں اسی لحاظ سے عمل بھی کرتے ہیں۔ انٹروورٹ کی بنسبت اپنے خیالات و مزاج کو جلدی جلدی تبدیل کرتے رہتے ہیں اور اپنے آس پاس کے ماحول اور ہونے والی واردات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ زیادہ سوشل ہوتے ہیں۔

سائیکولوجسٹ کے۔ ینگ نے ایکسٹروورٹ شخصیت کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے:

''1. ایکسٹروورٹ انسان دنیا سے ہمدردی رکھتا ہے اور تنقیدی ڈھنگ سے اس کے بارے میں سوچتا ہے جس کی بنیاد سچائی پر ہوتی ہے۔ ایسا انسان اپنے ذاتی کاموں اور خیالوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

2. ایکسٹروورٹ انسان وہ ہوتا ہے جو باہر کے خیالوں سے زیادہ متاثر ہوتا ہے اور حالات کے مطابق کام کرتا ہے۔ معاشرے کے قانون کو نبھاتا ہے۔ وہ چاروں طرف کے لوگوں کے خیالات سے بہت جلد متاثر ہوتا ہے اور اسی طرح کام کرنا چاہتا ہے۔

3. ایکسٹروورٹ لوگ اپنے خیال کو عمل میں لاتے ہیں۔ وہ معاشرے کو جیسا دیکھتے ہیں ویسا ہی ظاہر کرتے ہیں۔ ایسے لوگ دنیا کو خوش کرتے ہیں۔

4. ایکسٹروورٹ لوگ دنیا سے صرف اشارہ حاصل کرتے ہیں اور پھر اپنے ڈھنگ سے کام کرتے ہیں۔'' (بحوالہ 'ویکتیتو' ازرام بہاری سنگھ تومر، ص 42-241)

اسی طرح انٹروورٹ شخصیت کو بھی کے۔ ینگ نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے:

''1. پہلی طرح کی انٹروورٹ شخصیت دنیا کی طرف زیادہ نہیں دیکھتی۔ ایسے لوگ عمل بھی نہیں کرتے۔ کپڑے، روپے اور دوسری چیزوں کی طرف سے بھی لاپرواہ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ خیالوں، قانونوں اور آدرشوں کی دنیا میں کھوئے رہتے ہیں۔

2. دوسری طرح کی انٹروورٹ شخصیت کے لوگ اپنے ہی کاموں اور خیالوں میں ڈوبے رہتے ہیں۔ وہ دن میں خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ خاموش ہوتے ہیں اور دنیا سے بالکل دور۔

> اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو ایک انسان میں ایکسٹروورٹ اور انٹروورٹ دونوں کی خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ یعنی ایک انسان ایکسٹروورٹ اور انٹروورٹ دونوں ہوتا ہے اور یہ دونوں خصوصیات ایک انسان میں ایک ہی وقت میں پائی جاتی ہیں۔

3. تیسری طرح کے انٹروورٹ لوگ ہر چیز کو اپنے ہی نظریے سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے ہی نفس کو اہمیت دیتے ہیں۔

4. چوتھی طرح کے انٹروورٹ لوگ اپنی اندرونی دنیا کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس سے اشارے حاصل کرتے ہیں اور اپنے آپ ہی میں رہتے ہیں۔ دوسروں کی فکر نہیں کرتے۔ مذہبی لوگ، درویش، آرٹسٹ، سنکی وغیرہ اسی میں آتے ہیں۔''

(بحوالہ 'ویکتیتو' ازرام بہاری سنگھ تومر، ص 242)

اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو ایک انسان میں ایکسٹروورٹ اور انٹروورٹ دونوں کی خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ یعنی ایک انسان ایکسٹروورٹ اور انٹروورٹ دونوں ہوتا ہے اور یہ دونوں خصوصیات ایک انسان میں ایک ہی وقت میں پائی جاتی ہیں۔ ان دونوں خصوصیات میں سے جو زیادہ طاقتور ہوتی ہے وہ دوسری خصوصیت پر فتح پالیتی ہے اور ذہن پر حاوی ہو جاتی ہے پھر انسان کا برتاؤ اسی کے مطابق ہوتا ہے۔ دوسری خصوصیت جو ذہن میں دب جاتی ہے وہ بھی پوشیدہ طور پر ذہن میں برقرار رہتی ہے لیکن ختم نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کوئی انسان ایکسٹروورٹ ہے تو ناواقفیت میں وہ انٹروورٹ بھی ہوگا۔ اگر جانکاری اور واقفیت میں انٹروورٹ ہے تو وہ ناواقفیت میں ایکسٹروورٹ بھی ہوگا۔

واقعی شخصیت ہی کسی شخص کا جوہر ہوتی ہے۔ شخصیت کے پیچھے بہت سے پہلو پوشیدہ ہوتے ہیں جو شخصیت کی نشوونما اور اس کی تعمیر کے لیے ذمہ دار ہوتے ہیں، مثلاً آدمی کس ماحول میں پیدا ہوا، اس کے والدین کیسے رہے ہیں، اس کی پرورش کس طرح ہوئی، اس کی تعلیم وتربیت کا کیا معیار رہا وغیرہ۔ اس کے علاوہ کچھ چیزیں فطری ہوتی ہیں۔ خداداد ہوتی ہیں جو کسی شخص کی شخصیت میں انفرادیت کا باعث بنتی ہیں۔

اس طرح اگر کوئی اپنی شخصیت تبدیل کرنا چاہے تو اس کو ایک زبردست چیلنج سے گذرنا ہوگا۔ جس میں نہ صرف اس کے اپنے عادات واطوار شامل ہوں گے بلکہ ماحول، معاشرے اور خود اس شخص کی اپنی انا کی تبدیلی کا مرحلہ بھی ہوگا۔ اسے ہم ایک چھوٹے سے واقعے کے ذریعے بھی سمجھ سکتے ہیں۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک نام و نمود والا، باعزت و باوقار شخص کچھ اس قسم کے اتفاقات کی گردش میں پھنسا کہ بری طرح ذلیل وخوار ہوکر رسوا ہوگیا۔ اس کی انا نے سماج میں اب مزید منھ دکھانا گوارہ نہ کیا۔ اس شخص نے اپنا شہر اپنا وطن ترک کر دیا مع افراد خانہ کے اور بہت دور کسی ایسے شہر میں جا کر آباد ہو گیا جہاں پر اس کو اور اس کے گھر والوں کو کوئی بھی جانتا پہچانتا نہیں تھا۔ سب کچھ چھوڑ کر بالکل نئی جگہ پر گمنام سی زندگی اس شخص نے اپنالی۔ بس اتنا سا واقعہ ہے۔ اب

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس شخص کو اپنی شخصیت کے ساتھ کتنی جنگیں لڑنی پڑی ہوں گی۔ کہاں روز سو پچاس ہاتھ سلام و تسلیم میں اٹھا کرتے تھے، کہاں اب کوئی پہچاننے والا بھی نہیں ہے۔ اپنی ذات اور اپنی انا سے ایک لڑائی پرانی جگہ پر تھی جس کے سبب وہاں سے ہٹنا پڑا اور اب نئی جگہ پر بھی ذات سے کائنات کے درمیان جنگ واقع ہے۔ انسان اپنی ایک زندگی میں ہی متعدد شخصیتوں کو ڈھوتا پھرتا ہے اور ان سب کے مابین ایک تصادم برپا رہتا ہے۔ ایک ہی انسان بیک وقت دو مختلف جگہوں پر چھوٹی اور بڑی یا ہلکی اور وزن دار شخصیت کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ اس کی یہی سب شخصیتیں آپس میں مل کر ایک مرکزی شخصیت کی تعمیر کرتی ہیں۔ یہی مرکزی شخصیت ہی عام طور پر سماج میں ہماری شناخت کا باعث بنتی ہے۔ اس عکس کا ایک معکوس بھی ہوتا ہے یعنی الگ الگ افراد کی نظروں میں ہماری الگ الگ شخصیت مرتب ہوسکتی ہے۔ اب اس میں درستگی اور واقعیت کا معاملہ افراد کی اپنی اپنی بصیرتوں پر منحصر ہوتا ہے۔ ایک ادیب ایک فنکار کے لیے کسی طوائف کی شخصیت قابل ستائش ہوسکتی ہے تو ایک زاہد کے لیے قابل مذمت۔

داخلی اور خارجی شخصیت کا معاملہ بھی دلچسپ ہے۔ خارجی طور پر جیسا کہ ابھی ذکر ہوا کہ بیشتر مدار سامنے والے کی سمجھ اس کی فہم اور اس مخصوص نقطۂ نظر پر ہوتا ہے جو کسی شخص کی شخصیت کے وصف اس کے عمل کا جائزہ لے رہا ہوتا ہے۔ چونکہ عمل ہی ظاہر ہے، اس لیے کسی کی نیت کیا ہے اور کوئی عمل راضی خوشی ہو رہا ہے یا بہ وجہ مجبوری، اس حقیقت کا پتہ لگا پانا بہت مشکل ہے۔ اسی طرح دوسرا پہلو بھی ہے کہ کسی شخص کے نیک عمل سے اگر فوری طور پر ہم اس کی شخصیت کا تعین کرتے ہیں اور بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ اس نیک عمل کے پس پشت آئندہ کی کوئی سازش کارفرما تھی تو پھر اس شخص کی شخصیت کو کس قسم کی شخصیت قرار دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ شخصیت کوئی چند اعمال کی بنا پر یا محض چند روزہ کیفیتوں اور صورتوں کے مدنظر طے کی جانے والی شے نہیں ہے۔ شخصیت میں مزاج کا بڑا دخل ہوتا ہے، کوئی شخص اگر مزاجاً نیک ہے تو پھر بہت دیر تک آپ اس کو برے سلوک کے ساتھ نہیں پاسکیں گے کیوں کہ اس کے مزاج ہی میں برائی نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص مزاجاً برا ہے تو اچھائی اور نیکی کے خول میں وہ بہت دیر تک خود کو پوشیدہ نہیں رکھ سکے گا اور کسی نہ کسی بہانے اس کا اصلی چہرہ جلد ہی سامنے آجائے گا۔ جب تک کہ کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ نہ پیش آجائے کہ آدمی قلب ماہیت کے دور سے گذرے اور وہ مخصوص واقعہ اس کے مزاج کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دے، تب تک شخصیت میں تبدیلی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ شخصیت ایک دیرپا اور مستقل صفت کیفیت ہوتی ہے، جس میں نہ تو اتنی جلدی اور نہ ہی اتنی آسانی سے کوئی تبدیلی واقع ہوسکتی ہے۔ اگر ایک بار کوئی چیز شخصیت کا حصہ بن جاتی ہے تو اس کو چھوڑنا، الگ کرنا اور ترک کرنا بڑا دشوار کن مرحلہ ہوتا ہے۔

انسان کی شخصیت تہ بہ تہ پرت در پرت ایک ایسے بٹوے کی مانند ہوتی ہے جس میں سے کب کون سا سکہ چھوٹا بڑا، کھرا کھوٹا باہر نکل آئے، کوئی نہیں جانتا۔ ہم محض قیاس آرائی کر سکتے ہیں۔ معاملہ عمل اور رد عمل کے درمیان تعین کا ہے جس کے متعلق یقینی طور پر کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔

شخصیت کے ایک اور پہلو پر بات کر لیتے ہیں اور وہ ہے خود کی ہی نظروں میں آدمی کی اپنی شخصیت یعنی خود بینی و خود خیالی۔ آدمی سب سے زیادہ خود کے ہی قریب ہوتا ہے۔ اپنے بارے میں جتنی معلومات خود ہمیں ہوگی اتنی کسی بھی دیگر شخص کو نہیں ہوسکتی ہے۔ ہم کتنے بھلے برے ہیں یہ ہم سے بہتر بھلا کوئی کیا جانے گا۔ بس یہیں سے شروع ہوتی ہے شخصیت میں خود بینی یا خود خیالی کی بحث۔ کوئی شخص اپنے تعلق سے کیسی سوچ رکھتا ہے، وہ خود کو کس طرح کا انسان گردانتا ہے یہ ایک نہایت ایمانداری والا اور ذاتی قسم کا سوال ہے کہ ہماری نظروں میں ہمارا مقام کیا ہے؟ ویسے اس سوال میں ایمانداری تو فطری بات ہے کہ خود سے خود کے ہی بارے میں کوئی کیا جھوٹ یا مبالغے سے کام لے گا۔ یہ مرحلہ اکثر تب پیش آتا ہے جب ہمیں کوئی اہم قدم اٹھانا ہو، کوئی قوت ارادی کا فیصلہ کن معاملہ درپیش ہو اور ذمہ داری و جواب دہی خود کے کندھوں پر ہو تو آدمی محاسبے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے کہ ہماری اصلیت تو ہم جانتے ہیں کہ ہم سے کیا اور کتنا ہو پائے گا۔ خود خیالی اور خود بینی کا جو تصور ہے اس کی ایک سب سے بڑی طاقت یہ ہے کہ اگر ایک بار انسان اپنی شخصیت کے تعلق سے آگاہ ہوگیا تو پھر اس کے سامنے کسی قسم کی کوئی کشمکش نہیں رہ جاتی ہے اور وہ بے نیازانہ عمل شروع کر دیتا ہے۔

شخصیت میں کچھ پوشیدہ عناصر بھی ہوتے ہیں جو عام طور پر روزمرہ کے معاملات میں نظر نہیں آتے ہیں لیکن جب ہم کسی غیر متوقع اور غیر معمولی قسم کے واقعے سے دوچار ہوتے ہیں تو شخصیت کا یہ پوشیدہ عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ یہ مثبت اور منفی دونوں طرح کا ہوسکتا ہے۔ جس کے لیے پرورش و پرداخت اور ذہنی تربیت ذمہ دار ہوتی ہے۔ ذہنی تربیت کا واسطہ گرد و پیش کے ماحول سے ہوتا ہے۔ قنوطی اور حوصلہ شکن ماحول سے مثبت اور دلیری بھرے اقدام کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح مثبت اور حوصلہ مندی کی فضا میں منفی اثرات مرتب نہیں ہوا کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ شخصیت کا جو پوشیدہ پہلو ہے جس سے خود بھی کوئی شخص واقف نہیں ہوتا، وہ جب اتفاقیہ طور پر دفعتاً سامنے آتا ہے تو وہ مخصوص رویہ کوئی علیحدہ یا شخصیت سے باہر کی چیز نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کی جڑیں ہماری شخصیت میں ہی گہرے طور پر تہ داری کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ اس طرح انسان کی شخصیت تہ بہ تہ پرت در پرت ایک ایسے بٹوے کی مانند ہوتی ہے جس میں سے کب کون سا سکہ چھوٹا بڑا، کھرا کھوٹا باہر نکل آئے، کوئی نہیں جانتا۔ ہم محض قیاس آرائی کر سکتے ہیں۔ معاملہ عمل اور ردعمل کے درمیان تعین کا ہے۔ جس کے متعلق یقینی طور پر کوئی پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی۔

کتابیات

- فرائڈی تناظر، مرتبہ تہذیب صدیقی، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی
- بیکتیتو از رام بہاری سنگھ تومر
- نظر اور نظریہ از آل احمد سرور
- منووگیان کی پدھتیاں اور سدھانت از ڈاکٹر جے ڈی: شرما
- چارٹ ڈائل سائیکولوجی از البرٹ جیمس

■

Dr. Ehsan Hasan
Assistant Prof., Dept of Urdu
Banaras Hindu University
Varanasi- 221005 (UP)
Mob.:9935352141
ehasan.hasan1@bhu.ac.in

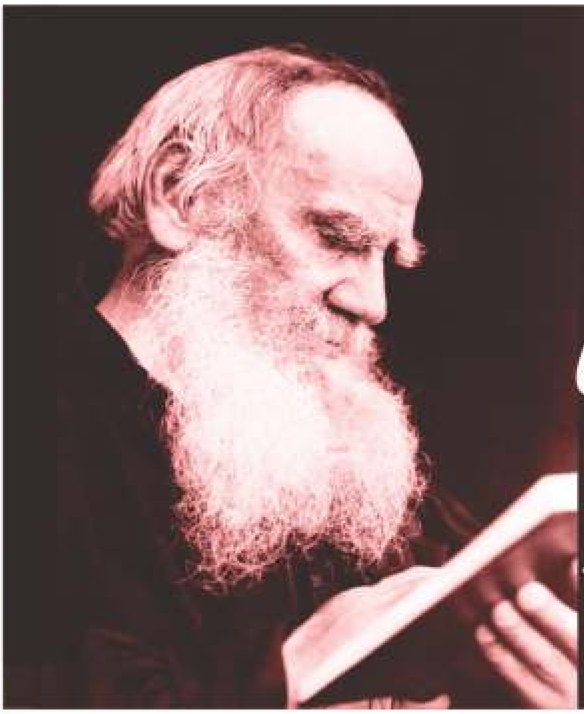

محمد یٰسین

تالستائے

بحیثیت انسان اور فنکار

نومبر 1910 کی ایک صبح کو تالستائے اپنی آبائی جاگیر کو چھوڑ کر اس روحانی آزادی کی تلاش میں نکل پڑا جو اسے موت سے قبل نہیں حاصل ہو سکی۔ جارج آردیل نے اس کی موت کو کنگ لیئر (King Lear) کی موت سے مشابہت دی ہے اور پروفیسر عیسائیہ برلن نے اسے یونانی بادشاہ عدیپس کا (Dedipus) ہم مقدر قرار دیا ہے۔ ان دونوں تشبیہوں میں ایک عظیم مفکر اور فنکار کی ایک معمولی اسٹیشن ماسٹر کے گھر میں موت مخصوص اہمیت رکھتی ہے۔

تالستائے کی موت اس کی پیدائش کے بیشتر تضادات کی آخری کڑی ہے۔ یہ سلسلہ اس کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وہ رئیس گھرانہ میں پیدا ہوا اور عوام سے نزدیک ہونے کے باوجود طبعاً امارت پسند ہی رہا۔ گورکی نے غالباً سچ ہی کہا تھا کہ اپنی ذاتی زندگی میں زبردست انقلاب کے باوجود تالستائے غیر شعوری طور پر یہ محسوس کرتا رہا کہ اس کا تعلق مالکان سے ہے اور وہ عوام سے خدمت اور تعظیم کا مستحق ہے۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ تالستائے کے یہاں ایک خاص قسم کا پندار ملتا ہے۔ اسے اپنی ذات پر فخر کے علاوہ اپنے خاندان اور اعلیٰ نسبی پر بھی ناز ہے۔

دوسرا تضاد یہ ہے کہ تالستائے خاندان اور مزاج کے اعتبار سے قدامت پسند تھا مگر اقلیت پسندی اور مخصوص مسیحی عقیدہ کی بدولت وہ انقلابی ہو گیا۔ وہ سماجی انقلاب کا مبلغ نہیں تھا بلکہ اخلاقی انقلاب کا حامی تھا چنانچہ 'اعتراف' کی تصنیف کے بعد بھی ندامت یا پشیمانی کے احساس سے دو چار نہیں ہوتا۔ اس زمانے میں اس کی حیثیت اس جاگیر دار کی تھی جس نے تلوار سے صلیب بدل لی ہو۔

تالستائے کی اخلاقی اور ذہنی انقلابیت سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ انسان اپنی ذات میں بنیادی تبدیلی کرے اور خود سے ماورا ہو جائے۔ اس کے نزدیک انسان کے اندر اگر تبدیلی ممکن ہے تو وہ دلوں میں تبدیلی سے ممکن ہے۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں تالستائے نے اپنے اندر یہ تبدیلی محسوس کی تھی، لہٰذا وہ دوسروں کے یہاں بھی یہی دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ بات واضح ہے کہ وہ 'کردار کا کم لیکن گفتار کا غازی' زیادہ تھا اس لیے اس کا اثر مغربی یورپ میں منفی ہی رہا۔ وہ لوگوں کو کردار کی بلندی اور اخلاقی تکمیل کے لیے مشورہ دے سکتا تھا لیکن عملی اعتبار سے اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکا۔ تالستائے کے یہاں زندگی کے بدلتے ہوئے اور قلب ماہیت کا وہ عرفان نہیں ملتا جو نطشے اور دوستووسکی کا خاصہ ہے لیکن اس کا نطشے کے اس قول سے مشابہت رکھتا ہے جس میں اس نے تلقین کی ہے کہ "جو تم ہو، ہو جاؤ" (Become who you are) تالستائے کا نظریہ خودی پر مبنی ہے لیکن اس کے یہاں شخصیت پرستی کو کم دخل ہے۔ اس نے ہر انسان کے اندر فطری صلاحیت اور جودت طبع کا اعتراف کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا یہ خیال بھی اہم ہے کہ سماجی زندگی میں مروجہ رسوم کی کورانہ تقلید سے یہ صلاحیتیں سلب ہو سکتی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ تالستائے کا مطلب اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں سے نہیں بلکہ نفسیاتی معنی میں ہے یعنی وہ خوبیاں جو سادگی اور تازگی سے پیدا ہوتی ہیں اور جو داخلی وسائل پر مشتمل ہیں۔ تالستائے نے اپنے کرداروں کو اسی نظریے کے تحت تخلیق کیا اور اس کے تمام چھوٹے بڑے کرداروں میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم ملتی ہیں۔ اپنے کردار میں تمام انسانی ہمدردی کے باوجود تالستائے اکثر مایوس ہو کر انسان دشمنی پر اتر آتا تھا۔ اس کے غصے کی زد میں نہ صرف افراد بلکہ وہ لوگ بھی آ جاتے تھے جو سماجی فرائض انجام دیتے ہیں مثلاً سیاست داں، سرکاری ملازم، افسر، پیشہ ور وکیل، جج، استاد، مصنف اور فنکار۔ وہ بنیادی طور پر انسان کو معصوم اور بے ضرر نہیں سمجھتا تھا اور نہ وہ اس خیال سے متفق تھا کہ انسان کو اس کا ماحول بگاڑتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی رگوں میں شر کا عنصر خون کے ساتھ دوڑتا ہے اور اپنی ذہنی اور روحانی یا اخلاقی قوت ہی سے اس کا ازالہ کر سکتا ہے۔ تالستائے کی مسیحیت میں عقیدہ کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ وہ اپنے اندر آدم اور بنی آدم کی تمام خوبیاں اور خرابیاں پاتا تھا جن کے بغیر انسان مکمل نہیں ہو سکتا۔

اپنی زندگی کے آخری تیس سالوں میں تالستائے کو مستقل ایک طرح کی کشمکش کا سامنا رہا۔ تالستائے بحیثیت ناصح اور تالستائے بحیثیت مصنف، تالستائے بحیثیت اخلاقی معلم اور تالستائے بحیثیت فنکار ان مختلف پہلوؤں میں تضاد نمایاں ہے لیکن ہمیں ان کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ تالستائے نے خود کہا تھا کہ مصنف کا مقصد کسی مسئلہ کو مستقل طور پر حل کرنا نہیں بلکہ اپنے پڑھنے والوں کو زندگی کی مختلف اور لا انتہا ہیئتوں کو دیکھنے پر مجبور کرنا ہے، تالستائے کی پیغمبری اور فن کاری ایک ہی ذہن کی پیداوار ہے لہٰذا ان میں داخلی رابطہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے

یہاں یہ ربط و تنظیم مختلف متضاد عوامل کے باہمی تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے دل و دماغ میں بسنے والے سینکڑوں افراد کے درمیان مستقل مکالمہ اور خیالات کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس کے نمائندہ کرداروں کے یہاں جدلیاتی رجحانات خود اسی شخصیت کا براہِ راست نتیجہ ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ تالستائے نے اپنی تخلیقات کی بنیاد متضاد کیفیتوں پر رکھی جس سے ان میں عجیب وغریب پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے لیکن وہ کبھی ان مبہم کیفیات میں نہیں کھو جاتا۔ وہ اپنا راستہ متعین رکھتا تھا اور اندر جانے یا باہر نکلنے کے لیے سمتوں کی جس واقفیت کی ضرورت ہے وہ اس کے اندر بخوبی موجود تھی۔

تالستائے کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے ہمیں اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس کے افسانوں میں زندگی اپنی تمام تر آب و تاب اور جلوہ نمائیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے اور ہم اکثر یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں کہ کس حد تک یہ ادبی کارنامے اس کی ذاتی زندگی کا عکس ہیں اور کسی حد تک محض تخیل کی پیداوار۔ یہ بات کچھ تعجب خیز نہیں کہ ناول نگار اور ڈرامہ نویس اپنی تصانیف کے لیے اپنے زمانہ کے سماجی، سیاسی، معاشرتی زندگی، اس دور کی اہم شخصیات اور مخصوص واقعات سے متاثر ہوتے ہیں ہم جانتے ہیں کہ "بڈن بروکس" (Budden Brooks) میں طامس مان کی خاندانی زندگی کا عکس اسی طرح ملتا ہے جس طرح ڈکنس کی ذاتی زندگی کا چربہ ڈیوڈ کاپر فیلڈ (David Copperfield) میں موجود ہے۔ ہم یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ شعری یا فنی کارنامہ ایک حد تک مصنف کی ذاتی زندگی یا اس کے ماحول کا حقیقی نفسیاتی چربہ ہوتا ہے۔ جب ہم تالستائے کے یہاں ذاتی زندگی کا عکس تلاش کرتے ہیں تو ہمیں اس بات کا احساس ہوتا ہے جہاں آگسٹن اور روسو کے اعترافات میں مصنف بڑھاپے کی منزل سے جوانی اور بچپن کی طرف دیکھتے ہیں وہاں تالستائے اپنے بچپن، لڑکپن اور جوانی میں عنفوان شباب کے دوران بچپن، لڑکپن اور جوانی کو ان کی تمام تر معصومیت تازگی اور جذباتی حقیقت نگاری کے ساتھ بیان کرتا ہے اور اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نوخیز مصنف نجی زندگی کے معمولات اور خوشیوں میں خارجی زندگی کے معروضی جائزہ سے زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔

تالستائے کی ابتدائی تصانیف میں معروضیت بہت کم ہے۔ اپنے روز نامچے میں جو تاثرات اور یادداشتیں اس نے درج کی تھیں انھیں بچپن، لڑکپن اور جوانی میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہاں ہمیں وہ شخصیتیں ملتی ہیں جنھوں نے مصنف کو متاثر کیا۔ وہ کمرے یا وہ مناظر یا وہ واقعات جن سے اس کی بیشتر یادیں وابستہ ہیں ہمارے سامنے احساسی تازگی کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ رحم دل ماں جو زندگی کی برکتوں سے آشنا تھی، شفیق باپ جو زندگی سے لطف اندوز ہونے کا قائل تھا، بوڑھی دادی جو احترام کی مستحق تھی، خاندان کے افراد میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ جرمن اتالیق، اور فرانسیسی استاد کے ساتھ نوکروں، خادماؤں، فقیروں، نیم مفلوج زائرین کا جمگھٹ نظر آتا ہے۔ گھر میں بھائی، بہن، دوست احباب اور نوخیز لڑکیاں ملتی ہیں جو محبت کی پہلی ترنگ میں جھومتی پھرتی ہیں۔ باہر مدرسہ کا ماحول، شکارگاہ، بچوں کے ناچ، دیہاتی میلے اور رسمی ملاقاتیں ہیں۔ مختصراً ان ابتدائی افسانوں میں انیسویں صدی کے وسط میں جاگیرداروں اور رئیسوں کے بچوں کی نفسیات کا دلکش خاکہ موجود ہے جو اپنی حیثیت کے لحاظ سے عیش وآرام کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔

نجی زندگی کو فن میں سمونے کی کوشش ابتدائی تصانیف کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ وسطی دور کی بیشتر کہانیوں میں یہ عناصر جابجا ملتے ہیں۔ تالستائے کی قزاقزستانی داستانیں حملہ، قذاق، سیواستوپول، برفانی طوفان، زمیندار کی صبح وغیرہ میں خارجی زندگی کے ساتھ نجی زندگی اور ایک حد تک گناہوں کا اعتراف بھی شامل ہے۔ 'قزاق' میں آلینن (Olenin) 'جنگ اور امن' میں شاہزادہ بولونسکی اور پئر بیزوخاف، انا کرینینا میں لیون اور دیگر متعدد کہانیوں کے کردار تالستائے کی زندگی کے مختلف ابواب ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اپنے دو مشہور ناولوں میں تالستائے نے اپنے خاندان کے لوگوں کے علاوہ احباب اور رشتہ داروں کے خاکے بھی کھینچے ہیں جو بہت حد تک ان کی زندگی کا چربہ ہیں۔

اپنی ادبی زندگی کے آخری دور میں جب تالستائے روحانی کشمکش سے دوچار تھا ہمیں اس کی شخصیت کا پوری طرح احساس ہوتا ہے۔ ہمعصر سیاسی، مذہبی اور سماجی زندگی سے بیزاری اور نئے مسیحی نظام کی بشارت خود اس کے ذہن کے مختلف گوشوں کو نمایاں کرتے ہیں۔

تالستائے کی تصانیف میں جہاں سماجی مسائل خالص فنی انداز میں ہمارے سامنے آتے ہیں وہاں نجی زندگی کی کیفیات اور تضادات بھی کچھ اس خوش اسلوبی سے سموئے گئے ہیں کہ ہم اس کی عظمت کے قائل ہونے لگتے ہیں۔ وہ کبھی نہ تو محض تخیل کی دنیا بساتا ہے اور نہ خارجی حقیقت پسندی کو زیادہ قابل توجہ سمجھتا ہے۔ کچھ مبصروں نے تالستائے کی اعتدال پسند نگاری کی تنقید کی ہے لیکن انھیں شاید اس بات کا احساس نہیں کہ وہ لفظوں کا ایسا جادوگر ہے جو اپنے فن کے ذریعے وہ کرنے کو زیادہ جاندار اور دلپذیر بنا دیتا۔ اس خوبی کے باوجود تالستائے کی اہمیت محض اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ انسانی تجربہ کے مختلف پہلوؤں کو نئے مشن کے ساتھ پیش کرتا ہے یا اس نے خدا اور شیکسپیئر کے بعد سب سے زیادہ کرداروں کو جنم دیا ہے۔ ہماری بیسویں صدی کے لکھنے والوں میں بھی ایسے مصنف نکل سکتے ہیں جنھوں نے خدا کی مخلوق سے محبت کی ہے اور جو زندگی کو تمام حسن وکوائف کے ساتھ پیش کرتے رہے ہیں لیکن تالستائے کے یہاں شعریت وحقیقت کا جو حسین امتزاج ملتا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ امریکی مصنف ہیمنگوے نے تو ایک دفعہ مقابلے کے زعم میں تمام یورپین حقیقت نگاروں مثلاً ترگنف اور فلوبیر کو چیلنج کر دیا لیکن تالستائے کے متعلق اس کا خیال تھا کہ وہ کبھی اس دیو قامت فنکار سے آنکھیں ملانے کا تصور نہیں کر سکتا۔ ■

تالستائے کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے ہمیں اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس کے افسانوں میں زندگی اپنی تمام تر آب و تاب اور جلوہ نمائیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے اور ہم اکثر یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں کہ کس حد تک یہ ادبی کارنامے اس کی ذاتی زندگی کا عکس ہیں اور کسی حد تک محض تخیل کی پیداوار۔

ماخذ: تالستائے، **مصنف:** ڈاکٹر محمد لیسین، **سنہ اشاعت:** دوسرا ایڈیشن: 1998، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ارشاد سیانوی

داستانوں نے اپنی بقا کے لیے اسٹیج کا رخ کیا

پروفیسر اسلم جمشید پوری

اکیسویں صدی میں اردو فکشن کے میدان میں جن ادبا و ناقدین نے اپنی منفرد پھچان بنائی ان میں ایک نام پروفیسر اسلم جمشیدپوری کابھی ہے۔پروفیسر اسلم جمشیدپوری چودھری چرن سنگھ یو نیورسٹی، میرٹھ کے شعبۂ اردو میں بحیثیت صدر نوجوان نسل کی رھنمائی کررھے ھیں. اس سے قبل آپ جامعه ملیه اسلامیه یونیورسٹی، دھلی میں درس و تدریس کی خدمات انجام دے چکے ھیں. آپ ایک اچھے افسانه نگار، ناول نگار کے ساتھ ساتھ فکشن تنقید پر بھی گھری نظر رکھتے ھیں. آپ کے اب تک پانچ افسانوی مجموعے ،ھندی میں تین افسانوی مجمو عے ، دو بچوں کی کھانیوں کے مجمو عے ، ایک افسانچوں کا مجمو عه اور ایک ناول ُدھنوراٗ کے نام سے منظر عام پر آ کر مقبول ھو چکے ھیں. فکشن تنقید پر آپ کی تقریباً بیس سے زائد کتابیں اس بات کی غماز ھیں که آپ کی فکشن تنقید پر بھی گرفت مضبوط ھے۔آپ نے فکشن اور فکشن تنقید میں ایک طویل سفر طے کیاھے۔ آپ ایک اچھے فکشن ناقدھی نھیں بلکه ایک اچھے استاد کی حیثیت سے اردو کی خدمات انجام دے رھے ھیں.

ارشاد سیانوی: جب آپ کالج میں سیکنڈری کی تعلیم حاصل کرر ہے تھے تو کیا آپ کو معلوم تھا کہ آپ آگے چل کر اردو فکشن اور فکشن تنقید کے شہسوار ہوں گے؟

اسلم جمشیدپوری: نہیں، مجھے پتہ نہیں تھا۔ لیکن جمشید پور کا ادبی ماحول ایسا تھا جو ادبی ذوق رکھنے والے طالب علموں کے لیے سازگار تھا۔ ایسے ماحول میں میں نے اوٹ پٹانگ چیزیں لکھنے کی ابتدا کی اور مجھ میں اتنی ہمت تھی کہ اس زمانے کے معروف رسائل میں وہ اوٹ پٹانگ تخلیقات بھیج دیا کرتا تھا۔ مدیران کے جواب آتے کہ آپ اپنے شہر کے معروف ادیبوں وشعرا سے اپنی تخلیقات پر اصلاح لے لیا کریں۔ ان جوابات کے ساتھ میری تخلیقات واپس آتی رہیں۔ آپ کو حیرانی ہوگی کہ میں نے یہ عمل تقریباً دو سال کیا۔ لیکن لکھنے اور شائع کرنے کی مشق سے ایک کہانی جسے افسانچہ بھی کہہ سکتے ہیں ایسی ہوگئی جو 1981 میں دہلی کے مشہور رسالے ’روشن ادب‘ میں شائع ہوگئی اور اس تخلیق کو اسی مہینے ’گونج‘ نام کے اخبار نے ڈائجسٹ کر کے چھاپا۔ اس کے بعد جمشید پور کے ادیبوں میں کھلبلی مچ گئی۔ کیونکہ یہ کہانی میں نے ایم۔ اسلم بدر کے نام سے لکھی تھی، اس وقت میرے ذہن میں اسلم بدر اور بشیر بدر چھائے ہوئے تھے۔ شہر کے ادبی لوگوں نے یہ سمجھا کہ اسلم بدر نے شاعری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری بھی شروع کردی ہے۔ لیکن اسلم بدر کے انکار کرنے کے بعد بہت سے ادبی لوگ مجھے ڈھونڈتے رہے۔ آخر تنویر اختر رومانی نے مجھے تلاش کرلیا اور مشورہ دیا کہ آپ اپنا نام بدل لیں اور کہانیاں کسی افسانہ نگار کو دکھا لیا کریں۔ دوسری کہانی سے میں اسلم جمشید پوری بن گیا اور تنویر اختر رومانی کو اپنی کہانیاں دکھانے لگا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نویں کلاس کا طالب علم تھا۔ گھر پر ناولوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہوتا تھا، کیونکہ والد صاحب کو ناول پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ اس زمانے میں، میں نے ابن صفی، رضیہ بٹ، فیاض علی، بشریٰ رحمٰن وغیرہ کے بہت سارے ناول پڑھے۔ اس طرح میں افسانے کی دنیا میں داخل ہوا۔

ا س: جب آپ کی پہلی کہانی ’نشانی‘ (1981) منظر عام پر آئی تو اس وقت کون کون افسانہ نگار افسانے لکھ رہے تھے اور سب سے پہلے کس افسانہ نگار نے آپ کی کہانی کو سراہا۔

ا ج: جب میری پہلی کہانی شائع ہوئی تو اس زمانے میں جمشید پور میں منظر کاظمی، ذکی انور، جہاں گیر محمد، سلطان احمد ساحل، انور امام، تنویر اختر رومانی، ارمان شباب، حسن نظامی کیراپی وغیرہ افسانے لکھ رہے تھے۔ میری کہانیوں کی نوک پلک درست کرنے اور تعریف وتحسین کا کام پہلی بار تنویر اختر رومانی نے کیا۔

ا س: ایسی کونسی بات تھی جس نے آپ کو کہانی لکھنے کے لیے تیار کیا؟

ا ج: میں بتا چکا ہوں کہ میرا ارادہ باضابطہ کسی موضوع پر کہانی لکھنے کا نہیں تھا، بس لکھتے لکھتے کہانی ہوگئی۔

ا س: آپ نے ابتدا میں کتنی کہانیاں ایسی لکھی ہیں جن کو آپ نے اپنی امی جان کو پڑھ کر سنایا اور کہانی سننے کے بعد انھوں نے کیسا محسوس کیا؟

ا ج: امی تو نہیں۔ امّی کا تو لکھنے پڑھنے سے کوئی تعلق نہیں تھا، ہاں والد محترم مرحوم شمس الدین صاحب کو ضرور میں نے اپنی کہانیاں سنائیں۔ وہ کہانیوں پر اچھے مشورے دیتے تھے۔ ایک بار میں نے ایک کہانی میں ایک مریض کو فالج زدہ دکھایا تھا اور اس کے دونوں پیر معذور دکھائے تھے۔ والد صاحب نے کہا کہ فالج ہمیشہ جسم کے ایک حصے پر پڑتا ہے۔ سیدھا یا الٹا حصہ مفلوج ہوجاتا ہے۔ دو نوں پیر فالج زدہ نہیں ہو سکتے تو پھر میں نے کہانی میں

اصلاح کی۔ والد محترم میری کہانیوں پر بہت خوش ہو تے تھے۔ کیونکہ میری سات پشتوں نے بھی قلم پکڑ نا نہیں سیکھا تھا۔ ایک بار یہ ہوا کہ میں نے لینڈرا نام کی کہانی لکھی، جس میں گاؤں کے حقیقی کردار موجود تھے۔ میں نے کہانی والد صاحب کو سنائی تو وہ آگ ببولہ ہو گئے اور غصہ میں کہا کہ تم گاؤں میں لڑائی جھگڑا اور فساد کرادو گے۔ یہ کہانی جب چھپے گی اور گاؤں والے پڑھیں گے تو تمھارے ساتھ ہم پر بھی مصیبت آسکتی ہے۔ والد صاحب کے اس ردعمل پر میں نے کہانی لینڈرا کے کرداروں کے نام فرضی کر دیے۔ اس کہانی نے مجھے عالمی شہرت عطا کی۔

س: آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ 'افق کی مسکراہٹ' 1997 میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں کونسا افسانہ آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے اور کیوں؟

ج: میرا پہلا افسانوی مجموعہ 'افق کی مسکراہٹ' میں افسانے اور افسانچے شامل ہیں۔ افسانوں میں مجھے سب سے زیادہ 'لال خط' افسانہ پسند ہے جو کہ کتاب میں 'افق کی مسکراہٹ' کے عنوان سے درج ہے۔ ویسے اس کتاب میں ٹیوشن کو لے کر بھی ایک افسانہ ہے جس کا نام 'کشمکش' ہے، وہ بھی مجھے بے حد پسند ہے۔ اس افسانہ کا ایک واقعہ بھی ہے کہ جمشید پور سے سورن ریکھا نام کی پہاڑی ندی گزرتی ہے۔ گرمیوں میں پانی کم ہونے کے سبب کالی کالی چٹانیں ابھر آتی ہیں میں اس ندی کے اوپر بنے پل سے اکثر گزرتا تھا۔ اس زمانے میں جب میں یہ کہانی لکھ رہا تھا تو میرے دماغ میں ایک ڈائلاگ آیا جو ابھی تک اس افسانے میں موجود ہے۔

''میری حالت ندی کے سینے میں سر چھپائے ان چٹانوں جیسی ہوگئی تھی جو پانی کم ہونے پر بے نقاب اور ننگی ہو جاتی ہیں۔''

اس مجموعے کے دو تین افسانچے اور بھی مجھے بہت پسند ہیں۔ اشتہار، آٹوگراف، مجھے معاف کرنا رام سنگھ وغیرہ

س: آپ کا دوسرا افسانوی مجموعہ 'لینڈرا' کے تین ایڈیشن آچکے ہیں۔ اس مجموعے کا نام کیا آپ کو عجیب نہیں لگتا۔ قارئین تو اس کا نام سن کر سوچ میں پڑ جاتے ہیں تو کیا آپ بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتے ہیں۔

ج: نہیں مجھے ایسا نہیں لگتا۔ دراصل لینڈرا لفظ بلند شہر کے دیہات میں بولا جاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اردو کے لیے یہ لفظ نیا ہے۔ اس عنوان سے جو کہانی مجموعے کا سرنامہ ہے وہ میرے اپنے گاؤں دھنورا کی حقیقی کہانی ہے۔ ہمارے گاؤں میں یعقوب نام کا ایک نوجوان تھا۔ اس کو لوگ لینڈرا کہتے تھے۔ میں نے اسی کو لے کر یہ کہانی تخلیق کی ہے۔ اس نام میں جو تجسس ہے اس نے اس افسانوی مجموعے کو بے حد مقبول کیا۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ لینڈرا میری اب تک کی سب سے اچھی کہانی ہے۔

س: سر آپ کی کہانی 'عید گاہ سے واپسی' کو منشی پریم چند کی کہانی 'عید گاہ' سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے اور لوگ آپ کو پریم چند کی وراثت کا امین ماننے لگے ہیں، تو کیا آپ کو بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ پریم چند کی روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

ج: میرے تیسرے افسانوی مجموعے کا نام 'عید گاہ سے واپسی' ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ نام میں نے پریم چند کی 'عید گاہ' کو سامنے رکھ کر قائم کیا۔ لیکن پریم چند کی عید گاہ اور میری کہانی 'عید گاہ سے واپسی' میں کافی فرق ہے۔ میری کہانی میں پریم چند کے ننھے معصوم کردار حامد کا ایکسٹینشن ہے۔ اصل میں پریم چند کا ننھا حامد عید گاہ سے اپنی دادی کے لیے چمٹا خرید کر لاتا ہے جب کہ میری کہانی میں وہی حامد اپنے غیر مسلم پڑوسی کے لیے چپتل کی لٹیا لے کر آتا ہے۔

پریم چند کی 'عید گاہ' شہر اور قصبہ کی کہانی ہے جب کہ میں نے 'عید گاہ سے واپسی' دیہات کے پس منظر میں لکھی ہے، میری ایک درجن کہانیاں دیہات کے پس منظر میں ہیں جن میں گاؤں دیہات کی بولی کو میں نے سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ میری کہانیوں کا غالب رخ دیہات کی طرف ہے۔ اسی لیے بہت سے لوگ مجھ میں یا میری کہانیوں میں پریم چند کو تلاشتے ہیں۔ حقیقت میں پریم چند ایک بڑے کہانی کار تھے میں تو ان کے پاسنگ بھی نہیں ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے کئی کہانیوں کے نام پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں پر رکھے ہیں۔ مثلاً عید گاہ سے واپسی، گئودان سے پہلے، بڑے گھر کی چھوٹی بیٹی وغیرہ۔ اسی لیے بہت سے لوگ میری کہانیوں میں پریم چند کو تلاشتے ہیں۔

س: آپ کا پہلا ناول 'دھنورا' 2022 میں منظر عام پر آیا۔ یہ ناول دیہی پس منظر اور گاؤں دیہات کے مسائل پر لکھا گیا ناول ہے۔ آپ نے پریم چند کی روایت کو ناول کے ذریعے بھی آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ گاؤں دیہات میں بولی جانے والی زبان کو پیش کرنے میں آپ کو بڑی دشواری پیش آئی ہوگی۔ ذرا اس دشواری کو ہمارے ساتھ بھی ساجھا کیجیے۔

ج: آپ کا قیاس بالکل ٹھیک ہے میں نے جب بیماری کے دوران ناول دھنورا کی تخلیق کی تو اپنے گاؤں کی زندگی کو پیش کیا۔ دھنورا اصل میں بلند شہر کا ایسا گاؤں ہے جس میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی موجود ہے اور وہاں کبھی بھی فساد نہیں ہوا۔ میں نے اپنے ناول میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ گاؤں والوں کی زبان مجھے چونکہ اچھی طرح آتی ہے۔ اس لیے میں نے اس ناول میں بھی کرداروں کے ذریعے بولی جانے والی گاؤں کی بولی کا استعمال کیا۔ کئی بار بہت سارے لفظ اردو میں لکھنے میں مشکل پیش آئی۔ لیکن میں نے اس پر فتح پائی۔

س: میں نے آپ کا ناول 'دھنورا' پڑھا ہے، جس کا کوئی مرکزی کردار نہیں بلکہ ناول ہی مرکزی کردار کے روپ میں سامنے آتا ہے تو ایسے ناول بہت کم لکھے گئے ہیں۔ آپ نے اس طرح کا ناول لکھنے کی جانب خیال کیوں کیا؟

ج: آپ نے ٹھیک کہا۔ میں نے اس ناول میں دو تجربے کیے۔ ایک تو اس ناول میں کوئی مرکزی کردار نہیں۔ کردار آتے ہیں اور اپنا رول ادا کر کے چلے جاتے ہیں۔ گاؤں میں ہی ان کرداروں کا Stage ہے تو کئی بار ایسا لگتا ہے کہ گاؤں ہی مرکزی کردار ہے۔ میں نے دوسرا تجربہ اس ناول میں یہ کیا کہ ناول کو کولاژ تکنیک میں لکھا۔ یعنی ہر باب اپنے آپ میں مکمل بھی ہے اور اگلے باب سے منسلک بھی، یہ دونوں تجربے اردو ناول میں ایک ساتھ شاید پہلی بار ہوئے ہیں۔

س: ناول 'دھنورا' کی کہانی کو میں نے بخوبی سمجھا ہے۔ یہ گاؤں کی زندگی کے پیچ وخم کی کہانی ہے تو اس سوانحی ناول میں آپ نے بڑی حد تک تخلیقی زبان کا استعمال کیا ہے۔ ایسا آپ کس طرح کر لیتے ہیں جب کہ آپ نے شہروں میں زیادہ وقت گزارا ہے۔

ج: یہ ٹھیک ہے کہ میرا زیادہ تر وقت شہر جمشید پور میں گزرا۔ میں نے زندگی کے کچھ سال دہلی میں بھی گزارے اور اب میں کافی زمانے سے میرٹھ میں ہوں۔ لیکن میرے بچپن کا کافی زمانہ اپنے گاؤں میں گزرا ہے اور جمشید پور یا دہلی میں رہتے ہوئے بھی میں گاؤں آتا جاتا رہا، دراصل میرے والدین دھنورا میں ہی قیام پذیر تھے۔ اسی لیے میری کہانیوں اور ناول میں گاؤں، دیہات کی عکاسی ملتی ہے، گاؤں دیہات کے لوگوں کے جذبات ان کی زندگی، ان کے مسائل سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔

س: عصر حاضر میں جتنا کام ناول اور افسانوں پر ہو رہا ہے،

داستان پر کم نظر آرہا ہے۔اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟

ج: اصل میں اکیسویں صدی میں بہت سی اصناف کا گراف اونچا ہوا ہے۔ خاص کر ناول اور افسانے بہت لکھے جارہے ہیں۔ان کے مقابلے داستان نا کے برابر لکھی جارہی ہیں۔ایک تو یہ وجہ بھی ہے کہ اب لوگوں کے پاس طویل داستانیں پڑھنے کا وقت نہیں ہے،دوسرے ہمارے یہاں داستان لکھنے والوں کی بھی کمی ہوگئی ہے۔ تیسرے داستان نے اپنی بقا کے لیے Stage کا رخ کیا ہے۔اب داستانیں ڈرامے کی طرح Stage پر پیش ہونے لگی ہیں تو اب داستانیں پڑھنے سے زیادہ دیکھنے کی چیز ہوگئی ہیں۔ دوسری طرف بعض زبانوں کی فلمیں اور ٹی وی سیریل داستانوں جیسے ہی ہوتے ہیں،خاص کر ہندوستان میں بننے والے طویل ٹی وی سیریلز داستان جیسا طلسم پیش کرتے ہیں تو یہ کہنا کہ داستانیں بالکل ختم ہوگئی ہیں غلط ہے، ہاں داستانوں کا رنگ بدل چکا ہے اور وہ اب پڑھنے سے زیادہ دیکھنے کی چیز ہوگئی ہیں۔

س: اردو ادب میں آپ کی خدمات بہت ہیں۔آپ نے اردو کو اوڑھنا، بچھونا بنا رکھا ہے تو کیا آپ کی طرح آپ کے گھر یا خاندان میں بھی کوئی ایسا شخص ہے جو اردو کی خدمات میں لگا ہوا ہو۔

ج: مجھے نہیں پتہ کہ میں اردو کی خدمت کر پا رہا ہوں یا نہیں،میری طرح بہت سارے لوگ ہیں جو ناول، افسانے،تنقید، تحقیق اور دیگر چیزیں تخلیق کر رہے ہیں۔ اگر یہ سب اردو کی خدمت ہے تو ہوسکتا ہے میرے ذریعے بھی اردو کی خدمت ہورہی ہو۔

ہمارے پورے خاندان میں مجھ سے پہلے کسی کا تعلق کاغذ اور قلم سے نہیں تھا۔ میرے بعد ہوسکتا ہے کہ میرے خاندان کا کوئی فرد میری میراث کو سنبھالے۔ ویسے یہ جراثیم تھوڑے بہت میری بیٹی مدیحہ اسلم میں ملتے ہیں۔اس نے دسویں کلاس میں ایک افسانہ لکھا تھا جو 'کتاب نما' دہلی سے شائع ہوا تھا۔

س: بیسویں صدی میں خواتین ناول نگاروں نے ناول کے میدان میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے جیسے عصمت چغتائی، خالدہ حسین، بانو قدسیہ،ترنم ریاض، قرۃالعین حیدر وغیرہ نے اچھے ناول لکھے ہیں۔اب یعنی اکیسویں صدی میں ایسا محسوس ہورہا ہے کہ خواتین ناول نگاروں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔ایسا کیوں؟

ج: بیسویں صدی میں ناول کے تعلق سے جو ماحول تھا وہ اکیسویں صدی میں کچھ کم ضرور ہوا ہے۔ کیونکہ اکیسویں صدی میں اردو بولنے پڑھنے والوں کی تعداد بھی بہت کم ہوئی ہے۔ ہماری نئی نسل ٹی وی اور ویڈیو کی طرف مائل ہوتی جارہی ہے۔ان سب کے باوجود ہمارے ہاں کئی خواتین اکیسویں صدی میں اچھے ناول لکھ رہی ہیں۔ بالکل نئی نسل کی بات کریں تو غزالہ قمر اعجاز، سفینہ بیگم، حمیرا عالیہ اچھے ناول لکھ رہی ہیں۔

س: فکشن تنقید کے تعلق سے ہندوستان میں زیادہ لکھا جارہا ہے یا پاکستان میں زیادہ تنقیدی کام ہورہا ہے؟

ج: ہندوستان اور پاکستان میں فکشن تنقید پر کافی کام ہورہا ہے۔ دونوں ملکوں کا موازنہ کرنا بے حد مشکل کام ہے۔لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں شمس الحق عثمانی،علی احمد فاطمی،قدوس جاوید، اعجاز علی ارشد، ارتضیٰ کریم،صغیر افراہیم، احمد صغیر وغیرہ نے اردو فکشن تنقید کو سنبھال رکھا ہے۔اسی طرح پاکستان میں مرزا حامد بیگ، انوار احمد،حمید شاہد، ناصر عباس نیر، رابع الربا، اے خیام، نجیبہ عارف،عرفان عالم،وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

س: نئی صدی میں آپ کی نظر میں کون سے نئے فکشن ناقد، فکشن تنقید کو آگے بڑھانے کا کام انجام دے رہے ہیں۔

ج: موجودہ وقت میں ہندوستان کی سطح پر نئے فکشن ناقدین کی بات کی جائے تو غالب نشتر، ریاض توحیدی، ارشاد سیانوی،شہناز رحمٰن، سفینہ بیگم، مسرت جہاں، تسنیم،فاطمہ،تکمل حسین،نہال افروز، اسود گوہر دائم انصاری، تسنیم فاطمہ،شبستاں آس محمد وغیرہ فکشن تنقید کے میدان میں ابھر کر سامنے آرہے ہیں جو فکشن تنقید کو آگے بڑھانے کا کام انجام دے رہے ہیں۔

س: آپ نے معاصر فکشن پر خوب لکھا ہے۔ناول اور افسانے بھی آپ کے قلم سے لکھے جارہے ہیں مگر فکشن میں آپ کی دلچسپی ناول تنقید میں زیادہ ہے یا افسانے کی تنقید میں؟

ج: فکشن تنقید مجھے بہت پسند ہے۔یوں بھی نارنگ صاحب کے مطابق یہ صدی فکشن کی صدی ہے۔ناول، افسانے، افسانچے وغیرہ خاصی تعداد میں شائع ہورہے ہیں۔ایک بار شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا تھا کہ نئی نسل کو اپنا ناقد خود پیدا کرنا چاہیے۔لہٰذا اس کے بعد بے شمار ناقد سامنے آئے جنھوں نے فکشن کے ساتھ شاعری کو بھی اپنی تنقید کا موضوع بنایا۔ میں نے بھی اپنی سمجھ کے مطابق فکشن تنقید کو اپنا میدان بنایا اور افسانے، ناول، ناولٹ، افسانچہ اور داستان وغیرہ پر تنقید لکھنے کی کوشش کی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے اب تک جو فکشن تنقید لکھی ہے اس میں افسانے کی تنقید زیادہ ہے۔

س: آپ کے معاصرین میں ناول لکھنے والوں کی تعداد کافی ہے جب کہ آپ کا صرف ایک ہی ناول ابھی تک منظر عام پر آیا ہے جب کہ فکشن تنقید پر بہت سی کتابیں منظر عام پر آکر مقبول ہوچکی ہیں تو ناول کے میدان میں ابھی تک صرف ایک ناول آنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟

ج: مجھے افسانے لکھتے ہوئے تقریباً 43 برس ہوگئے لیکن میں نے کبھی ناول لکھنے کی ہمت نہیں کی۔ہاں دو تین بار میں نے بہت سے ناولوں کو بیس پچیس صفحات لکھ کر چھوڑ دیا۔ بعد میں، میں نے ایک مکمل ناول 'دھتورا' لکھا اور اب ارادہ ہے کہ مزید ناول لکھے جائیں۔

س: آپ کی کتاب 'اردو فکشن کے پانچ رنگ' کافی مقبول ہوئی اور سنا ہے کہ یہ کتاب پاکستان سے بھی شائع ہوچکی ہے تو اس کتاب میں ایسی کیا خاصیت ہے جو دونوں ممالک میں اس کو شہرت ملی؟

ج: واقعی 'اردو فکشن کے پانچ رنگ' نے مجھے کافی شہرت بخشی۔تقریباً 800 صفحات کی اس کتاب میں طالب علموں کے لیے کافی مواد ہے۔اس کتاب میں داستان، ناول، ناولٹ، افسانہ اور افسانچے کی صنف، روایت اور ارتقا پر میں نے خاصی بحث کی ہے ساتھ ہی کئی داستانوں، ناولوں، ناولٹس، افسانوں اور افسانچوں کے تجزیے بھی کتاب میں شامل ہیں۔ طالب علموں کو فکشن سے متعلق اچھی خاصی معلومات اس کتاب سے ملتی ہے،شاید اس لیے زیادہ مقبول ہورہی ہے۔

س: آخر میں نئی نسل کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

ج: 1970 کی نسل یہ مان رہی تھی کہ اس کے بعد اردو ادب میں زوال ہی زوال ہوگا اور مختلف اصناف میں کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہوگا۔لیکن ہر دس سال کے بعد ایک نئی نسل سامنے آتی رہی جس نے ادب کی بہت سی اصناف میں اچھی طبع آزمائی کی۔موجودہ نسل کو میرا پیغام یہی ہے کہ آپ سب مل کر اردو کے فروغ میں حصہ لیں تاکہ اردو کی زمینی سطح پر آبیاری ہوسکے۔

■

Irshad Siyanvi
Urdu Deptt. CCSU,
Meerut - 253001 (UP)
Mob: 9759238472
Email: irshadali223234@gmail.com

بچّوں کی تعلیم وتربیت میں والدین کا کردار

محمد وقار شبیر

والدین کی تربیت کا انداز بچوں کی پرورش کے عمل میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ والدین اپنے بچوں کو سماج کی مخصوص ثقافت یا ذیلی ثقافت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کس طرح تیار کرتے ہیں۔ معاشرتی رہنمائی فراہم کرنا والدین کی اہم ذمے داری ہے۔ والدین روحانی، جسمانی، اور عقلی صلاحیتوں کی تربیت کرتے ہیں۔ بچوں کی جسمانی و ذہنی نشوونما اور معاشرتی پختگی میں والدین کا اہم کردار ہوتا ہے۔ والدین بچوں کے لیے سائبان کی مانند ہیں اور ان کی طبیعت اور مزاج بچے کی کردار سازی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بچوں کی ذہنی، جسمانی، شعوری، سماجی، اور اقداری نشوونما والدین سے ہی متاثر ہوتی ہے، جو ایک انسان کو بہترین فرد بنانے میں مدد کرتی ہے۔ بہتر زندگی کے تصور کے لیے تعلیم و تربیت نہایت ضروری ہے۔ والدین کی طرف سے بچوں کے لیے سب سے بہترین تحفہ اچھی تربیت ہے۔ ان کی حقیقی کامیابی اس بات میں مضمر ہے کہ ان کی اولاد سماج کا ایک قیمتی اثاثہ بنے، نہ کہ بوجھ اچھا تربیت یافتہ فرد نہ صرف اپنی زندگی میں کامیابی حاصل کرتا ہے بلکہ معاشرے کے لیے بھی فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر تربیت میں کمی رہ گئی تو وہ فرد نہ صرف اپنی زندگی میں مشکلات کا شکار ہوتا ہے بلکہ دوسروں کی زندگیوں میں بھی مسائل پیدا کرتا ہے۔ اس طرح والدین کی کامیابی اور معاشرتی ترقی کا دارومدار بچوں کی تربیت کے معیار پر ہوتا ہے۔

بچوں کی تعلم وتربیت کا اول اور اہم ادارہ گھر ہے۔ گھریلو ماحول میں بچے ابتدائی زندگی کے امور جیسے اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، کھانا، پینا، اور بات چیت کرنا سیکھتے ہیں۔ یہاں والدین اور رشتے دار بچوں کے سب سے قریب معلم ہوتے ہیں جن کا رویہ اور طرز عمل بچے کی شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ گھریلو ماحول بچے کی عقلی، جسمانی، اور جذباتی ترقی کے لیے بہت ہے۔ اسکول جانے کے بعد بھی گھر کی اہمیت برقرار رہتی ہے کیونکہ وہاں بچے کا وقت محدود ہوتا ہے اور والدین کی نگرانی اور تعلیم وتربیت کی ضرورت برقرار رہتی ہے۔ والدین بچوں کے تئیں مثبت رویہ رکھتے، عزت نفس کا خیال کرتے اور جذباتی رعایت کرتے ہیں۔

گھریلو ماحول میں سکھائی ہوئی عادات اور اقدار بچوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ والدین کا ان کے ساتھ اچھا سلوک اور معاوتی رشتہ، بچوں کے سکون وصحت کے لیے بہت اہم ہوتا ہے کیونکہ یہ انھیں ایک مستحکم معاشرتی ماحول فراہم کرتا ہے۔ اچھی پرورش اور تعلیم بچوں میں ذمے داری اور قانون کا پابند شہری بننے کے امکانات بڑھاتی ہے، جس سے معاشرہ مستحکم اور مربوط ہوتا ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ وقت گزاریں۔ مصروف والدین کو بچوں کے ساتھ جذباتی طور پر جڑنے کے لیے اپنے تجربات شیئر کرنے چاہئیں، ان کی کامیابی کو سراہنا، اور نا امیدی میں امید دینا چاہیے۔ والدین کا رویہ بچوں پر گہرا اثر ڈالتا ہے، اور ان کی توجہ بچوں کی تعلیم و تربیت اور شخصیت کی نکھار میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بچوں کو زندگی گزارنے کے کامیاب طریقے سکھانا، خود احتسابی، تواضع، اور ذمے داری کا احساس لانا، اور منفی سوچ سے بچانا والدین کا بہترین تحفہ ہے۔ انھیں بری عادتوں سے بچنے اور مفید کاموں میں وقت اور توانائی صرف کرنے کی تعلیم دینی چاہیے۔

دور حاضر میں والدین کو بچوں کی جسمانی، جذباتی، کرداری اور فکری نشوونما پر توجہ دینی چاہیے۔ والدین کی محبت اور دیکھ بھال بچوں میں خود اعتمادی اور جذباتی بہبود کو مضبوط بناتی ہے۔

جدید دور میں والدین کو کئی ڈیجیٹل چیلنجوں کا سامنا ہے جیسے سائبر بلنگ اور موبائل وغیرہ کے اسکرین پر زیادہ وقت صرف کرنا۔ اس دور میں حفاظتی خدشات میں اضافہ ہوا ہے، جیسا کہ انٹرنیٹ پر آن لائن خطرات۔ والدین کی ذمے داری ہے کہ وہ بچوں کو محفوظ ماحول فراہم کریں۔ ماضی میں، ذہنی صحت کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی تھی، مگر اب یہ موضوع نہایت اہم ہے کیونکہ دنیا بھر میں ذہنی صحت کے مسائل بڑھ رہے ہیں۔ والدین کو بچوں کی ذہنی بہبود کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ذہنی صحت بچوں کی ترقی اور معاشرتی برتاؤ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس لیے والدین کو بچوں کی عزت نفس، مثبت رویہ، اور جذباتی حمایت پر توجہ دینی چاہیے۔ نوکریوں اور بچوں کی ذمے داریوں کے درمیان توازن برقرار رکھنا بھی ایک بڑا چیلنج ہے، جو والدین کی مشکلات میں مزید اضافہ کر رہا ہے۔ ذہنی صحت کی آگاہی اور حفاظت آج کل والدین کے لیے ایک اہم ذمے داری بن چکی ہے۔ عصر حاضر میں ہمیں بے شمار نئے مسائل کا سامنا ہے، اور مستقبل میں ان مسائل میں مزید اضافہ متوقع ہے۔ ہمارے معاشرتی،

ذہنی، جسمانی، روحانی، اور نفسیاتی مسائل میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، جب کہ زندگی کے اہداف بھی تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔ یہ تبدیلیاں ہماری روزمرہ کی زندگی کو پیچیدہ بنا رہی ہیں اور نئے چیلنجز کو جنم دے رہی ہیں، جن کا حل تلاش کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ان مسائل کا مقابلہ کرنے اور زندگی کے اہداف کو دوبارہ متعین کرنے کے لیے ہمیں ایک جامع اور فکری نقطہ نظر اپنانا ہوگا، جس میں فلسفیانہ تفکر اور علمی تحقیق کی روشنی شامل ہو۔ اس چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے مفکرین اور دانشوروں نے نئے حل تلاش کرنا شروع کر دیے ہیں۔
ان حلوں میں سے ایک اہم فارمولا 'زندگی کی مہارتیں ہیں' جنھیں انگریزی میں 'لائف سکلز' یا 'سوفٹ سکلز' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مہارتیں انسان کو ان پیچیدہ مسائل کا حل نکالنے میں مدد دیتی ہیں جو ان کی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔
عالمی ادارہ صحت (WHO) کے مطابق ''زندگی کی مہارتیں بنیادی تعلیم، صنفی مساوات، جمہوریت، اچھی شہریت، بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم نظام کے تحفظ کو فروغ دیتی ہیں۔'' یہ مہارتیں دوسروں کو قبول کرنے اور سمجھنے میں ہماری مدد کرتی ہیں، چاہے وہ ہم سے مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔ زندگی کی مہارتوں کے ذریعے ہم تناؤ اور دباؤ کو پہچان سکتے ہیں اور مختلف حالات میں جذباتی توازن برقرار رکھ سکتے ہیں۔
بحیثیت والدین، ہماری ذمے داری انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ ہم خود بھی ان مہارتوں کو سیکھیں اور اپنے بچوں کو بھی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ ان مہارتوں کے سیکھنے کے لیے مہمیز کریں۔ اس سے نہ صرف ہمارے بچے موجودہ چیلنجوں کا سامنا کرنے کے قابل ہوں گے بلکہ وہ کامیابی کا ایک نایاب بھی لکھ سکیں گے۔ والدین کا یہ کردار نہ صرف بچوں کی انفرادی نشوونما بلکہ معاشرتی ترقی کے لیے بھی ضروری ہے۔

مواصلات اور سماجی مہارت

زندگی کے مختلف پہلوؤں میں کامیابی کے لیے موثر گفتگو کی مہارت ایک اہم عنصر ہے۔ یہ مہارت فرد کو اپنے خیالات اور جذبات کو واضح طور پر بیان کرنے اور دوسروں کی باتوں کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ والدین بچوں کی مواصلاتی مہارتوں کو بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں کیونکہ بچے اکثر اپنے والدین کے رویے سے سیکھتے ہیں۔ موثر گفتگو میں زبانی اور غیر زبانی بات چیت، اچھی طرح سننا، اور مخاطب کے تئیں ہمدردی شامل ہوتی ہے۔
بچوں کی مجموعی نشوونما اور زندگی میں کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے کہ والدین اپنے بچوں کے ساتھ باقاعدگی سے بات چیت کریں، ان کی عمر کی پرواہ کے بغیر سوالات پوچھیں، اور ان کی رائے کو اہمیت دیں۔ بلند آواز سے پڑھنا اور کہانیاں سنانا بچوں کی زبان کی ترقی اور تخلیقی صلاحیتوں کو فروغ دیتا ہے۔ والدین کو چاہیے کہ بچوں کے تنازعات کو بخوبی حل کرنے اور غیر زبانی اشاروں کو سمجھنے کی تربیت دیں۔ ہمدردی کے ساتھ بات چیت کرنے کی اہمیت پر زور دیں۔ ٹکنالوجی کے استعمال کو محدود کریں اور آمنے سامنے کی گفتگو کو ترجیح دیں۔ بچوں کی بات چیت کی صلاحیت کو تسلیم کریں اور انھیں سراہیں۔ چونکہ بچے ایک ہی رفتار سے مہارتیں نہیں سیکھتے، لہٰذا والدین کو صبر اور تعاون کے ساتھ کام کرنا چاہیے۔ ان حکمت عملیوں کو روزمرہ کی زندگی میں شامل کرکے بچوں کی بات چیت کی صلاحیتوں کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ والدین بچوں کے ابتدائی اور سب سے زیادہ موثر اساتذہ ہوتے ہیں، اور ان کی رہنمائی بچوں کی مواصلاتی مہارتوں کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

> جدید دور میں والدین کو کئی ڈیجیٹل چیلنجوں کا سامنا ہے جیسے سائبر بلنگ اور موبائل وغیرہ کے اسکرین پر زیادہ وقت صرف کرنا۔ اس دور میں حفاظتی خدشات میں اضافہ ہوا ہے، جیسا کہ انٹرنیٹ پر آن لائن خطرات۔
> والدین کی ذمے داری ہے کہ وہ بچوں کو محفوظ ماحول فراہم کریں۔

وقت کا منظم استعمال

وقت کا موثر انتظام زندگی میں کامیابی کے حصول کے لیے ایک اہم عنصر ہے، جو مقاصد کے حصول، تناؤ میں کمی، اور زندگی میں توازن قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ والدین کا کردار اس اہمیت کو اجاگر کرنے میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ وہ اپنے بچوں کو وقت کے موثر استعمال کی اہمیت سکھا سکتے ہیں اور اس ضمن میں رہنمائی فراہم کر سکتے ہیں۔
بچوں کی تعلیم اور غیر نصابی کارکردگی میں بہتری کے لیے وقت کا منظم استعمال ضروری ہے۔ بچے اپنے والدین کی عادات سے متاثر ہوتے ہیں لہٰذا والدین کو منظم طریقے سے وقت کے استعمال میں مثالی ہونا چاہیے تاکہ بچے بھی ان سے سیکھ سکیں۔ والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کو اہداف مقرر کرنے، منصوبہ بندی کرنے اور اہم کاموں کو ترجیح دینے کی تربیت دیں۔ اسکرین ٹائم اور دیگر غیر تعلیمی سرگرمیوں کے لیے واضح حدود قائم کرنا اور بچوں کے وقت کے استعمال کی نگرانی کرنا والدین کی ذمے داری ہے۔ اس کے علاوہ، والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کو وقت کے نظم و نسق کے ٹولز جیسے کیلنڈر، ٹو ڈو لسٹ وغیرہ کا استعمال سکھائیں۔ بچوں کی کوششوں کی سراہنا اور کامیابیوں پر خوشی کا اظہار کرنا ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ضروری ہے۔ اہم اور غیر اہم کاموں کے درمیان فرق سکھانے اور اہم کاموں کو ترجیح دینے کی عادت ڈالنا، بچوں کو تعلیمی اور زندگی کے دیگر شعبوں میں کامیاب بنانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ والدین کی رہنمائی اور مثالی رویہ بچوں کو وقت کی قدر سکھانے اور اس کا موثر استعمال کرنے میں ایک بنیاد فراہم کرتے ہیں، جو کہ ان کی مجموعی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔

ہمدردی اور شعور کی تشکیل

ہمدردی اور شعور کی تشکیل انسانی تعاملات میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے چونکہ یہ مہارتیں ہمیں دوسروں کے جذبات کو سمجھنے، ان کے احساسات کو سننے اور ان کے ساتھ معنوی تعلق قائم کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہیں۔ ان مہارتوں کی بدولت ہم دوسروں کی مشکلات اور دکھوں کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں اور ان کے ساتھ شفقت اور محبت کا اظہار کر سکتے ہیں۔ ہمدردی اور شعور معاشرتی تعاملات میں بہتری اور ہم آہنگی کو فروغ دیتے ہیں، جس سے ہم اپنے اردگرد کے افراد کے لیے ایک مثبت اثر قائم کر سکتے ہیں۔

والدین کا کردار بچوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ والدین کی تربیت نہ صرف جسمانی، ذہنی، اور روحانی نشوونما کو فروغ دیتی ہے، بلکہ بچوں میں ہمدردی اور شعور کے بیج بھی بوتی ہے۔ والدین کی رہنمائی، ماحول، اور معیار بچوں کی مجموعی نشوونما پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ والدین بچوں کو ہمدردی اور شعور کی عملی مثالیں فراہم کرتے ہیں، جنھیں بچے اپنی زندگی کے مختلف حالات میں استعمال کرتے ہیں۔ والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کی باتوں کو سننے اور ان کے احساسات کو سمجھنے میں دلچسپی رکھیں، کیوں کہ یہ بچوں کو دوسروں کے ساتھ بہتر معاملات کی صلاحیت بخشتا ہے۔ والدین کی تربیت بچوں کو اپنی سرگرمیوں کے اثرات کو سمجھنے اور صحیح فیصلے کرنے کی صلاحیت فراہم کرتی ہے۔

فیصلہ سازی کی مہارتیں

فیصلہ سازی کی صلاحیت زندگی میں کامیابی اور ترقی کے لیے ایک بنیادی مہارت ہے۔ یہ مہارت انسان کو مختلف اختیارات میں سے سب سے موزوں کا انتخاب کرنے، انتخاب کردہ اقدامات کی درستگی کا جائزہ لینے اور تجزیاتی انداز میں فیصلے کرنے کی قابلیت عطا کرتی ہے۔ صحیح فیصلہ سازی خود اعتمادی اور خود انحصاری کو فروغ دیتی ہے اور اسے ذمے داریوں کا بوجھ اٹھانے اور ذاتی فیصلے کرنے کی صلاحیت فراہم کرتی ہے۔ یہ مہارت انسان کو مختلف چیلنجز اور مشکلات کا سامنا کرنے، ان کا حل تلاش کرنے اور زندگی کے مختلف مواقع پر درست فیصلے کرنے میں مدد دیتی ہے۔

والدین کا کردار اس مہارت کی ترقی میں انتہائی اہم ہوتا ہے، کیونکہ وہی اپنے بچوں کو صحیح فیصلہ سازی کی تربیت فراہم کرتے ہیں اور اس ضمن میں رہنمائی کرتے ہیں۔ والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کو بچپن سے ہی فیصلہ سازی کی تربیت دیں، چھوٹے مسائل میں انتخاب کرنے کی عادت ڈالیں اور انھیں اپنے فیصلے خود کرنے کی آزادی دیں۔ یہ عمل بچوں کو عملی تجربات کے ذریعے سیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے اور ان کی خود اعتمادی کو بڑھاتا ہے۔ فیصلہ سازی کی مہارتیں نہ صرف ذاتی ترقی میں مدد دیتی ہیں بلکہ بچوں کو آمیزہ زندگی کے پیچیدہ مسائل کے لیے بھی تیار کرتی ہیں۔

تناؤ سے نمٹنے کے طریقے

تناؤ انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہے جو ہر عمر کے

والدین کا کردار بچوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ والدین کی تربیت نہ صرف جسمانی، ذہنی، اور روحانی نشوونما کو فروغ دیتی ہے، بلکہ بچوں میں ہمدردی اور شعور کے بیج بھی بوتی ہے۔ والدین کی رہنمائی، ماحول، اور معیار بچوں کی مجموعی نشوونما پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔

افراد کو متاثر کرتا ہے، لیکن یہ خاص طور پر بچوں اور نوجوانوں کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کو مختلف مراحل میں مختلف نوعیت کے دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جیسا کہ تعلیمی دباؤ، سماجی تعلقات کا دباؤ اور ذاتی مسائل۔ تناؤ سے مؤثر انداز میں نمٹنے کی مہارت انسانی زندگی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ یہ ہمیں جذبات کو کنٹرول کرنے اور مشکل حالات میں بھی دباؤ کو سنبھالنے میں مدد دیتی ہے۔ تناؤ سے نمٹنے کی صلاحیت کامیابی کی راہ میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ یہ صلاحیت، ہمیں درست فیصلے کرنے، مسائل کو حل کرنے اور خود کو محفوظ محسوس کرنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ تناؤ کے اثرات سے نمٹنے کے لیے مثبت رویہ، خود اعتمادی اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ والدین اور اساتذہ کا کردار اس تناظر میں بہت اہم ہے، کیوں کہ وہ بچوں کو مسائل کو حل کرنے اور مثبت طریقے سے چیلنجز کا سامنا کرنے کی مہارت سکھاتے ہیں۔

والدین بچوں کو ایسی مہارتیں فراہم کرتے ہیں جو انھیں تناؤ کی صورت میں خود کو قابو میں رکھنے اور مشکلات کا سامنا کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ ان کی رہنمائی بچوں کو زندگی کے مختلف شعبوں میں کامیابی کی طرف لے جاتی ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کی حوصلہ افزائی کریں، ان کی کوششوں کو سراہیں اور مشکل وقت میں ان کے ساتھ رہیں۔ بچوں کے مسائل کو سمجھنے، ان کے خیالات اور احساسات کو سننے اور مناسب روٹین اور سرگرمیوں کا انتظام کرنے میں بھی والدین کا کردار اہم ہے۔ مزید برآں، والدین کو یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ بچوں کو نئے چیلنجز کا سامنا کرنے کے لیے کسی اور سے مشاورت کی ضرورت پڑ سکتی ہے، جیسے کہ نفسیات سے رابطہ کرنا۔ اس طرح والدین اپنے بچوں کو تناؤ کے مظاہر سے بہتر طریقے سے نمٹنے کی مہارتیں سکھا کر ایک معاون ماحول فراہم کر سکتے ہیں جو ان کی ترقی اور کامیابی میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

ڈیجیٹل لٹریسی

عصر حاضر میں ٹکنالوجی نے ہماری زندگیوں میں گہری اور وسیع پیمانے پر تبدیلیاں متعارف کرائی ہیں، جن میں ڈیجیٹل لٹریسی کی اہمیت نمایاں ہے۔ ڈیجیٹل لٹریسی سے مراد کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور دیگر ڈیجیٹل وسائل کے موثر اور معیاری استعمال کی صلاحیت ہے۔ اس جدید دور میں تعلیم، پیشہ ورانہ زندگی اور روزمرہ کی سرگرمیوں ڈیجیٹل مہارتوں کا استعمال ناگزیر ہو گیا ہے۔ ایسے بچے جو ڈیجیٹل لٹریسی میں ماہر ہوتے ہیں، وہ نہ صرف تعلیمی میدان میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ زندگی کے دوسرے مختلف شعبوں میں بھی کامیاب ہو سکتے ہیں۔

والدین کا کردار اس بدلتی ہوئی معاشرتی حقیقت میں کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ والدین اپنے بچوں کو ڈیجیٹل ٹکنالوجی کی مبادیات سے متعارف کروا سکتے ہیں اور انھیں کمپیوٹر، ٹیبلیٹ، اور اسمارٹ فونز کے موثر استعمال کی تربیت دے سکتے ہیں۔ والدین کو انٹرنیٹ کی بنیادی معلومات، ای میل کے استعمال اور آن لائن مواد کی تلاش کی مہارتیں فراہم کرنی چاہیے۔ مزید یہ کہ والدین کو بچوں کو انٹرنیٹ کے ممکنہ خطرات جیسے ذاتی معلومات کی حفاظت، سائبر بلنگ اور محفوظ ویب سائٹس کے استعمال سے آگاہ کرنا چاہیے۔ آج کل ڈیجیٹل دنیا بچوں کی تعلیمی ترقی اور اخلاقی تعلیم میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ والدین کے ذریعے بچے ڈیجیٹل وسائل کو محفوظ طریقے سے اور ذہانت کے ساتھ استعمال کرنے کی مہارتیں حاصل کر سکتے ہیں، جو انھیں زندگی کے مختلف میدانوں میں کامیابی کی راہ پر گامزن کر سکتی ہیں۔ اس طرح، والدین کی رہنمائی اور تعلیم بچوں کے ڈیجیٹل تجربات کو معیاری اور موثر بنا سکتی ہے، جس سے ان کی

مجموعی ترقی میں مدد ملے گی۔

خود آگاہی

خود آگاہی یعنی اپنے جذبات، خیالات اور رویوں کی شناخت اور سمجھ، ایک اہم شخصی خصوصیت ہے جو فرد کی زندگی میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ صلاحیت بچوں کی شخصیت کی تعمیر اور زندگی کے مختلف مراحل میں کامیابی حاصل کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اس جدید دور میں تعلیم، پیشہ ورانہ زندگی اور روزمرہ کی سرگرمیوں ڈیجیٹل مہارتوں کا استعمال ناگزیر ہوگیا ہے۔ ایسے بچے جو ڈیجیٹل لٹریسی میں ماہر ہوتے ہیں، وہ نہ صرف تعلیمی مید ان میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ زندگی کے دوسرے مختلف شعبوں میں بھی کامیاب ہوسکتے ہیں۔

اس تناظر میں والدین کا کردار نہایت کلیدی ہے، کیونکہ بچوں کی ابتدائی نشوونما اور ان کی شخصیت کی تشکیل پر ان کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کے ساتھ بے جھجک اور ایماندارانہ گفتگو کریں، انھیں اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرنے کا موقع فراہم کریں اور ان کی باتوں کو سنجیدگی سے سنیں۔ اس طریقے سے بچے اپنے جذبات کی پیچیدگی کو سمجھنے اور انھیں مؤثر انداز میں ظاہر کرنے میں ماہر ہو سکتے ہیں۔ والدین کے طرزِ عمل کی تقلید بچے کی خود آگاہی میں مددگار ثابت ہوتی ہے لہٰذا والدین کو اپنے جذبات کے اظہار انھیں سنبھالنے کی عملی مثال قائم کرنی چاہیے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ والدین بچوں کے جذباتی تجربات کو سنجیدہ طور پر لیں اور انھیں یہ احساس دلائیں کہ ان کے جذبات اہم ہیں۔ خود آگاہی کے فروغ کے لیے ایک معاون ماحول فراہم کرنا، جہاں بچے آزادانہ طور پر اپنے جذبات کا اظہار کر سکیں، بھی اہم ہے۔ والدین بچوں کو خود آگاہی سے متعلق ادب، کہانیاں، اور تعلیمی مواد فراہم کر کے ان کی سمجھ بوجھ میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

اس طرح کی رہنمائی اور مدد بچوں کی خود آگاہی کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

قیادت کی صلاحیت

بچوں میں قیادت کی صلاحیتوں کا فروغ بھی ان کی زندگی میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ یہ صلاحیتیں بچوں کو مختلف مواقع پر کامیابی دلانے اور اپنے مقاصد میں مدد دیتی ہیں۔ قائدانہ صلاحیتیں بچوں کو خود اعتمادی، مسائل حل کرنے کی صلاحیت، ٹیم ورک اور دوسروں کے ساتھ مثبت

تعلقات بنانے کی مہارت فراہم کرتی ہیں۔ یہ صلاحیتیں انھیں ذمے داری، مثبت رویہ، اور معاشرتی ہم آہنگی کی طرف مائل کرتی ہیں جو ان کے مستقبل کے لیے بے حد اہم ہیں۔

والدین کا کردار اس حوالے سے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کو مختلف سرگرمیوں میں حصہ لینے کی ترغیب دیں تاکہ وہ اپنی قائدانہ صلاحیتوں کو نکھار سکیں۔ والدین کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی سے بچے نہ صرف اپنے اندر کے قدرتی لیڈر کو پہچانتے ہیں بلکہ زندگی کے ہر مرحلے میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔

والدین بچوں کو رہنمائی، مواقع، اور حوصلہ افزائی فراہم کر کے ان کی قیادت کی صلاحیتوں کو فروغ دینے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ وہ بچوں کو کھیل، فنون اور سماجی خدمات میں حصہ لینے کی دعوت دے سکتے ہیں تاکہ بچے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا اظہار کر سکیں۔ قیادت سے متعلق کتابیں اور ویڈیوز فراہم کرنا بھی بچوں کو قیادت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ بچوں کے ساتھ گفتگو کرنا جو انھیں خود آگاہی کی طرف راغب کرے، جیسا کہ ان سے یہ پوچھنا کہ آج انھیں کیا خوشی حاصل ہوئی یا کسی مشکل کو حل کیسے کیا جائے، ان کی فکری قوت کو بیدار کرتا ہے اور ان کی مسئلہ حل کرنے کی صلاحیتوں کو فروغ دیتا ہے۔ والدین کا کردار یہ بھی ہے کہ وہ بچوں کو ہمدردی، جذباتی ذہانت اور دوسروں کے جذبات کا احترام کرنا سکھائیں۔

زندگی کی مہارتیں تعلیم اور پیشہ ورانہ کامیابی کے علاوہ ذاتی زندگی میں بھی کامیابی کا اہم ذریعہ ہیں۔ موجودہ دور میں، اعلیٰ تعلیم اور بہترین تربیت کے ساتھ ساتھ، روزمرہ کی مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے ان مہارتوں سے آراستہ ہونا ضروری ہے۔ ایک ذمے دار شہری کی حیثیت سے ضروری ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں کو ان مہارتوں سے آشنا کریں تاکہ وہ کامیاب اور خوشحال زندگی گزار سکیں۔ والدین کی شمولیت، جذباتی حمایت، علمی تحریک، نگرانی، اور نظم و ضبط کی حکمت عملیوں کو بچوں میں زندگی کی مہارتوں کے فروغ کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ والدین کی شمولیت مواصلات، مسئلہ حل کرنے، لچک، اور خواندگی جیسی صلاحتوں کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ شمولیت سماجی و اقتصادی حیثیت، ثقافتی اصولوں، اور خاندانی حرکات سے متاثر ہوتی ہے۔ اس حوالے سے پائے جانے والے سماجی و ثقافتی تفاوت کو تسلیم کرنا اور ان سے نمٹنا ضروری ہے تاکہ تمام نوجوانوں کو ترقی کے مساوی مواقع مل سکیں۔ زندگی کی مہارتوں اور والدین کی شمولیت کا مشترکہ اثر نوجوانوں کی جامع ترقی اور مستقبل کی کامیابی کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ والدین کی فعال شمولیت، محبت، اور رہنمائی بچوں کی شخصیت اور قابلیت کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے، جس سے ان میں خود اعتمادی، احساسِ ذمے داری، اور مثبت رویے کی نشوونما ہوتی ہے۔ والدین کی نگرانی اور رہنمائی بچوں کو اخلاقی اور سماجی اصولوں کی پاسداری سکھاتی ہے، جو ان کی مجموعی ترقی کے لیے ضروری ہے۔

■

Mohd Waqar Shabbir
Research Scholar,
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad-500032(Telangana)
waqarkg@gmail.com

مولانا رومی کی جمالیات اور شکیل الرحمن

امانت اللہ

اردو

ادب کی دنیا میں کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو اپنے علم، فن اور فہم کی بنیاد پر ایک عہد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن ایسی ہی ایک نابغۂ روزگار شخصیت کا نام ہے، جنھوں نے ادب، تنقید، فلسفہ اور جمالیات کے میدان میں اپنی انفرادی شناخت قائم کی۔ ان کی تحریریں نہ صرف علمی وقار کی حامل ہیں بلکہ فکری بالیدگی اور جمالیاتی نزاکت کا حسین امتزاج بھی پیش کرتی ہیں۔

اردو تنقید کی تاریخ میں پروفیسر شکیل الرحمٰن کا مقام غیر معمولی ہے۔ ان کی تنقیدی بصیرت، علمی ژرف نگاہی اور فکری گہرائی نے اردو تنقید کو ایک نیا اسلوب، نیا زاویہ اور نئی سمت عطا کی ہے۔ انھوں نے نہ صرف اردو ادب کے بڑے فنکاروں پر گہرے مطالعے کے بعد اہم کام کیا بلکہ فارسی ادب کی عظیم شخصیات کو بھی اپنی فکری کاوشوں کا مرکز بنایا۔ مولانا رومی کی جمالیات پر ان کی گراں قدر تصنیف اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو نہ صرف جمالیاتی تنقید کا شاہکار ہے بلکہ مولانا رومی کے روحانی اور فکری نظام کو ایک وجد آفریں انداز میں قاری کے سامنے پیش کرتی ہے۔ شکیل الرحمٰن کا اندازِ تنقید روایت سے جڑا ہوا ہونے کے باوجود جدت، تخلیقی شعور اور فکری عمق سے لبریز ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن نے 'مولانا رومی کی جمالیات' لکھ کر دنیائے تنقید کو ایک نئی بلندی عطا کی اور اس سے بجا طور پر دنیا بھر کے ناقدین کو استفادہ کا موقع تو ہاتھ آیا ہی، ساتھ ہی کچھ ایسے نکات بھی سامنے آئے جو اس سے پہلے سامنے نہیں آئے تھے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا رومی کو جو جمالیاتی آسودگی حاصل تھی اس کو اجاگر کر کے شکیل الرحمٰن نے قارئین اور ناقدین کی تشنگی میں اضافہ کر دیا۔

مثنوی کے حوالے سے شکیل الرحمٰن نے مولانا رومی کی جمالیات کا جس عمق اور گہرائی سے تجزیاتی مطالعہ پیش کیا وہ زریں حروف میں تحریر کیے جانے کے قابل ہے۔ شکیل الرحمٰن نے مولانا رومی کی جمالیاتی وحدت اور انسانی رشتوں کی معنویت کو بہت احتیاط کے ساتھ اور حسین و جمیل پیرائے میں سجا کر قاری کے سامنے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

'مولانا رومی کی جمالیات' کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا کہ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے اس میں یہ بات کس خوش اسلوبی کے ساتھ واضح کر دی ہے کہ مولانا رومی کے کلام میں جمالیاتی تجربے آفتاب، روشنی، نور اور حرکت کے ان گنت پیکروں کے ساتھ ابھارے گئے ہیں۔

مولانا رومی کی جمالیات کو انھوں نے جداگانہ زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے، ساتھ ہی انھوں نے مولانا رومی کے تبحر علمی اور ان کی آفاقی شخصیت پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اور مولانا کے فلسفہ آدمیت، فلسفہ مذہب، فلسفہ حسن و عشق اور فلسفہ علم و حکمت پر انتہائی عرق ریزی سے روشنی ڈالی ہے۔ شکیل صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا رومی نے مادی زندگی کی حقیقتوں اور وجود کے روحانی پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے علم کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ علم کے بغیر زندگی کا عرفان حاصل نہیں ہو سکتا، ذہنی اور روحانی سکون حاصل نہیں ہو سکتا، بصیرت پیدا نہیں ہو سکتی، حقائق کو دیکھنے اور پہچاننے کے لیے وژن میں کشادگی نہیں آ سکتی۔ زندگی کے تعلق سے نئی دریافتوں کی لذت نہیں مل سکتی۔ وہ ذہنی اور قلبی سکون حاصل نہ ہوگا جس سے روحانی انبساط حاصل ہو۔[1]

مولانا رومی نے صوفیانہ نقطۂ نظر سے تو کام لیا ہے، مگر ان کے نزدیک بے رنگی اور بے رسی کبھی نہیں آئی۔ وہ جمالیات کے مختلف پہلوؤں پر اپنی نظر مرکوز رکھتے ہیں۔ بے رنگی اور بے نوری مولانا رومی کے یہاں کبھی جگہ نہیں پا سکیں، شکیل الرحمٰن نے مولانا رومی کی ان خصوصیات کو بہت باریکی سے جانچا پرکھا اور ان کے نظریات کو سمجھنے میں انتہائی دقت نظر سے کام لیا۔ مثنوی مولانا روم اور ان کی غزلیات کو جمالیات کی کسوٹی پر پرکھا اور باریک بینی سے ان کا جائزہ لیا۔ مثنوی مولانا روم کا کبیر، رابندر ناتھ ٹیگور، مولانا شبلی نعمانی، علامہ اقبال، فیاض احمد اویسی، محمد ناظر عرشی اور عبدالماجد یزدانی وغیرہم نے بھی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے، ان کی تشریحیں کی ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم نے مثنوی مولانا روم کی انگریزی تشریح کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا شبلی اور علامہ اقبال کے بعد شکیل الرحمٰن نے مولانا رومی کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے اور مولانا رومی کی جمالیات کا جس گہرائی میں ڈوب کر تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے وہ سنہرے الفاظ میں تحریر کیے جانے کے قابل ہے۔ شکیل الرحمٰن نے مولانا رومی کی مثنوی میں پوشیدہ خزینے نکالنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ انھوں نے مثنوی کے یوسف علیہ السلام اور زلیخا والے حصے پر نہایت دلفریب اور دلکش انداز میں تبصرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''یہ حصہ مثنوی مولانا روم کے بہترین حصوں میں ایک ہے۔ شاعری کا خوبصورت نمونہ تو ہے ہی اس سے عورت کی نفسیات کا ایک پر اسرار پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔''

پروفیسر شکیل الرحمٰن نے مولانا رومی کے اشعار کی تشریحات ایسے اچھوتے انداز میں کی ہے کہ انھیں پڑھتے ہی قاری کے دل و ذہن کے دریچے بے اختیار کھلنے لگتے ہیں۔ مولانا رومی کے ایک شعر کا ترجمہ کچھ اس انداز میں کیا ہے:

قسم ہے اللہ کی میں عبادت کرتے ہوئے یہ نہیں جانتا کہ میرا کوئی امام آگے کھڑا ہے یا نہیں اور رکوع کا اختتام ہو گیا۔ اور شعر کی تشریح ملاحظہ کیجیے:

''اے اللہ تو اپنی ذات میں تو نہ یہ ہے اور نہ وہ ہے۔ تیری ذات وہموں سے بھی آگے ہے۔''

مولانا رومی کے اس طرح کے اشعار کے بارے میں شکیل الرحمٰن کا یہ کہنا حقیقت سے کس قدر ہمکنار ہے کہ مولانا رومی کی روحانی تعلیم سے انسان کے ذہن کا کوئی نہ کوئی دریچہ کھلتا ہے اور جو ٹھنڈی اور لطیف ہوائیں ملتی ہیں ان سے بڑی جمالیاتی آسودگی ملتی ہے۔

شکیل الرحمٰن نے مولانا رومی کی جمالیات پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی غزلیات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مولانا رومی کی غزلیں نہ صرف فارسی شاعری بلکہ عالمی شاعری کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے مولانا رومی کی غزلیات پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی غزلوں کی بھی تشریح کی ہے۔ مولانا رومی کی غزلیات کے بارے میں ان کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:

''وہ غزل کے ایسے منفرد شاعر ہیں جو اپنے حسی اور جمالیاتی تجربوں سے قاری کے احساس جمال کو متاثر کرتے ہیں۔ قاری کے جمالیاتی وژن میں ایسی کشادگی پیدا کرنا چاہتے ہیں جس سے وہ اوپر اٹھے اور شاعر کے ان تجربوں کو چھو لے جو تصوف کی جمالیات کے رسوں سے لبریز ہیں۔''[3]

مولانا رومی کی شاعری میں رنگ و نور کا ایسا حسین امتزاج ہے جس کو سمجھنا اور اسے خوبصورتی کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کرنا انتہائی دشوار کام تھا مگر شکیل الرحمٰن نے اس چیلنج کو نہ صرف قبول کیا بلکہ مولانا رومی کی شاعری سے ایسے عطر کشید کئے جو کسی اور کے یہاں دور دور تک نظر نہیں آتے۔ جمالیات کا موضوع اتنا جامع اور حسین ہے کہ وہ اپنے اندر ایک کائنات کو سمیٹے ہوئے ہے اور شکیل الرحمٰن جو کچھ تخلیق کرتے ہیں اس کا معیار اتنا اعلیٰ اور وقیع ہے کہ اسے سمجھنے اور غور کرنے پر یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ شکیل الرحمٰن نے مولانا رومی کی روح کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا رومی کے تصوف کی روح ان کے اندر حلول کر گئی ہے۔ تصوف کے اسرار اور اس کے جمالیاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''تصوف میں تلاش و جستجو کا سلسلہ قائم رہتا ہے، حسی تجربوں کو پانے یا نئے تجربوں کو حاصل کرنے یا دھندلکوں میں ڈھونڈنے کا عمل جاری رہتا ہے، باطن میں نغمہ موجود رہتا ہے تغزل یا شعریت کا رس موجود ہوتا ہے۔ آہنگ پیدا ہوتا رہتا ہے اس کی جمالیات اور اس کی رومانیت اپنی تمام تر شدت کے ساتھ ہر دم اور ہر لمحہ موجود رہتی ہے جس کی وجہ سے سرمستی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، تصوف نغمہ بن جاتا ہے۔ شاعری بن جاتا ہے۔ پورے وجود کو نئے نئے سروں اور نئے نئے آہنگ سے آشنا کرتا رہتا ہے، باطنی سطح یا معصومیت Innocence کی سطح پر صوفی عشق کی کیفیت کو خوب جاننے اور بوجھنے لگتا ہے اس لیے کہ یہ اس کے اپنے عشق کی کیفیت ہوتی ہے عشق کی کیفیت سے سرشار ہوتے ہی وہ معصومیت کی اس خوب صورت و دلکش اور نازک سطح پر جشن منانے لگتا ہے۔ اللہ اور اس کے درمیان کوئی شے حائل نہیں ہوتی خود کلامی یا مونولوگ اپنے بہترین سروں کو لیے ہوتا ہے۔ تصوف وجود اور زندگی کے حسن میں پگھل جانے کا نام ہے۔''[4]

شکیل الرحمٰن فارسی شعرا میں مولانا رومی سے جس قدر متاثر ہیں اس کا واضح ثبوت انھوں نے اپنی تصنیف 'مولانا رومی کی جمالیات'' میں پیش کیا ہے۔ مولانا رومی کو ان کی مثنوی معنوی اور دیوان شمس تبریزی کی وجہ سے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے، یہی وجہ ہے کہ مغربی فنکاروں نے بھی انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور ان مثنوی کے تراجم بھی مغربی زبانوں میں کئے ہیں۔

شکیل الرحمٰن نے مولانا رومی کے افکار و خیالات کی تشریح بہت ہی اچھوتے انداز میں کی ہے اس کے لیے انہوں نے مختلف عنوانات کا سہارا لیا ہے اور وہ اس طرح ہیں: تصوف کی جمالیات اور اس کی رومانیت- دو امتیازی جہتیں، مولانا رومی- فنکار معلم، عشق کا جمال -عشق کی رومانیت، نور اور تحرک کا جمال، تصوف کی جمالیات دو بڑے سرچشمے، حضرت موسیٰ۔ ایک معنی خیز تہہ دار آرچ ٹائپ، جمالیات رومی میں حضرت یوسف ایک جمالیاتی پیکر اور آرچ ٹائپ، مولانا رومی کا داستانی مزاج وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

شکیل الرحمان نے مولانا رومی کے فکری جہات پر جس خوش اسلوبی سے روشنی ڈالی ہے وہ انہی کا خاصہ ہے۔ ان کی تمثیل کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''مولانا رومی کی تمثیلوں میں فکشن اور شاعرانہ دروں بینی (Poetic Vision) کی وجہ سے تخلیق کی جمالیاتی سطح بلند ہوگئی ہے۔ انھوں نے کہانیاں مختلف ذرائع سے حاصل کی ہیں۔ بعض کہانیاں بہت پرانی ہیں۔ ہندوستان کی بھی بعض کہانیاں ملتی ہیں (کلیلہ و دمنہ)۔ قرآن حکیم اور احادیث اور پیغمبروں کے واقعات بھی بہت بڑا ذریعہ ہیں ...بنیادی مقصد Known کے تئیں بیداری پیدا کرتے ہوئے مولانا رومی آرٹ کو تخلیقی اسرار (Creative Mystry) بنا دیتے ہیں .... مولانا رومی کے کلام میں خشک فلسفیانہ نکات نہیں ملتے۔ مولانا نے تصوف کی جمالیات میں اپنی فکر و نظر سے بڑی کشادگی پیدا کی ہے اور اس کی رومانیت کو نئی جہتیں بخشی ہیں۔''[5]

مولانا کی غزلوں کے حوالے سے شکیل الرحمٰن نے لکھا ہے کہ ان کے یہاں پیکر اور استعارے جانے پہچانے ہوتے ہیں لیکن ان میں روحانی ارتفاع کا وصف ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں لفظوں کے تکرار سے ایک عجیب سی تحرک آمیز مسرت حاصل ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''لفظوں کے دہرائے جانے سے وجد طاری ہونے لگتا ہے اس عمل کے تحرک کا تعلق روحانی کیف سے ہے۔ لفظوں کے تکرار سے جو آہنگ پیدا ہوتا ہے اس سے ایک لذت آمیز فضا بن جاتی ہے۔''[6]

اس ضمن میں غزلوں کے کچھ مصرعے بھی بطور مثال دیکھنے کو ملتے ہیں۔

لیبار ما، دلدار ما، رونق بازار ما باغ مست و راغ غنچہ مست و خار مست

کعبہ اسرارم، جبہ و دستارم ای جان من ای جان من سلطان من سلطان من

شام منم روز منم عشق جگر سوز منم من این نقاش جادو را نمید انم نمید انم

یہاں ظاہری طور پر غزل کے ان اشعار میں لفظوں کے تکرار سے ایک خاص قسم کا آہنگ پیدا ہو رہا ہے اور ایک پر کیف فضا قائم ہو جاتی ہے۔

شکیل الرحمٰن نے مولانا رومی کی عبقری شخصیت اور ان کی شاعری میں پوشیدہ جمالیاتی پہلوؤں کا جائزہ ہی نہیں لیا بلکہ مولانا رومی کی شخصیت میں مضمر صوفیانہ و جمالیاتی اسرار و رموز کو پوری طرح سمجھا ہے اور ان کی عقدہ کشائی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ اس لیے کوئی قاری شکیل الرحمٰن کے ذہن رسا کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا اور سچی بات یہ ہے کہ انھوں نے مولانا رومی کی مثنوی کی تشریح اس طرح کی ہے الفاظ گوہر نایاب اور قطرے دریا بن گئے ہیں۔ انھوں نے مولانا روم کے کلام بلاغت نظام سے تصوف کی مختلف جہتوں کا انکشاف بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔

دور جدید میں مولانا روم کی مثنوی کی تفہیم اور ان کی شخصیت کے ساتھ ان کے صوفیانہ افکار و تصورات کی گیرائی اور ان کی جمالیاتی جہتوں سے کما حقہ آگاہی حاصل کرنے کے لیے شکیل الرحمٰن کی تشریحات و تعبیرات سے استفادہ ضروری ہے۔

حواشی

1. مولانا رومی کی جمالیات، 2002، نرالی دنیا پبلی کیشنز، نئی دہلی، ص، 19-20
2. ایضاً، ص، 110
3. ایضاً، ص، 164
4. ایضاً، ص، 127-28
5. ایضاً، ص، 26-27
6. ایضاً، ص، 165

■

Amanatullah
Research Scholar, Dept of Urdu
Delhi University
Delhi-110007
Mob.:7982609375
mdamanat71@gmail.com

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورت حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب و ثقافت سے کیا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جا سکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان و ادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

تنویر احمد علوی (مونوگراف)

مصنف: ثمر جہاں

صفحات: 170، قیمت: 120 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ثاقب فریدی، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب تنویر احمد علوی پر ثمر جہاں کا تحریر کردہ مونوگراف ہے جو کہ ایک سو ستر صفحات پر مشتمل ہے۔ ثمر جہاں نے مجموعی طور پر تنویر احمد علوی کی زندگی و شخصیت اور ادبی خدمات کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ ابتدائیہ، سوانح و شخصیت، ادبی سفر کا آغاز، تنقیدی محاکمہ، منتخب تحریریں جیسے عناوین اس کتاب کی فہرست میں قائم کیے گئے ہیں۔

تنویر احمد علوی شہرت یافتہ محقق و نقاد اور ایک بہترین تخلیق کار تھے۔ اسی کے ساتھ تقریر و ترجمہ، لسانیات، ایشیائی تہذیب و تاریخ اور جغرافیہ میں ان کی گہری دلچسپی تھی۔ تنویر احمد علوی 1925 میں پیدا ہوئے اور 2013 میں ان کا انتقال ہوگیا۔

پروفیسر تنویر احمد علوی نے کلاسیکی اردو شاعری کے روایتی ادارے کردار اور علامتیں، غالب کی فارسی شاعری تعارف و تنقید، خطوط غالب کی روشنی میں، گل آثار رحمت، ہماری تاریخی عمارتیں، ہندی فارسی فرہنگ، ہمارا تہذیبی ورثہ، غالب کی سوانح عمری، لمحوں کی خوشبو، نشانات نور، پریے سندیس، رقص لمحات، صحیفہ ابرار، شمالی ہند کی بولیوں اور بھاشاؤں میں بارہ ماسائی گیتوں کی روایت، تجسس سے تجزیے تک، توسیعی خطبات پروفیسر محمد حسن، اردو میں بارہ ماسے کی روایت مطالعہ متن، اصول تحقیق و ترتیب متن، ذوق دہلوی مونوگراف، ذوق سوانح اور انتقاد جیسی اہم اور غیر معمولی کتابیں دنیائے ادب کے سامنے پیش کی ہیں۔ ان کتابوں کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ تنویر احمد علمی کا ذہن کس قدر قاموسی اور متنوع تھا۔ انھیں ہندی، اردو، عربی و فارسی زبان میں ید طولی حاصل تھا۔ آپ نے قرآن کریم بھی حفظ کیا تھا۔ تہذیب و تاریخ، اسلامیات و تصوف جغرافیہ و ہندی ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان چیزوں نے مل کر ان کی بصیرتوں میں اضافہ کیا۔

ڈاکٹر ثمر جہاں نے سوانح و شخصیت کے حصے میں پروفیسر تنویر احمد علوی کی زندگی سے متعلق اہم باتیں رقم کی ہیں اور شخصیت کے حصے میں ان کے مزاج و شخصیت اور عالمانہ ذہن پر روشنی ڈالی ہے۔ خاص طور سے شخصیت کے ذیل میں ازدواجی زندگی، مذہبی افکار تاریخ کی روشنی میں، تہذیبی وثقافتی افکار، تہذیبی وسماجی نظریات، صوفیانہ مزاج وافکار، ادب کے تئیں غیر جانب دارانہ رویہ جیسے ذیلی عناوین کے تحت مصنفہ نے تنویر احمد علوی کی شخصیت کی تفہیم کی ہے۔ اس حصے کو پڑھ کر تنویر احمد علوی کی زندگی اور شخصیت سے بخوبی واقفیت ہوتی ہے۔ اس مونوگراف کے دوسرے حصے کا عنوان تنویر احمد علوی کے 'ادبی سفر کا آغاز' ہے۔ اس حصے میں مصنفہ نے بتایا ہے کہ تنویر احمد علوی نے اپنے علمی سفر کی ابتدا حفظ قرآن سے کی اور اس کے بعد دارالعلوم دیوبند سے فارسی زبان کا تین سالہ کورس کیا۔ 1941 میں انھیں بھوپندر طبیہ کالج پٹیالہ بھیج دیا گیا۔ انھوں نے طب میں گولڈ میڈل حاصل کیا لیکن اس کے باوجود ان کی طبیعت طب کی جانب راغب نہ ہوسکی۔ ان کا فطری میلان شعروادب کی جانب

ہی رہا۔لہٰذا انھوں نے اعلیٰ تعلیم کا حصول جاری رکھا۔تنویر احمد علوی نے ذوق سوانح اور انتقاد پر تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔یہ مقالہ مجلس ترقی ادب لاہور سے 1963 میں شائع ہوا۔دلی یونیورسٹی سے تدریسی وابستگی بھی رہی۔اس زمانے میں گوپی چند نارنگ اور ظہیر احمد صدیقی جیسے اساتذہ دلی یونیورسٹی میں موجود تھے۔اس کے بعد وہ 1972 میں جامعہ کالج بحیثیت ریڈر آگئے اور یہاں کے پہلے صدر شعبہ بھی ہوئے۔مسعود حسین خاں جب جامعہ کے وائس چانسلر ہوئے تو وہ تنویر احمد علوی کی علمی صلاحیتوں سے واقف تھے۔لیکن مصنفہ لکھتی ہیں کہ مسعود حسین خاں نے پروفیسر شپ کے لیے تنویر احمد علوی کی بجائے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا انتخاب کیا۔اس کی وجہ یہ تھی گوپی چند نارنگ میں علمی وادبی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ انتظامی صلاحیت بھی بدرجہ اتم تھی اور ان کے مقابلے میں تنویر احمد علوی خوش اخلاق اور خلوص وانکسار کا پیکر تھے۔اس کے بعد تنویر احمد علوی واپس دہلی یونیورسٹی چلے گئے اور تقریباً 1990 تک وہاں کے شعبہ اردو سے منسلک رہے۔مصنفہ نے بتایا ہے کہ ایک اندازے کے مطابق تنویر احمد علوی نے بیس سے زائد توسیعی خطبات پیش کیے تھے۔انھوں نے اپنی تصنیف میں چودہ خطبات کے عناوین درج کئے ہیں، ساتھ ہی وہ خطبات کہاں پیش کیے گئے اس کا بھی اندراج کیا ہے۔

تنقیدی محاکمہ کے تحت مصنفہ نے تنویر احمد علوی کی کتابوں کا تنقیدی وتحقیقی جائزہ لیا ہے۔سب سے پہلے ان کی کتاب ذوق سوانح اور انتقاد کا ذکر آیا ہے۔اس ذیل میں انھوں نے اس کتاب کی تفصیلات ومشمولات کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔اس کے بعد کلیات ذوق، کلیات شاہ نصیر، اردو میں بارہ ماسے کی روایت: مطالعہ ومتن، اصول تحقیق وترتیب متن، تنویر احمد علوی بحیثیت مترجم، صحائف متن، صحیفہ ابرار، مکتوبات عالیہ، تنویر احمد علوی بحیثیت شاعر، تنویر احمد علوی بحیثیت ہندی شاعر، تنویر احمد علوی بحیثیت غالب شناس، اوراق معانی، نقش نیم رخ ترجمہ نامہ ہائے فارسی غالب، خطوط غالب کی روشنی میں غالب کی سوانح عمری، غالب کی فارسی شاعری تعارف وتنقید، تنویر احمد علوی ایشیائی تاریخ وتہذیب کے مرقع نگار، جنوب مغربی ایشیا میں ہمارا تہذیبی ورثہ، تنویر احمد علوی بحیثیت نقاد، تجسس سے تجزیے تک، کلاسیکی اردو شاعری کے روایتی ادارے، کردار اور علامتیں، بحیثیت لغت نویس (ہندی فارسی فرہنگ) جیسے عناوین کے تحت مصنفہ نے تنویر احمد علوی کی کتابوں کا تنقیدی محاکمہ کیا ہے۔ظاہر ہے کہ مونوگراف میں تفصیل کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے اور پھر تنویر احمد علوی جیسی عبقری شخصیت کی کتابوں کا محاکمہ آسان نہیں ہے۔اس کے باوجود مصنفہ نے بڑی خوبی کے ساتھ ان کی کتابوں کے بارے میں اہم باتیں درج کی ہیں۔ان تنقیدی محاکموں میں تنقید سے کہیں زیادہ ان کتابوں کے علمی وادبی مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے جس سے تنویر احمد علوی کی علمی وادبی بصیرت کی بخوبی خبر ملتی اور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں کس قدر بڑا اور قابل قدر علمی وادبی، تحقیقی وتخلیقی ذہن پایا تھا۔اس کے بعد کتاب کے آخر میں تنویر احمد علوی کی چند منتخب تحریریں پیش کی گئی ہیں۔اس میں تنویر احمد علوی کے مضامین بھی ہیں اور ان کی شاعری کا بھی کچھ حصہ شامل کیا گیا ہے۔ان کے سفرنامہ لاہور وحیدرآباد کا بھی کچھ حصہ ہے اور کچھ اہم مکتوبات کو بھی اس حصے میں شامل کیا گیا ہے۔ان تحریروں کو پڑھ کر تنویر احمد علوی کے علمی وادبی متن سے قربت محسوس ہوتی ہے۔ایک شوق پیدا ہوتا ہے کہ ان کی تحریروں کو از اول تا آخر پڑھا جائے۔مجموعی طور پر تنویر احمد علوی کے موضوع پر ثمر جہاں کا یہ مونوگراف بہت اہم ہے۔انھوں نے حتی الامکان یہ کوشش کی ہے کہ اس میں تنویر احمد علوی علمی وادبی شخصیت کے ساتھ ان کے زندگی وشخصیت کے نقوش بھی سمیٹ لیے جائیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

تحقیق و تنقید

(1) حیدرآباد میں اردو زبان کے ذریعہ جدید طب
(2) جامعہ عثمانیہ کے اردو ڈاکٹر قلم کار

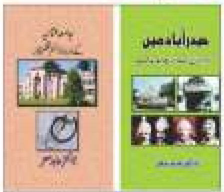

مؤلف: ڈاکٹر عابد معز

صفحات: 142، 192، قیمتیں: 200، 300، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: ایم آر پبلی کیشنز نئی دہلی

مبصر: سید سرفراز احمد، موبائل: 9030768388

یوں تو اردو ادب کے ہر شعبہ میں بہت سا کام ہوا اور بہت سی کتابیں بھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ یہ دونوں کتابیں انوکھی اور منفرد خصوصیات کی حامل ہیں۔ ان دونوں کتابوں کے مصنف تاریخی شہر حیدرآباد کے ڈاکٹر عابد معز صاحب ہیں مصنف چونکہ شعبہ طب سے وابستہ ہیں خصوصی طور پر تغذیہ کے ماہر ہیں۔ لیکن اردو ادب سے اٹوٹ وابستگی رکھتے ہیں اسی لیے انھوں نے اپنے ہی شعبہ میں اردو ادب پر بہترین کام کیا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو اردو زبان سے کس قدر والہانہ محبت ہے۔

ویسے تو مصنف ڈاکٹر عابد معز نے شعبہ صحت وطب سے متعلق کم و بیش دو درجن کتابیں لکھی ہیں۔ بلکہ مصنف کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ اردو ادب وطنز و مزاح کے میدان میں خاصا عبور رکھتے ہیں۔ اور اس میدان میں بھی آپ کی ڈیڑھ درجن کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔

مصنف کی کتاب حیدرآباد میں اردو زبان کے ذریعہ جدید طب 144 صفحات پر مشتمل ہے اس کا مقدمہ نامور محقق ڈاکٹر اسعد فیصل فاروقی نے لکھا ہے۔ آپ نے انتہائی جامع مقدمہ تحریر کیا ہے ڈاکٹر اسعد فیصل کا تعلق علی گڑھ سے ہے۔ آپ کی بھی اہم خوبی یہ ہے کہ آپ نے اردو طبی صحافت کے علاوہ دیگر موضوعات پر بہترین تحقیقی و تصنیفی کام کیا ہے۔

ڈاکٹر عابد معز کی دوسری کتاب جامعہ عثمانیہ کے اردو ڈاکٹر قلم کار جو 192 صفحات پر مشتمل ہے۔ جس کا مقدمہ حقانی القاسمی نے تحریر فرمایا ہے۔ آپ کی زیر ادارت یک موضوعی مجلّہ انداز بیاں نکلتا ہے انداز بیان کی سب سے خاص اور منفرد خصوصیت یہ ہے کہ ہر شمارہ ایک ہی موضوع پر ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے حقانی القاسمی کا یہی مقصد ہے کہ گمنام ادیبوں، ناقدوں اور تخلیق کاروں کی خدمات سے قارئین کو واقف کروایا جائے۔ اس مجلّہ کے تیسرے شمارے کو میڈیکل ڈاکٹروں کی ادبی خدمات کا موضوع بنا کر شائع کیا گیا۔

آپ نے اس کتاب کے مقدمہ میں لکھا کہ ڈاکٹر عابد معز نے ادب اور ادویات کو ایک گہرے رشتے سے جوڑ کر پیش کیا ہے۔ جو انسانی کیفیات کے اصل طبیب ہیں۔ اردو کے ڈاکٹر قلم کار کتاب کو ایک نیا موضوعی منطقہ کہا ہے اور کہا کہ اس نوع کی کتابیں محنت شاقہ اور عرق ریزی کے بعد ہی وجود میں آ سکتی ہیں۔

ریاست حیدرآباد میں جدید طب سے قبل قدیم طب یعنی دیسی طریقے سے علاج کیا جاتا تھا۔ قلی قطب شاہ نے شہر حیدرآباد کی بنیاد رکھنے کے بعد 1595 میں چارمینار کے قریب موسیٰ ندی کے کنارے دارالشفا کے نام سے ایک دواخانہ بنایا تھا اس دواخانے میں یونانی اور ایورویدا طریقے سے علاج کیا جاتا تھا۔ ملک کی دیگر ریاستوں کی طرح ہی ریاست حیدرآباد کے عوام جدید طب یعنی ایلوپیتھی سے ناآشنا تھے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں برطانوی فوج کی آمد کے ساتھ جدید طب کا آغاز ہوتا ہے جدید طب کی ترقی میں آصف جاہی حکمرانوں کا خاصا تعاون رہا ہے۔ جدید طب کی تعلیم بذریعہ اردو دینے کا فرمان چوتھے نظام نواب ناصر الدولہ نے جاری کیا اور 1846 میں برطانوی ریزیڈنٹ کے تعاون سے حیدرآباد میڈیکل اسکول قائم کیا۔ جب اردو ذریعہ تعلیم کی پہلی جامعہ قائم ہوئی تو جامعہ عثمانیہ میں فیکلٹی آف میڈیسن کا قیام بھی عمل میں لایا گیا جس کے تحت حیدرآباد میڈیکل اسکول کو کالج کا درجہ دیا گیا اور نظام سابع کے نام پر عثمانیہ میڈیکل کالج نام رکھا گیا۔

حیدرآباد میں اردو زبان کے ذریعہ جدید طب کے مصنف ڈاکٹر عابد معز اپنی اس کتاب کو لکھنے کی اہم وجہ بتاتے ہیں کہ ایک تو اردو کے ذریعہ جدید طب کی تعلیم جو ریاست حیدرآباد کے آصف جاہی حکمرانوں کا عظیم کارنامہ تھا۔ مجھے ریاست حیدرآباد میں جدید طب یا ایلوپیتھی اور اردو کے درمیان باہمی روابط میں دلچسپی پیدا ہوئی اور میں اس موضوع سے متعلق لٹریچر پڑھنے اور اکٹھا کرنے لگا۔

ڈاکٹر عابد معز اپنی دوسری کتاب جامعہ عثمانیہ کے اردو ڈاکٹر قلم کار لکھنے کی وجہ بتاتے ہیں کہ جامعہ عثمانیہ دیگر جامعات سے بالکل الگ شناخت رکھتی ہے۔ خاص طور سے یہاں سے اردو سے فارغ التحصیل ڈاکٹروں کو اردو زبان و ادب سے دلچسپی رہی۔ سقوط حیدرآباد کے بعد بھی اس ریاست میں اردو پڑھنے لکھنے بولنے والوں کی تعداد زیادہ تھی ان ہی ڈاکٹروں کی ادبی خدمات کا اس کتاب میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے ایک صدی پر محیط اردو زبان کے اس دور کو 'اردو کا زریں دور' قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر عابد معز لکھتے ہیں کہ ریاست حیدرآباد میں سقوط (سنہ 1948) تک اردو سرکاری زبان تھی اور جب بذریعہ اردو میں ایم بی بی ایس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ سقوط حیدرآباد کے بعد اس تعلیم کو اردو سے انگریزی میں کر دیا گیا۔ اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد جدید طب کی تعلیم کا اردو میں آغاز ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ جدید طب کی تعلیم کا آغاز جامعہ عثمانیہ کے قیام سے بہت پہلے ہو چکا تھا اور اس کے لیے آصف جاہی دور کے چوتھے نظام نواب میر فرخندہ علی ناصر الدولہ نے ایلوپیتھی طب سے متاثر ہو کر ریاست کے عوام کے علاج و معالجہ کے لیے دواخانے اور ڈسپنسریاں کھولی تھی۔ بعد ازاں چھٹے اور ساتویں نظام نے عوام کے علاج و معالجہ میں سہولتوں کی فراہمی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی یہ ایک منفرد کام تھا جس کی کوئی مثال برصغیر میں نہیں ملتی۔

ڈاکٹر عابد معز لکھتے ہیں جدید طب بذریعہ اردو ریاست حیدرآباد میں یہ کام دو وقفوں کے دوران ہوا اور یہ تجربہ کامیاب بھی رہا۔ پہلا دور حیدرآباد میڈیکل اسکول جو 1846 سے تقریباً چالیس سال تک یہاں تعلیم سے فارغ ہونے والے طلبہ کو حکیم کی ڈگری عطا کی جاتی تھی۔ درمیان میں ایک چھوٹا وقفہ آیا جس میں اردو کو پھر انگریزی تعلیم کر دیا گیا تھا اس کا دوسرا دور 1926 سے 1950 تک کا ہے۔ جس میں حیدرآباد میڈیکل اسکول کو کالج کا درجہ دے کر جامعہ عثمانیہ سے ملحق کیا گیا۔ اردو کے ذریعے ایم بی بی ایس کی تعلیم سقوط تک ہوتی رہی۔ پھر ذریعہ تعلیم 1950 سے انگریزی کر دیا گیا۔ تب سے عثمانیہ میڈیکل کالج ریاستی حکومت کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔

جب تک آصف جاہی دور ریاست حیدرآباد پر حکمرانی کرتا رہا اردو سے تعلیم

حاصل کرنے والے بے شمار ڈاکٹرس اس سے فیض یاب ہوکر دنیا بھر میں پھیلتے رہے اور اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ ظاہر ہے یہ سوال ذہن میں آئے گا کہ آخر کس بنا پر اردو کو انگریزی میں منتقل کردیا گیا؟ اس سوال کا جواب ڈاکٹر عابد معز لکھتے ہیں کہ مختلف زاویوں سے غور وخوض کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ ایک سیاسی فیصلہ تھا جس نے نہ صرف اردو زبان کو نقصان پہنچایا بلکہ کسی ہندوستانی زبان میں اعلیٰ تعلیم کے تجربے کو ادھورا اور نامکمل چھوڑ دیا۔ اس کتاب میں ڈاکٹر عابد معز نے اردو میں دی جانے والی ڈاکٹر ڈگری کی سند کے عکس کا حوالہ بھی پیش کیا ہے جس میں ایک الگ ہی خوبی نظر آرہی ہے اردو زبان اور جدید طب کتاب میں اردو سے ایم بی بی ایس کرنے والے کئی ڈاکٹرس کے مشاہدات اور تاثرات بھی پیش کیے گئے۔ ان تاثرات کو جب آپ پڑھیں گے تو یہ محسوس کریں گے کہ آج کے دور میں بھی اردو کے ذریعہ ڈاکٹری کو پڑھا جاسکتا ہے۔ بلکہ اردو سے پڑھنے والے طلبہ نہ صرف ایک طب کے ماہر بن کر نکل سکتے ہیں بلکہ ان کے اندر ہر لمحہ ادب اور زبان کی شائستگی کی بھی قوی امید کی جاسکتی ہے جس کا موجودہ دور میں فقدان نظر آتا ہے۔

اہم بات یہ بھی تھی کہ اردو میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو کبھی بھی انگریزی زبان سے مشکلات کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ یہ بات ہم آج کے موجودہ زمانے میں بھی دیکھتے ہیں کئی ایک طلبہ کی بنیادی تعلیم یا یوں سمجھئے انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم اردو سے ہوتی رہی پھر وہ انگریزی میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے ڈاکٹر انجینئر یا دیگر پروفیشنل کورسس میں اول مقام حاصل کرتے رہے۔ بلکہ بیرونی ممالک جاکر بھی ماسٹرس کی ڈگریاں حاصل کررہے ہیں جس کو مجموعی طور پر یوں کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں کبھی بھی رکاوٹ کا ذریعہ نہیں بنی۔ اسی سے مناسبت رکھنے والی ایک مثال کو ڈاکٹر عابد معز اس کتاب میں ڈاکٹر منور علی کے تاثرات کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انڈین میڈیکل کونسل کے نمائندوں کی حیثیت سے ڈاکٹر بی سی اور کرنل لال شاہ نے برسوں پہلے عثمانیہ میڈیکل کالج اور عثمانیہ اسپتال میں نظریہ طبی تعلیم اور امتحانات کی جانچ پڑتال کی تھی۔ بی سی رائے نے اعتراف کیا تھا کہ عثمانیہ میڈیکل کالج کے طالب علم ہندوستان کے دوسرے میڈیکل طالب علموں کے مقابلہ بہتر اور عمدگی کے ساتھ ڈاکٹری سمجھتے ہیں اور اسپتال میں ان کی کارکردگی کا معیار بہت آگے ہے۔

(2)

ڈاکٹر عابد معز کی دوسری کتاب 'جامعہ عثمانیہ کے ڈاکٹر قلم کار' ہے۔ اس میں ڈاکٹر عابد معز نے کئی ایسے ڈاکٹرس جو ماضی میں سائنس داں رہ چکے ہیں ان کی مثالیں پیش کرتے ہوئے بتایا کہ انھیں بھی اپنی مادری زبان میں ادب سے کہیں نہ کہیں بے حد لگاؤ تھا۔

سوال ہے ڈاکٹرس کیوں لکھتے ہیں؟ اس سوال کا جواب ڈاکٹر عابد معز یوں دیتے ہیں اس کی دو وجوہات ہیں ایک ڈاکٹری پیشے میں لکھنا دستاویز تیار کرنا یہ ایک اہم ذمہ داری ہوتی ہے۔ وہ لکھنے سے بچ نہیں سکتے اگر نہ لکھیں تو گرفت ہوسکتی ہے۔ دوسرا ڈاکٹرس کو مریض کی ہسٹری لکھنا ہوتا ہے جس کو روداد کہا جاتا ہے کیونکہ مریض جب ڈاکٹر کے پاس آتا ہے تو وہ اپنی پوری کہانی تفصیل سے سناتا ہے جس سے ڈاکٹر کے پاس ایک اچھا موضوع ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنی ذرا سی تخلیقی صلاحیت کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہ بہترین نثر لکھ سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال شہر حیدرآباد کے ماہر نفسیات ڈاکٹر مجید خان کی ہے جن کا ہر ہفتہ ایک کالم روزنامہ سیاست میں شائع ہوتا تھا۔ جس میں وہ ہر ہفتہ اپنے کسی ایک مریض کی خاص روداد کو لے کر منظم انداز میں بہترین کالم لکھتے تھے اور مفید مشورے دیتے تھے۔

اس کتاب میں کئی ایسے ڈاکٹر قلم کار کا تعارف پیش کیا گیا جو پیشے سے ڈاکٹر ہیں لیکن ادب میں بھی اپنا بہترین مقام بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ جن میں مسلم اور غیر مسلم ڈاکٹرس شامل ہیں۔ اس کتاب میں جتنے ڈاکٹرس قلم کار کا تذکرہ ملتا ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے دور کے اہم ڈاکٹرس کے ساتھ ساتھ اہم قلمکار بھی رہ چکے ہیں۔ جن میں غیر مسلم ڈاکٹرس بھی شامل ہیں۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر عابد معز نے حوالے کے ساتھ پیش کرکے بتایا کہ انھیں اردو زبان سے کس قدر محبت تھی۔ ڈاکٹر شیام سندر پرساد جو ماہر امراض چشم تھے ان کے دواخانے میں دو اردو اشعار لکھے ہوئے تھے اس کتاب میں ہر قسم کے اردو ڈاکٹر قلم کار کے کارناموں کو پیش کیا گیا۔ جنھوں نے اس زبان کی ترقی وترویج میں اہم رول ادا کیا۔ خود ان دونوں کتابوں کے مصنف ڈاکٹر عابد معز نے میدان طب میں اپنی جادوئی قلم کاری کا اس طرح لوہا منوایا کہ جس سے شعبہ طب کو بھی تقویت حاصل ہوئی۔ اور اردو زبان کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ بلکہ آپ نے طنز ومزاح نگاری کی بھی چاروں سمتیں روشن کی۔ آپ کے طنز ومزاح نگاری میں بھی شائستگی کا ہر پہلو نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر عابد معز لکھتے ہیں جامعہ عثمانیہ سے فارغ التحصیل ان ڈاکٹروں نے اردو زبان و ادب کی ترقی وترویج میں حسب مقدور حصہ بھی لیا ہے۔ ان ڈاکٹروں میں ڈاکٹر سید عبدالمنان، ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر آر طاہر قریشی، ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی، ڈاکٹر مجید خان، ڈاکٹر ماجد قاضی، ڈاکٹر شیام سندر پرساد، ڈاکٹر سکندر حسین، ڈاکٹر محمد یوسف احمد، ڈاکٹر سید تقی عابدی، ڈاکٹر سعید نواز، ڈاکٹر محمد فصیح الدین علی خان، ڈاکٹر محمد قطب الدین ابوشجاع، اور ڈاکٹر عابد معز شامل ہیں۔

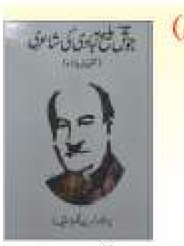

جوش ملیح آبادی کی شاعری (تنقیدی جائزہ)

مصنف: پروفیسر نسرین بیگم (علیگ)

صفحات: 241، قیمت: 550 روپے

ناشر: مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ

مبصر: عذرا سہیل، 11/3، گلی نمبر 6، سنگم وہار، وزیرآباد، دہلی۔ 84

نسرین بیگم پروفیسر و صدر شعبہ اردو بیکنٹھی دیوی کنیا مہاودیالیہ، (آگرہ) میں اپنی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ وہ اردو ادب میں تدریس، تحقیق اور تنقید کے میدان میں سرگرم ہیں۔ انھوں نے جوش ملیح آبادی کی نثر نگاری پر ایک اہم تنقیدی و تحقیقی کتاب پر کام کیا ہے، جس کا عنوان 'جوش ملیح آبادی کی نثری خدمات' ہے۔ یہ کتاب اردو ادب میں جوش کی نثر نگاری کے پہلوؤں کا تفصیل سے جائزہ پیش کرتی ہے۔ اور اب ان کی شاعری پر بھی کتاب منظر عام پر آچکی ہے۔ یہ کتاب 'جوش ملیح آبادی کی شاعری (تنقیدی جائزہ)' کے نام سے ہے۔

جوش ملیح آبادی اردو ادب کے معروف شاعر، نثر نگار اور صحافی تھے۔ انھیں 'شاعر شباب' کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی شاعری میں جذباتی ولولہ، جوش اور انقلابیت

نمایاں ہے۔ انھوں نے بیسویں صدی کی اردو شاعری کو ایک نئی توانائی اور ولولہ عطا کیا۔ان کا اصل نام شبیر حسن خان تھا اور وہ ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ جوش کی شاعری میں جذبے کی شدت، الفاظ کی روانی، اور خیالات کی گہرائی نمایاں خصوصیات ہیں۔

جوش کی شاعری انقلابی اور حب الوطنی کے موضوعات پر مشتمل ہے۔ جوش کی شاعری کا انداز خطیبانہ ہے۔ وہ اپنی نظموں میں زورِ بیان اور بلند آہنگی کے ساتھ مخاطب کو متوجہ کرتے ہیں۔ان کے اشعار میں خطابت کا وہی جوش وخروش ہوتا ہے جو ایک مقرر کے الفاظ میں پایا جاتا ہے۔ جوش کی شاعری میں زبان کا استعمال بہت پراثر اور ادبی لحاظ سے اعلیٰ معیار کا ہے۔ وہ عربی، فارسی، اور سنسکرت زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے جس کا عکس ان کے کلام میں بخوبی دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں محاوروں، تشبیہوں اور استعاروں کا خوبصورت استعمال قاری کو متاثر کرتا ہے۔

جوش کے اہم شعری مجموعوں میں شعلہ وشبنم، جنون وحکمت، سنبل وسلاسل وغیرہ ہیں۔ان کی شاعری اردو ادب کے سرمائے کا ایک اہم حصہ ہے۔ جوش کی شاعری اردو ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہے جو آج بھی نئی نسل کے لیے حوصلہ، جذبہ اور فکری رہنمائی کا ذریعہ ہے۔ان کا کلام زندگی کی سچائیوں اور انسان کے باطنی جذبات کا آئینہ دار ہے۔ جو آج بھی اردو کے قارئین کو متاثر کرتی ہے۔

اس کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب 'اول' جوش کی حیات اور شخصیت پر ہے۔ جس میں انھوں نے جوش ملیح آبادی کی پیدائش، وفات، آبا واجداد، ابتدائی تعلیم، ملازمت، اعزاز واکرام اور ان کی پوری حالات زندگی کو بہت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ان کا تعلق ایک اہم تعلیم یافتہ خاندان سے تھا۔

اس کتاب کا دوسرا باب 'جوش بحیثیت نظم گو' کے نام سے ہے۔ اس باب میں پروفیسر نسرین نے 'جوش کی رومانی نظمیں'، 'جوش کی طنزیہ نظمیں'، جوش کی مرثیہ نگاری اور جوش کی مذہبی نظمیں کے نام سے الگ الگ مضامین ہیں۔ اس باب میں انھوں نے جوش کی نظم نگاری کو الگ الگ رنگ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جوش کی شاعری میں انقلاب کا عنصر نمایاں ہے۔

کتاب کا 'تیسرا' باب جوش کی غزل گوئی پر مبنی ہے۔ اس باب کا نام 'جوش بحیثیت غزل گو' ہے۔ اس باب میں پروفیسر نسرین بیگم نے جوش کی غزل گوئی پر بات کی ہے۔ جوش کی غزلیں زبان و بیان کی چمک، فکری بلندی اور جذبات کی شدت سے مامور ہوتی ہے۔ جوش کی غزل میں کلاسیکی رنگ کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات بھی پائے جاتے ہیں۔ جوش کی غزلوں میں الفاظ کا استعمال بہت نپا تلا ہوتا ہے۔ان کی غزلوں میں عاشقانہ جذبات نہیں بلکہ ایک فکری کائنات موجود ہے۔ اگرچہ وہ نظم کے شاعر زیادہ سمجھے جاتے ہیں لیکن ان کی غزلیں اردو ادب میں ایک الگ مقام رکھتی ہے۔

اس کتاب کا چوتھا باب 'جوش بحیثیت رباعی گو' ہے۔ جس میں انھوں نے جوش کی رباعیات کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور جوش کی رباعیوں پر فکری پہلو کے ساتھ ساتھ تمام موضوعات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

اس کتاب کا پانچواں اور آخری باب 'جوش کے فکر وفن کا تنقیدی جائزہ' ہے۔ جوش ملیح آبادی اردو کے عظیم شاعر نثر نگار اور نقاد تھے۔ان کی شاعری میں فکری اور فنی گہرائی نمایاں ہے۔ان کی فکری اور فنی تنقید کا جائزہ لیتے وقت مصنف نے ان کے نظریات، ادبی رجحانات، انقلابی فکر، خود اعتمادی، انفرادیت اور تنقیدی شعور کو مدنظر رکھا ہے۔

پروفیسر نسرین بیگم علیگ نے جوش کی شاعری (تنقیدی جائزہ) کی شکل میں ایک اہم کتاب اردو قارئین کے لیے فراہم کیا ہے۔ اس کتاب میں جوش کی شاعری کے مختلف رنگوں کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ہر طرح سے لائق تحسین ہے امید ہے کہ طلبہ اور اساتذہ میں یہ کتاب مقبول ہوگی۔

ترتیب

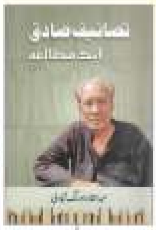

تصانیف صادق: ایک مطالعہ

مرتب: عبدالقادر اورنگ آبادی

صفحات: 112، قیمت: 200 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی-2

مبصر: ڈاکٹر جہاں گیر حسن، شاہ صفی اکیڈمی، سید سراواں، کوشامبی (یوپی)

'تصانیف صادق: ایک مطالعہ' کے مرتب ومدون جناب عبدالقادر علمی وادبی اور تاریخی وثقافتی شہر اورنگ آباد سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک لمبی مدت تک درس وتدریس سے وابستہ رہے ہیں۔ اردو زبان وادب کی اشاعت وخدمات میں حصہ لینا اور ترتیب وتدوین کے پردے میں مشاہیر ادبا وشعرا کے ناقابل فراموش کارناموں کو منظر عام لانا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ زیر نظر مجموعہ مضامین بھی جناب عبدالقادر کے سلسلۂ ترتیب وتدوین کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کتاب میں فاضل مرتب نے بطیب خاطر یہ سعی جمیل کی ہے کہ پروفیسر صادق کی علمی وادبی اور اخلاقی وتربیتی شخصیت مکمل طور سے مبتدیان ومنتہیان علم وادب کے سامنے واضح ہو جائے۔

یہ کتاب دو حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے حصے میں 9 منظوم مجموعوں پر مشتمل تحریریں شامل ہیں اور دوسرے حصے میں 16 منثور مجموعوں پر مشتمل تحریریں ہیں۔ چھ صفحات پر مبنی دیباچہ کمال وخوبی کے ساتھ پروفیسر صادق کے علمی وادبی اسفار اور مخلص وہمدرد شخصیت کا خاکہ پیش کرتا ہے اور سمندر کو کوزے میں سمونے کی عمدہ مثال ہے۔

دیباچہ کے بعد سب سے پہلی تحریر 'دستخط' کے عنوان سے ہے جو پروفیسر صادق کا اوّلین نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے خداداد شعری صلاحیت کے ساتھ ان کے مشاہدات وتجربات کو نمایاں کیا ہے۔ ابوالکلام قاسمی کی یہ تحریر تحسین وتنقید کا سنگم ہے جس کے بموجب: پروفیسر صادق کی غزلیں، نظموں سے زیادہ متاثر کن ہیں۔ کمار پاشی کے مطابق: 'سلسلہ' دوسرا شعری مجموعہ ہے اور اس میں بھی نظموں کو بالخصوص جگہ دی گئی ہے اور 'سلسلہ' کی نظموں میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ 'نوحہ' اور 'گزرتے ہوئے' واسوخت وغیرہ نظمیں اس میں شامل ہیں۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری 'کشاد' پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کی نظمیں اور غزلیں نئے رنگ وآہنگ میں ہیں۔ شاعر نے زبان و بیان کا انوکھا اور استعجاب انگیز تجربہ پیش کیا ہے۔ 'خواب کے جلنے کا منظر' پر گفتگو کرتے ہوئے جاوید ناصر نے اوّلاً پروفیسر صادق کی ذات سے متعلق گفتگو کی ہے کہ 'یہ مصور ہیں۔ آنکھ ان کا قلم ہے اور بصارت ان کی بصیرت ہے' اور پھر اصل کتاب پر اپنی قیمتی رائے پیش کی ہے کہ ان کی طویل نظمیں 'اول آخر'، 'آخر اول'، 'بگڑتی بنتی ہزار لہریں' اور 'مجذوب' کائناتی اکائی بن جاتی ہیں۔

'نظمیں، غزلیں گرد آلود' یہ 127 نظموں کا مجموعہ شامل ہے اور سبھی نظمیں آزاد فارم میں ہیں۔ مزید یہ کہ اس میں نہ نظم نگار کی کوئی تحریر شامل ہے اور نہ ہی کسی اہل علم کی آرا۔ 'گرتے آسمان کا بوجھ' پروفیسر موصوف کا پہلا ہندی مجموعہ ہے، جس میں ہندی غزلوں کے ساتھ اردو غزلیں بھی شامل ہیں۔ 'شبدوں کا جنم' کا تعارف پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر رمیس سونی نے پہلے مصنف کی شخصیت و شاعری اور علمی و ادبی حیثیت پر گفتگو کی ہے اور پھر اصل مجموعہ کو موضوع سخن بنایا ہے۔ اس میں کل پانچ ذیلی عنوانات ہیں اور ان سب کے تحت 51 نظمیں شامل ہیں۔ 'سر پر کھڑا شنی ہے' ہندی غزلوں کا یہ مجموعہ 2006 میں چھپا۔ اس میں معاشرتی صورت حال کی سنگینی، اقدار کی پامالی اور سیاست کی بازیگری پر فوکس کیا گیا ہے۔ پونم شرما لکھتی ہے کہ پروفیسر صادق نے ان صداقتوں کو بڑی سادگی اور فنکارانہ اسلوب کے ساتھ نمایاں کیا ہے جو ہماری زندگی اور معاشرے کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ 'زندگی کا ذائقہ' نامی مجموعے پر کملیشور نے اپنا تاثر پیش کیا ہے کہ یہ صرف زندگی کا نہیں بلکہ پورے معاشرہ اور سیاست کا ذائقہ ہے۔ الغرض یہ مجموعہ، ہری شنکر پرسائی اور شرد جوشی فنکاروں کی روایت کو آگے بڑھاتا ہے۔

دوسرے حصے میں جن نثری تصانیف پر تحریریں شامل ہیں وہ بالترتیب یہ ہیں، مثلاً: 'ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ'۔ یہ ایک مفید تحریر ہے جس میں پروفیسر ارتضی کریم نے کتاب کے مالہ وماعلیہ پر بخوبی روشنی ڈالی ہے۔ 'ادب کے سروکار' یہ کتاب تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں مصنف نے اردو افسانہ کے تاریخی سفر کی نشاندہی معروضی انداز میں کی ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اسے ایک قابل تحسین کوشش قرار دیا ہے۔ 'چند مضامین' یہ 13 مضامین کا خوب صورت گلدستہ ہے۔ اس میں کچھ تحقیقی وتنقیدی ہیں اور کچھ شخصیات کا تعارف۔ وہاب عندلیب کی یہ تحریر 'چند مضامین' کا بہترین تعارف ہے۔ 'تنقیدی اور تحقیقی مضامین' یہ 23 مضامین کا مجموعہ ہے۔ 'مالوہ کی لوک کہانیاں' مظہر محمود کے بقول: مالوہ ایک خوب صورت اور زرخیز علاقہ ہے اسی علاقے کی کہانیوں کا یہ مجموعہ ہے جو نہایت سلیس و آسان زبان میں ہے اور بچوں اور بڑوں سبھوں کے لیے یکساں مفید ہے۔ 'اردو کی کال جئی کہانیاں' پروفیسر شاہینہ تبسم لکھتی ہیں کہ یہ اردو کے شاہکار افسانوں کا بہترین انتخاب اور عمدہ ترجمہ ہے۔ 'عظیم شاعر مرزا غالب' اس میں غالب کے بچپنے سے وفات تک کے حالات بطور اختصار بیان کیے گئے ہیں۔ 'عصمت ہر لائف ہر ٹائمس' یہ کتاب انگریزی زبان میں ہے اور عصمت چغتائی کے حیاتیاتی گوشوں پر مشتمل ہے۔ پروفیسر شاہینہ تبسم کے بموجب: مضامین کا انتخاب پروفیسر صادق اور افسانوں کا انتخاب سکریتا کمار پال نے کیا ہے۔ 'مثنوی چراغ دیر مع پانچ اردو تراجم' مذکورہ مثنوی کے پانچ اردو تراجم کو اس کتاب میں یکجا کیا گیا ہے۔ 'چراغ دیر' میں پروفیسر صادق نے غالب کی روح کو محسوس کیا اور مثنوی کے اشعار سے مترشح ہونے والے تاثرات کو قلمبند کر دیا۔ اس میں اس بات پر فوکس ہے کہ غالب کے اشعار میں موجود مرکزی تاثر، خیال، نفسیات اور احساس دردمندی سے لبریز اشعار کی نشاندہی کی جائے۔ نریندر موہن کی یہ ایک عمدہ اور معلوماتی تحریر ہے۔ 'نئی ہندی شاعری' یہ گیارہ نئے ہندی شعرا کا انتخاب ہے جنھوں نے ہمیشہ اپنے آس-پاس کے احوال کو موضوع سخن بنایا ہے۔

زیر نظر تحریر میں عتیق اللہ نے منتخب شعرا کا نام واضح نہیں کیا ہے، جب کہ ہونا چاہیے۔ 'کنیادان' یہ ایک مترجم ڈرامہ ہے جو وجے تینڈولکر کے مراٹھی ڈرامے سے مستفاد ہے۔ بقول پروفیسر صدیقی: ترجمہ پر تخلیق کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہ تحریر مختصر ہونے کے باوجود اصل ڈرامے کے ساتھ مذکورہ ترجمے کے خدوخال واضح کرتی ہے۔ 'اس شکل سے گزری غالب'، 'حیات غالب پر ایک شاہکار ڈرامہ'، 'ناٹک فریب ہستی' یہ تینوں سوانحی اور عمدہ ڈرامے ہیں۔ ان سب کے مکالمے جاندار ہیں۔ بالخصوص غالب اور ہمزاد کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے اس کی برجستگی، شگفتگی، بے تکلفی اور نوک جھونک غالب کے لہجے کی واقعی یاد دلاتا ہے۔ ان کتابوں پر بالترتیب ڈاکٹر فرحت نادر رضوی، محمد نوشاد عالم ندوی اور شہادت کتھا کار نے اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ 'کہیں نہیں وہیں' یہ مشہور شاعر اشوک واجپئی کی ہندی شاعری کا مجموعہ ہے۔ اس کا بھی ترجمہ پروفیسر صادق نے بڑی عمدگی سے کیا ہے۔

غرض یہ کہ زیر نظر کتاب میں شامل تحاریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض مضامین ایجاز واختصار کا نمونہ ہیں، تو بعض میں بالتفصیل گفتگو کی گئی ہے۔

یہ کتاب پروفیسر صادق کی شخصیت، علمیت، ادبیت اور تصانیف وتالیفات شناسی کا عمدہ ذریعہ ہے کہ اس میں احسن طریقے سے ان کی تصانیف وتالیفات کا مطالعہ وتعارف پیش کیا گیا ہے۔

انتخاب کلام حماد انجم ایڈوکیٹ

مرتب/ناشر: ڈاکٹر شمس کمال انجم

صفحات: 136 قیمت: 200 سنہ اشاعت: 2025

طباعت: روشان پرنٹرس دہلی-6

مبصر: شگفتہ، E12/51B حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی-17

کہتے ہیں ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے، اور ادب کے اس آئینے میں زندگی کی تلخ وشیریں سچائیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ ادب نثری بھی ہوسکتا ہے، اور شعری بھی۔ شعری ادب میں بہت سی اصناف معروف ہیں۔ زیر نظر کتاب انتخاب کلام حماد انجم ایڈوکیٹ مرحوم کی شاعری پر مبنی ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر شمس کمال انجم کے ذریعے انتخاب وترتیب دیا ہوا مجموعہ کلام ہے۔

ہم جب اچھی شاعری اور بامعنی شاعری کی بات کرتے ہیں تو بہت سے نام دماغ کی اسکرین پر ابھرنے لگتے ہیں، جن میں اصلاحی شاعری فرمانے والے بھی نظر آتے ہیں، اور مشاعروں کی دنیا کے کچھ معروف شاعر مگر پھر خیال آتا ہے کہ بعض خاموش مزاج شاعر ایسے بھی گزرے ہیں جن کی شاعری، شعر فہمی کا سلیقہ رکھنے والوں کو نہ صرف یہ کہ متوجہ کرتی ہے بلکہ مرعوب بھی کرتی ہے۔

اگلے وقتوں کے ایسے ہی چند میں سے ایک نام حماد انجم ایڈوکیٹ مرحوم کا بھی ہے آپ کی پیدائش 1956 اور وفات 2015 میں ہوئی۔ دیکھا جاتا ہے شاعری کا مقبول ہونا یا نہ ہونا یہ سب ایک وقت اور عمر رواں کے معینہ وقفہ تک ہی ہوتا ہے۔ شاعری میں جس تصور، خیال اور فکر کو شاعری کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے اسے حال سے ماضی میں بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔ حماد انجم ایڈوکیٹ کی شاعری آج بھی اپنی تازہ کاری کا احساس دلاتی ہے، دیکھیے مرحوم نے کس طرح کی شاعری کی ہے۔

ہم میں تم میں فرق بہت ہے تم صرصر ہم بادِ صبا
ہم نے شہر بسایا لیکن تم نے اسے ویران کیا
غزل میں واردات دل کی باتیں ہوتی ہیں انجم
مگر حالات رکھ دیتے ہیں کچھ شعلہ بیانی بھی

وقت کے ساتھ ساتھ بعض کی شاعری کو ناپسندیدہ بھی بنادیا جاتا ہے، مگر حماد انجم ایڈوکیٹ مرحوم کی کئی دہائیوں پہلے لکھی گئی شاعری آج بھی حالات حاضرہ کا بہترین نمونہ اور ترجمانی کہی جاسکتی ہے۔ حماد انجم ایڈوکیٹ کا جو لگاؤ تہذیبی و جمہوری قدروں کے تناظر میں اردو شعروادب سے تھا، وہ جگ ظاہر ہے، اپنی شاعری سے پیغام اخوت کو عام کیا ہے، یہی وہ ذوق ادب ہے جس کی ضرورت زندگی کے ہر پڑاؤ پر محسوس کی جاتی ہے۔ حرف انتخاب کے تحت مرتب ڈاکٹر شمس کمال انجم لکھتے ہیں'' کلام کے ذخیرے سے ہر اصناف میں کہے گئے کلام کو پڑھنا اور اس میں معیاری اور بہتر سے بہتر کلام کا انتخاب جوئے شیر لانے کے مترادف عمل تھا، لیکن پھر بھی میں بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖیهَا و مرساها کہہ کر دریائے سخن مین قدم رکھ دیا اور کلام کا انتخاب شروع کردیا، جو انتھک جدوجہد اور محنت کے بعد آپ کے سامنے ہے۔ انتخاب کلام صاحب انتخاب کے ذوق ومزاج پر منحصر ہوتا ہے، لیکن پھر بھی میں نے کوشش کی ہے کہ ایسے کلام کا انتخاب سامنے لایا جائے جو ہر اعتبار سے حماد صاحب کی شعری شخصیت کی تعین قدر میں مدد فرمائے۔''

جیسا کہ یہ مقولہ عام ہے کہ شاعری مطالعے، مشاہدے اور تجربے کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ وقت وعمر کے ساتھ ساتھ ذہن کی اکتسابی صلاحیتوں کے مطابق اس عمل میں تبدیلی بھی رونما ہوتی رہتی ہے، مجھے لگتا ہے ایسا ہی دوران حیات حماد انجم مرحوم کے ساتھ بھی ہوا ہے، اس کا اندازہ ان کی شعری کاوشات سے بخوبی ہوتا ہے۔

حماد انجم ایڈوکیٹ کی شاعری واقعی ایسی شاعری ہے جس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ ان کی اس شاعری سے راہ عمل کا کام بھی لیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ شعرفہمی کا ذوق ہو، بغیر اس کے یہ کام آسان ہی نہیں ناممکن ہے۔

انتخاب وترتیب دیکھنے کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ زندگی کے ہر رنگ پر حماد انجم ایڈوکیٹ کی گہری نظر تھی، یقیناً زندگی کے ہر محاذ پر اپنی صلاحیت ولیاقت کا لوہا منوانے کا کام انتخاب کلام حماد انجم ایڈوکیٹ کرے گا۔ اشعار کی روشنی بتاتی ہے کہ حماد انجم ایڈوکیٹ مرحوم نے شاعری کا رچا بسا ذوق پایا تھا۔

باری تعالیٰ سے منسوب محامد اور شفیع المذنبین کے لیے نعتیں تحفہ کے طور پیش کی ہیں۔ آپ کی غزلوں، نظموں میں غنائیت بھی ہے اور آبشار جیسی روانی بھی۔ شاعری کی دیگر اصناف میں گیت، ترانہ، قطعات، رباعیات، ہائیکو، ماہیا، ثلاثی، دوہے، بیت، ترائیلے اور کہنگی کا انتخاب بھی کتاب میں شامل ہے۔ کتاب دیکھ کر اندازہ ہوگا کہ مرتب کے ذریعے کوزہ میں دریا سمونے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس کے لیے انھیں مبارکباد۔

ڈاکٹر شمس کمال انجم نے اپنے علمی وفنی کمال سے ایسا منتخب کلام اہل شوق شاعری کو دیا ہے، جس کے تعلق سے مجھے یقین ہے جو بھی مستبصر ہیں وہ اس کتاب سے ضرور فیضیاب ہوں گے۔

مجھے امید ہے ڈاکٹر شمس کمال انجم کو اس محنت کا صلہ انتخاب کلام کی پذیرائی کی صورت میں ملے گا، کیونکہ گلہائے رنگارنگ اس انتخاب کا حصہ ہیں، سنجیدہ وتعمیری نیز معیاری شعری ادب کا مطالعہ کرنے والے اس انتخاب کو سراہیں گے۔

التفات و اعتراف

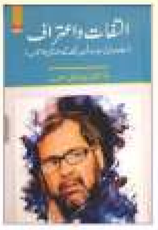

مرتب: ڈاکٹر اوبناش امن
صفحات: 336، قیمت: 400،
ناشر: دربھنگہ ٹائمز پبلی کیشنز، بہار
مبصر: ڈاکٹر خان محمد رضوان، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔ 25

ڈاکٹر اوبناش امن کی کتاب 'التفات و اعتراف' ایک علمی اور ادبی محنت کا نمونہ بیش بہا ہے۔ جس میں انھوں نے ڈاکٹر عطا عابدی کی حیات وفن پر مختلف النوع علمی و معلوماتی مضامین کو یکجا کرکے ایک خوبصورت انتخاب کی صورت میں شائع کیا ہے۔ اس میں شامل گراں قدر مضامین سے نہ صرف عطا عابدی کی شخصیت وتخلیقات پر روشنی پڑتی ہے بلکہ اس میں ان کے فن کی تفصیلات اور ان کے ادبی کردار وافکار کی گہرائی و گیرائی کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ جو کہ بڑی اہم بات ہے، یہ غیر معمولی قدردانی کا بہترین علمی خزینہ ہے۔

عطا عابدی کے فن پر شامل مضامین کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ادبی شخصیت کس قدر کمالات کا مجموعہ ہے، ان مضامین سے ہمیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک منفرد اور جدید فکر کے حامل شاعر اور ادیب ہیں۔ ڈاکٹر اوبناش امن نے ان مضامین کے ذریعے عطا عابدی کی شعری، صحافتی، تنقیدی اور تحقیقی اہمیت کو اجاگر کیا ہے بلکہ ان کی فکری جہتوں کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں عطا عابدی کے مختلف پہلوؤں کو بڑی مہارت اور خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے، چاہے وہ ان کی شاعری کا علمی تجزیہ ہو یا ان کے معاشرتی نقطہ نظر کا مطالعہ اور صحافتی خدمات کا جائزہ ہو اس میں ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ڈاکٹر اوبناش امن نے عطا عابدی پر انہی مضامین کو شامل کیا ہے جن میں ان کی شخصی خوبیوں، شعری ونثری صلاحیتوں اور صحافتی ذمے داریوں کے حوالے سے قابل اعتبار تحریر ہو، جس کو پڑھ کر ان کی شخصیت کی گوناگوں خوبیوں کا بہ آسانی احاطہ ممکن ہوسکتا ہے۔

'التفات و اعتراف' چار حصوں پر مشتمل ہے۔ جس کا پہلا حصہ: نقوش وکوائف کے عنوان سے ہے۔ جس میں عطا عابدی: شخص وشاعر کے عنوان سے ناوک حمزہ پوری کا مضمون ہے۔ عبدالرزاق رحمانی کا مضمون عطا عابدی: ایک مختصر تعارف کے عنوان سے ہے۔ سید محسن رضا رضوی کا مضمون عطا عابدی کی تلاش کے موضوع پر ہے۔ تمنا مظفرپوری کا مضمون اخلاق واخلاص کا مرقع: عطا عابدی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر عبدالمنان طرزی کا مضمون عطا عابدی شامل ہے۔ چونکہ یہ سارے مضامین عرق ریزی کے بعد منتخب کیے گئے ہیں اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ یہ مضامین معیاری، معلوماتی، دلچسپ، خوبصورت، دلکش اور مستند ہیں۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب ادب سے دلچسپی رکھنے والے قاری اور شخصی کتابوں کے عادی قارئین کے لیے نہایت سودمند اور مفید ہے۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ شعر وشناخت کے عنوان سے ہے جس میں انتیس مضامین شامل ہیں۔ جس میں مرحومین کے مضامین کا تذکرہ چھوڑ دیا جائے تو فاروق ارگلی، ڈاکٹر محبوب راہی، پروفیسر علیم اللہ حالی، کوثر مظہری، ڈاکٹر مشتاق احمد، مبین صدیقی، آفاق عالم صدیقی، ڈاکٹر انور ایرج، سلیم انصاری، ڈاکٹر شمشاد فاطمہ، منصور خوشتر،

ڈاکٹر احسان عالم، بدر محمدی، وارث ریاض، خالد عبادی، محمد بدیع الزماں، اظہر نیر، ایم اے سمشی، سہیل انجم اور سید خورشید عالم کا کوئی قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر اویناش امن نے اس کتاب کے ذریعے عطا عابدی کے فن کو جدید تنقیدی نظریے کے حوالے سے تجزیاتی نقطہ نظر سے پیش کیا ہے، جس سے یہ کتاب ادبی حلقوں میں ایک اہم اضافے کے طور پر سامنے آئی ہے۔ اس حصے میں شامل مضامین جن کا تعلق شعری حوالے سے ہے بے حد اہم ہیں، اسی طرح جو مضامین ان کے مجموعہ کلام کے حوالے سے لکھے گئے ہیں وہ بھی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔

کتاب کا تیسرا حصہ عطا عابدی کی صحافت اور تنقید وتحقیق کے حوالے سے ہے جس میں بارہ اہم مضامین شامل ہیں۔ جن میں ڈاکٹر سید احمد قادری، ظفر انور شکر پوری، ثناء اللہ دوگھروی، توصیف احمد، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، پروفیسر محفوظ الحسن، ڈاکٹر نسیم اختر، ڈاکٹر محمد ذاکر حسین، سید غلام ربانی ایاز، انوار الحسن فرد اور اویناش امن لائق مطالعہ ہیں۔

کتاب کا چوتھا حصہ ادب اطفال کے عنوان سے ہے، اس باب میں سات مضامین شامل ہیں۔ جن میں عطا عابدی بچوں کے ادب کے قدر شناس: ڈاکٹر حافظ کرناٹکی، عطا عابدی بحیثیت بچوں کے ادیب: ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، خوشبو خوشبو نظمیں اپنی: ڈاکٹر بسمل عارفی، مناظرے مذکر ومؤنث: ڈاکٹر قیصر زاہدی، مناظر مذکر مؤنث کے: ڈاکٹر خالدہ خاتون، مناظرے مذکر مؤنث کے اور خوشبو خوشبو نظمیں اپنی: سید رحمانی اور خان محمد رضوان کا مضمون عطا عابدی: ادب اطفال کا نمائندہ تخلیق کار قابل مطالعہ ہیں۔

ڈاکٹر اویناش امن کی یہ کتاب نہ صرف عطا عابدی کی شاعری کو سمجھنے کا ایک اچھا ذریعہ ہے بلکہ ادب کے شائقین کے لیے ایک قیمتی اثاثہ بھی ہے۔ انھوں نے مبسوط مقدمہ لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ ایک شاعر کی شاعری کو سمجھنے کے لیے اس کی شخصیت، فکری رجحانات اور زندگی کے تجربات کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔ نیز انھوں نے اس کتاب کے ذریعے نہ صرف عطا عابدی کی شاعری کو سمجھنے کا ایک نیا زاویہ فراہم کیا ہے، بلکہ ادب کے شعبے میں ایک گرانقدر علمی اضافے کے طور پر بھی اسے معرض وجود میں لایا ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ مرتب نے حق شاگردی ادا کرنے کے ساتھ اپنے استاذ کی تنقیدی بصیرت، تحقیقی دائرۂ فکر، تنقیدی نظریے اور ادب اطفال کے حوالے سے دستاویزی کتاب ترتیب دے کر مثالی کارنامہ انجام دیا ہے۔

شخصیات

یادوں کے چراغ

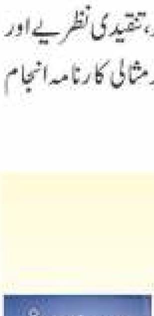

مصنف: اکبر رضا جمشید

صفحات: 136، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: اکبر رضا جمشید اردو ادب ایوارڈ کمیٹی، پٹنہ

مبصر: ڈاکٹر محمد مظاہر الحق

شاہین منزل، نوگھروا، سلطان گنج، پٹنہ-800006

اکبر رضا جمشید نے کم وبیش 29 سال قانون کی تشریح کی اور 2004 میں ضلع جج کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔ آپ کئی دہائیوں سے اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ کی تادم تحریر پندرہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'یادوں کے چراغ' میں اکبر رضا جمشید نے سماج کی چیدہ چیدہ شخصیات کی زندگی کے واقعات پر روشنی ڈالی ہے جنھوں نے سماج اور ملک کی ترقی میں اپنے حصے کا چراغ روشن کیا۔ اکبر رضا جمشید کا تعلق چونکہ قانون کی دنیا سے ہے لہٰذا اس کتاب میں زیادہ تر ایسی شخصیات کا ذکر ہے جنھوں نے قانون کی دنیا میں اپنا نام روشن کیا۔ مثلاً جسٹس آفتاب عالم، جسٹس نند لال اونٹوالیہ، جسٹس للت موہن شرما، تینوں حضرات کا تعلق سپریم کورٹ سے ہے۔ جسٹس سید سرور علی، جسٹس علی احمد، جسٹس سید نیر حسین اور جسٹس اقبال احمد انصاری نے اپنی خدمات پٹنہ ہائی کورٹ میں انجام دیں۔ سول لا کے اکسپرٹ ایڈوکیٹ سید شاہ اصغر حسین کا ذکر بھی اس کتاب میں محفوظ ہو گیا ہے۔ مذکورہ شخصیات کے بعد یونس سلیم اور محمد شفیع قریشی کا ذکر ہے۔ جنھیں بہار کا گورنر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

تجمیل مظہری خدا کی مخلوق کی مدد خاموشی کے ساتھ تو کیا ہی کرتے تھے مگر ان کا دل خوف خدا سے کس قدر لبریز تھا اس کا علم اکبر رضا جمشید کی تحریر سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''ایک دن کی بات ہے کہ میں شام کے وقت اپنے گھر سے ان کے کمرے میں چائے لے کر گیا۔ دیکھا کہ وہ رو رہے ہیں اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہا ہے۔ میں نے سمجھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بری خبر ان کے بھائی بھتیجے یا بہن بھانجے کی طرف سے آئی ہے۔ میری ہمت نہیں ہوئی کہ ان سے کچھ پوچھتا۔ میں چائے رکھ کر والد صاحب کے پاس گیا اور انھیں اطلاع دی۔ والد صاحب نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس وقت وہ اللہ کو یاد کر رہے ہیں اور نماز پڑھ رہے ہیں۔ نماز پڑھتے وقت وہ رونے لگتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتا ہے۔'' (ص14)

سید شاہ اصغر حسین کا شمار نامور وکیلوں میں ہوتا ہے۔ بحیثیت انسان بھی آپ اعلیٰ اخلاق کے حامل تھے۔ دوسروں کے عیب پر پردہ ڈالنے میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اکبر رضا جمشید کے اصل الفاظ ملاحظہ ہوں:

''ایک کیس میں میں نے Affidavit ڈرافٹ کیا اور اسے بغیر انھیں دکھائے فائل کر دیا۔ اس افیڈیوٹ میں کچھ خامیاں تھیں جسے جج صاحب نے پکڑا اور اصغر صاحب سے کہا کہ دیکھیے آپ کے جونیئر نے کیسی غلطی کی ہے۔ اصغر صاحب نے افیڈیوٹ پڑھنے کے بعد جج صاحب سے کہا کہ یہ غلطی مجھ سے ہوئی ہے۔ جونیئر سے نہیں۔ اسے درست کر کے فائل کرتا ہوں۔ عدالت کے کمرے سے باہر نکلنے کے بعد میں نے اصغر صاحب سے کہا کہ یہ غلطی تو میں نے کی تھی اس کا الزام آپ نے اپنے سر کیوں لے لیا۔ اصغر صاحب مسکرائے اور کہا کہ میں سینئر وکیل ہوں اور میرا Reputation اچھا ہے۔ آپ جونیئر ہیں... آپ کا مستقبل بگڑ جائے گا۔'' (ص15)

'یادوں کے چراغ' کے مطالعہ سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ مصنف کے والد بزرگوار سید علی جوادؒ خدا اور اس کی مخلوق سے جہاں بے انتہا محبت کرتے تھے وہیں رجحانات کی پاسداری میں پیش پیش بھی رہتے تھے۔ عید بقرعید اور شادی بیاہ کے موقع پر یتیموں کو کھانا کھلانا بھولتے نہیں تھے۔

اکبر رضا جمشید کے اصل الفاظ ملاحظہ ہوں:

’’میرے والد صاحب یتیموں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ عید بقرعید اور شادی بیاہ کے موقع پر یتیم بچوں کو یتیم خانہ سے بلوا کر ان کی ضیافت کرتے تھے۔‘‘

(ایضاً، ص 102)

مختصر یہ کہ ’یادوں کے چراغ‘ ایک معلوماتی کتاب ہے۔ مصنف کا انداز بیان اس قدر دلچسپ ہے کہ قاری دوران مطالعہ اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ اس کتاب میں جتنے واقعات درج کیے گئے ہیں وہ فرسٹ انفارمیشن کا درجہ رکھتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اکبر رضا جمشید نے مذکورہ کتاب میں شامل حضرات کو ادب کی دنیا میں امر کر دیا تو غلط نہ ہوگا۔

ادب اطفال

سپنوں کا گھر

مصنف: عادل حیات

صفحات: 63، قیمت: 50 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: سفیر صدیقی

مکان B-561، گلی نمبر 22، ذاکر نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔25

ڈاکٹر عادل حیات کا شمار ایسے ادیبوں میں ہوتا ہے، جن کا قلم کئی طرح کی روشنائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ آپ کی تخلیقی نگارشات میں شاعری کے ساتھ ساتھ ادب اطفال بھی نہایت نمایاں ہے۔

زیر نظر کتاب ’سپنوں کا گھر‘ بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ’چڑیا نگری‘ اور ’راجا کی جیت‘ کے نام سے دو مجموعے بالترتیب 2003 اور 2005 میں شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکے ہیں۔ یہ مجموعہ ’سپنوں کا گھر‘ آٹھ کہانیوں پر مشتمل ہے اور ہر ایک کہانی اس مقصد کے عین مطابق ہے جس کا ذکر خود صاحب کتاب نے پیش لفظ میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’ادیب بچوں کی نفسیات، ان کے مزاج، جبلی ضروریات اور معاشرے کی روش و رفتار کو ذہن میں رکھ کر ایسا ادب تخلیق کرتا ہے، جو بچوں کی دلچسپی کے مطابق ہو اور زندگی کے پیچیدہ معاملات سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کا ذریعہ بنے۔ ایک اچھا ادب بچوں کے اندر جرأتِ افکار، ہمت و حوصلہ، نظم و ضبط، سماجی شعور اور قومی و ملی جذبے کے علاوہ اخوت اور کسر نفسی کی صفات پیدا کرتا ہے۔‘‘

یہ اقتباس اس مجموعے میں شامل تمام کہانیوں کی بنیاد کو محیط ہے۔ اس کتاب میں شامل پہلی کہانی کا عنوان ’بڑھیا کا پچھتاوا‘ ہے۔ یہ کہانی بچوں کے سامنے اللہ کے نبیؐ پر کوڑا پھینکنے والی بڑھیا کے واقعے کو بڑے ہی دلچسپ اور موثر انداز میں پیش کرتی ہے۔

دوسری کہانی ’سپنوں کا گھر‘ میں بنیادی طور پر بہ ظاہر پرکشش، لیکن بہ باطن پرفریب دنیاوی آسائش کو موضوع بنایا گیا ہے، جس میں ایک ننھی چڑیا اپنے سپنوں کے گھر کی شدید خواہش میں اندھی ہو کر ایک پنجرے میں قید ہو جاتی ہے۔

تیسری کہانی ’چائے کی دکان‘ بچوں میں حرکت و عمل اور احساس ذمے داری پیدا کرنے کے مقصد کو پورا کرتی ہے۔ ساتھ ہی بچوں میں انسانی ہمدردی، سخاوت اور جذبہ تعاون کو بھی بیدار کرتی ہے۔

چوتھی کہانی ’ایک سے بھلے دو‘ اخوت و محبت اور اتحاد و یگانگت کی ضرورت و اہمیت کو بہت ہی دلچسپ اور بہترین انداز میں بچوں کے ذہن میں نقش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

پانچویں کہانی ’چودھری کا کا‘ بنیادی طور پر تعلیم اور خاص کر تعلیم نسواں کی اہمیت کو بخوبی اجاگر کرتی ہے اور تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے لوگوں اور اپنے علاقے کے تئیں احساسِ ذمہ داری بھی پیدا کرتی ہے۔

چھٹی کہانی ’قاعدے قانون‘ میرے خیال میں اس مجموعے کی سب سے بہترین کہانی ہے۔ یہ کہانی بچوں کی تربیت کے لیے والدین کی جانب سے کی جانے والی کچھ سختیوں اور پابندیوں پر بچوں کے غصے کو موضوع بناتے ہوئے نہایت خوبی سے بچوں کو والدین کے اس بہ ظاہر تلخ لیکن بہ باطن شیریں اور دور رس نتائج دینے والے رویے کی اہمیت و افادیت کا احساس دلانے میں کامیاب ہے۔ اس کتاب کی آٹھویں اور آخری کہانی ’موبائل فون‘ اس جدید آلے کے حوالے سے بچوں کو بنیادی معلومات فراہم کرنے کے ساتھ اس کے فوائد اور نقصانات کو نہایت دلچسپ انداز میں پیش کرتی ہے۔

عادل حیات بچوں کے بہترین نبض شناس ہیں، کیونکہ انھوں نے بچوں کی تربیت کے لیے انتھک کوششیں کی ہیں اور انھیں تخلیقِ ادب اطفال کی تحریک اپنے بچوں سے ہی ملی ہے۔ اس مجموعے کے حوالے سے بھی انھوں نے پیش لفظ میں صاف کر دیا ہے کہ ان کہانیوں کے پہلے قاری ان کے بچے ہیں اور ان کی پسندیدگی کے بعد ہی انھوں نے یہ کہانیاں شائع کی ہیں۔ یہ کہانیاں اسی لیے اور بہتر طور پر سامنے آتی ہیں کہ اشاعت سے قبل یہ تخلیق کار کی ناقدانہ نظر کے ساتھ ساتھ خود ان کے قارئین یعنی بچوں کی نظر سے بھی گزر چکی ہیں۔

فنی طور پر یہ کہانیاں ادب اطفال کی بنیادی ضروریات اور مقاصد کے عین مطابق ہیں۔ انداز بیان دلچسپ اور اسلوب دل پذیر ہے۔ کہانیوں کی ساخت اور بنت ادب اطفال کی فنی باریکیوں کا بہترین نمونہ ہے۔ کہانیوں میں آصف انجم کے اسکیچز بہت ہی عمدہ اور مناسب معلوم ہوتے ہیں، جو کہانیوں کی پیش کش کو اور بھی پر اثر بنا دیتے ہیں۔ جہاں تک زبان و بیان کی بات ہے، تو وہ اکثر و بیشتر بچوں کے ذہن کے مطابق ہے۔ چھوٹے چھوٹے آسان، رواں اور پر اثر جملے ہیں۔ بیان میں ایسی پیچیدگی نہیں جس سے بچوں کا ذہن بوجھل ہو۔ تاہم کہیں کہیں کچھ مشکل جملے اور الفاظ بھی در آئے ہیں۔ اگر کچھ مشکل الفاظ کی ایک فہرست بھی ہر کہانی کے آخر میں شامل کر دی جاتی تو کتاب کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

مجموعی طور پر یہ کتاب ادبِ اطفال کے سرمایے میں ایک بہترین اضافہ ہے اور خاص کر آج جب ٹیلی ویژن اور موبائل فون کا ضرورت سے زیادہ استعمال نہ صرف بچوں کی اچھی تربیت کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہے بلکہ ان کی جسمانی صحت کو بھی نقصان پہنچا رہا ہے، ادب اطفال کی ضرورت و اہمیت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور اس طرح کی کتابوں کی افادیت مزید مستحکم ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر عادل حیات مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ اس مشکل کام کو بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

■

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے خبر نامہ میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی و ثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔

یہ خبر نامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

کتاب کلچر کے فروغ کے ساتھ کاپی رائٹ کے مسائل کو حل کرنا بھی ضروری: ڈاکٹر شمس اقبال

عالمی یوم کتاب اور کاپی رائٹ کے موقعے پر قومی اردو کونسل کے زیراہتمام یک روزہ بک کنکلیو کا اہتمام

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے زیراہتمام 23 اپریل 2025 کو عالمی یوم کتاب اور کاپی رائٹ کے موقعے پر یک روزہ بک کنکلیو کا انعقاد ہوا جس کے تحت تین اجلاس ہوئے۔ پہلے اجلاس کا عنوان 'مصنوعی ذہانت کے دور میں کاپی

رائٹ کے چیلنجز' تھا جس کی صدارت پروفیسر محمد افشار عالم وائس چانسلر جامعہ ہمدرد نے کی۔ تعارفی اور استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ قاری، مصنف اور ناشر کی تثلیث سے ایک کتاب کی تشکیل ہوتی ہے۔ کتاب سے ایک انٹیلکچول ڈسکورس قائم کیا جاسکتا ہے۔ کتاب کے ذریعے ہی ہم ایک مہذب سماج کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ تحریر و تخلیق کی مثال بچے کی ہے، جو اس کے مصنف کی ملکیت ہوتی ہے، اے آئی یا کسی بھی ذریعے سے کسی کی کتاب یا تخلیق کو اپنے نام سے شائع کروانا گویا کسی کے بچے کو کڈنیپ کرنے جیسا ہے۔ پروفیسر محمد افشار عالم نے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ کاپی رائٹ آج کے عہد کا ایک بہت گمبھیر مسئلہ ہے اور اس کے تعلق سے حکومت کے ساتھ ساتھ بہت سے تعلیمی ادارے بھی حساس ہوگئے ہیں اور اس حوالے سے اقدامات بھی کررہے ہیں۔ قومی اردو کونسل کا یہ پروگرام اس حوالے سے ایک یادگار قدم ہے۔ وانی پرکاشن گروپ، نئی دہلی کی سی ای او محترمہ ادیتی مہیشوری نے کہا کہ اے آئی کے دور میں کاپی رائٹ کے مسائل بہت بڑھ گئے ہیں، موجودہ دور میں جب کہ اے آئی اپنے عروج پر ہے ایک نئے ترمیم شدہ کاپی رائٹ قانون کی ضرورت ہے۔ انٹلکچول پراپرٹی رائٹس کی مشہور وکیل محترمہ دہلیا سین اوبرائے نے اپنی تقریر میں کاپی رائٹ کے مختلف پہلوؤں اور مصنوعی ذہانت کے دور میں اس کے چیلنجز پر مربوط اور مبسوط گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ کاپی رائٹ کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ قانونی اور عدالتی چارہ جوئی بھی کی جاسکتی ہے، کیونکہ کاپی رائٹ کی خلاف ورزی دراصل کسی کی محنت پر شب خون مارنے اور دوسرے کی ملکیت پر غاصبانہ قبضہ کرنے جیسا ہے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شاداب شمیم نے انجام دیے۔ اجلاس کے آغاز سے قبل دو منٹ کی خاموشی کے ذریعے پہلگام دہشت گردانہ واقعے کے شہدا کو خراج عقیدت پیش کیا گیا اور اس روح فرسا واقعہ کی مذمت کی گئی۔

دوسرے اجلاس میں 'پریم چند: مطالعے کی نئی جہتیں' نامی کتاب کا اجرا ہوا۔ یہ کتاب ہندی کے معروف دانشور ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا نے تصنیف کی ہے، جس کا

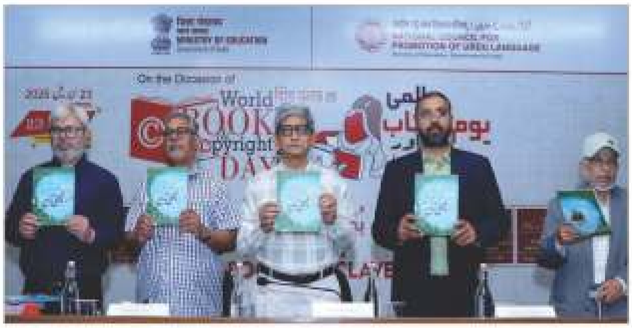

ترجمہ جناب محمد صغیر حسین نے کیا ہے۔ اس تقریب کی صدارت جناب اے رحمان نے کی۔ انھوں نے صدارتی تقریر میں مختلف زبانوں سے کیے جانے والے اردو ترجمے کو درپیش چیلنجز پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ترجمے کی زبان مترجم کی علاقائی وابستگی وغیرہ کی وجہ سے بدل جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند پر لکھی گئی اس کتاب میں ان کی زندگی، شخصیت اور تخلیقات کے حوالے سے بہت اہم معلومات ملتی ہیں، اس اعتبار سے یہ کتاب منفرد قرار دی جاسکتی ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر محمد کاظم، پروفیسر شاہینہ تبسم اور کتاب کے مترجم محمد صغیر حسین نے بھی کتاب کے تعلق سے اظہارِ خیال کیا۔ پروفیسر صغیر افراہیم مہمانِ اعزازی کے طور پر شریک ہوئے۔ انھوں نے مذکورہ کتاب اور پریم چند کے حوالے سے بہت سے اہم نکات کی نشان دہی کی۔ نایاب حسن نے اس پروگرام کی نظامت کی۔

تیسرے اجلاس کا موضوع 'نئی نسل میں سائنسی مزاج کا فروغ' تھا جس کی صدارت ڈاکٹر محمد اسلم پرویز (سابق وائس چانسلر مانو، حیدرآباد) نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ علم کا اصل مفہوم ہی سائنس ہے اور ہم سائنسی مزاج اپنائے بغیر انفرادی واجتماعی ترقی حاصل نہیں کرسکتے۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں سائنسی مواد کی تیاری اور زیادہ سے زیادہ اشاعت موجودہ دور کی اہم ضرورت ہے۔ ڈاکٹر ماجد احمد تالی کوٹی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ سائنسی مواد کے ترجمے واشاعت کے حوالے سے قومی اردو کونسل لائق تحسین خدمات انجام دے رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم کے ساتھ زندگی کے دوسرے تمام شعبوں میں ہمیں سائنسی اپروچ اختیار کرنا چاہیے۔ اس اجلاس میں ماہر امراض چشم ڈاکٹر عبدالمعز شمس نے اظہار خیال کیا۔ نظامت ڈاکٹر عبدالباری نے کی۔ اس اجلاس میں قومی اردو کونسل سے شائع شدہ بچوں کی کتابیں انسانی دماغ، بھوجی نہیں بوجی، مچھلی کے بچے، خزانوں کی تلاش اور عریش کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 23 اپریل 2025

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

غالب اور بیدل

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام غالب توسیعی خطبہ بعنوان 'غالب اور بیدل' منعقد ہوا۔ کناڈا سے تشریف لائے ڈاکٹر سید تقی عابدی نے خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب کی شاعری پر بیدل کے اثرات صاف محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ انھیں بیدل کی

پیروی پر فخر تھا۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ میں غالب سے متعلق پروگرام ہوتے رہتے ہیں لیکن وہ موضوعات جو غالب فہمی کی راہ ہموار کرتے ہیں ان پر بھی ہم پوری توجہ صرف کرتے ہیں۔ اس خطبے کی صدارت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر سید عین الحسن نے کی۔ انھوں نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ ہمیشہ اپنے لیے بہت اہم موضوعات کا انتخاب کرتا ہے، آج کا موضوع بھی بہت اہم ہے کیونکہ بیدل کو سمجھے بغیر غالب فہمی کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ غالب اور بیدل میں کئی باتیں مشترک ہیں، مثلاً دونوں ترک دونوں ماوراء النہری، دونوں کم سنی میں یتیم ہوئے اور دونوں کو باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ بیدل اور غالب ایک اہم موضوع ہے اور اس موضوع پر غالب انسٹی ٹیوٹ پروفیسر احسن الظفر کی ضخیم کتاب بھی شائع کرچکا ہے لیکن اب بھی بہت سے تشنہ گوشے موجود ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 مئی 2025

جامعہ ہمدرد میں نایاب اور قیمتی مخطوطات کا ڈیجیٹلائزیشن

نئی دھلی: جامعہ ہمدرد نے اپنے چانسلر حماد احمد کی سرپرستی میں ایک اہم علمی منصوبے کا آغاز کیا ہے جس

کا مقصد جامعہ کی نایاب اور قیمتی مخطوطات کو ڈیجیٹل شکل میں محفوظ کرنا اور دنیا بھر کے محققین کو ان تک رسائی فراہم کرنا ہے۔ اس منصوبے کے تحت جامعہ کی مرکزی لائبریری میں موجود تقریباً 3800 نایاب مخطوطات کو جدید تکنیکی سہولیات کے ذریعے ڈیجیٹائز کیا گیا، جس میں دبئی، متحدہ عرب امارات کے معروف ثقافتی ادارے، جمعہ الماجد مرکز برائے ثقافت و ورثہ، کا تعاون حاصل ہوگا۔ منصوبے کے تحت ہر مخطوطے کو نہایت باریکی سے اسکین کرکے مکمل میٹا ڈیٹا کے ساتھ کیٹلاگ کیا جائے گا تاکہ محققین آسانی سے مواد تلاش کرسکیں۔ ایک جامع تفصیلی کیٹلاگ، منتخب نمونہ صفحات کے ساتھ، اوپن ایکسس پلیٹ فارم پر دستیاب ہوگی تاکہ دنیا بھر کے اسکالرز اپنی تحقیق کے لیے موزوں مواد تک بآسانی رسائی حاصل کرسکیں۔ جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر پروفیسر (ڈاکٹر) ایم افشار عالم نے اس موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ منصوبہ نہ صرف ہمارے علمی ورثے کے تحفظ کی جانب ایک اہم قدم ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے ہماری ثقافتی شناخت کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ بھی ہے۔ جمعہ الماجد مرکز کی نمائندگی کرتے ہوئے ڈاکٹر عزالدین بن زغیبا نے جامعہ ہمدرد کے ساتھ مفاہمتی یادداشت (ایم او یو) پر دستخط کو خوش آئند قرار دیا۔ انھوں نے بتایا کہ یہ اشتراک صرف ڈیجیٹائزیشن تک محدود نہیں بلکہ علمی وسائل جیسے کتابیں، رسائل، اشتہارات، تربیتی پروگرام، کانفرنسیں اور دیگر علمی سرگرمیوں کا تبادلہ بھی شامل ہے۔ جامعہ ہمدرد کے رجسٹرار (قائم مقام) ڈاکٹر سرفراز احسن نے جمعہ الماجد مرکز کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس اشتراک کو جامعہ کی علمی ترقی کے سفر میں ایک قیمتی سنگ میل قرار دیا۔ جامعہ کے لائبریرین ڈاکٹر اختر پرویز نے بتایا کہ مخطوطات ڈیجیٹائزیشن سیل مکمل طور پر فعال ہے اور ماہر عملے کے ساتھ منصوبے کو کامیابی سے مکمل کرنے کے لیے تیار ہے۔ ان کے مطابق یہ عمل 2026 کے اوائل تک مکمل ہوجائے گا، جس کے بعد یہ نایاب ذخیرہ دنیا بھر کے محققین کے لیے آن لائن دستیاب ہوگا۔ یہ منصوبہ جامعہ ہمدرد کی تحقیق، علمی اشتراک اور ثقافتی ورثے کے تحفظ کے مشن کی ایک روشن مثال ہے، جو علمی دنیا میں اس کے مقام کو مزید بلند کرے گا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 10 اپریل 2025

سہ روزہ اردو فیسٹول

نئی دھلی: سینٹ اسٹیفنز کالج کی اردو سوسائٹی بزم ادب کے زیر اہتمام سہ روزہ اردو فیسٹول 'کہکشاں' کا انعقاد کیا گیا۔ فیسٹول کے پہلے دن شعبۂ اردو و فارسی کے صدر ڈاکٹر شمیم احمد نے لیکچر دیا، جس میں بڑی تعداد

میں کالج کے طلبہ و طالبات نے شرکت کی اور اپنے سوالات کے ذریعے اس نشست میں حصہ لیا۔ فیسٹول کے دوسرے دن سالانہ انٹرکالج غزل سرائی مقابلہ برائے غالب رنگ ٹرافی و بیت بازی کا اہتمام کیا گیا۔ غزل سرائی مقابلے میں شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ہارون رشید کو اوّل اور اسی شعبے کی تابینہ کو دوسرے مقابلہ کا حقدار مانا گیا۔ دونوں کی مجموعی کارکردگی کی بنا پر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ٹرافی سے نوازا گیا۔ انفرادی انعامات میں تیسرا انعام سینٹ اسٹیفنز کالج کے محمد یوسف کو ملا۔ دیال سنگھ کالج کے عقیل حسین اور ماتا سندری کالج کی نغمہ علی کو حوصلہ افزائی انعامات سے نوازا گیا۔ بیت بازی میں شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عمر فاروق، فردوس رضا اور تابینہ شبیر پر مشتمل ٹیم اوّل، سینٹ اسٹیفنز کالج کی علمہ شمیم، تسنیم ناز اور ہرش وردھن پر مشتمل ٹیم دوم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ فیکلٹی آف ایجوکیشن کی سلمان احمد، عابدہ پروین، امان اللہ اور عظمیٰ پر مشتمل ٹیم تیسرے مقام پر رہی۔ جیوری ممبران کے طور پر دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ڈاکٹر علی احمد ادریسی اور شعبۂ عربی کے ڈاکٹر مجیب اختر نے جج کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر شمیم احمد نے بیت بازی اور لیش وردھن اور سمن اقبال نے غزل سرائی کی نظامت کی۔ دونوں پروگراموں کے انعقاد کے لیے مالی تعاون غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے فراہم کیا۔ فیسٹول کے تیسرے دن عید ملن کا انعقاد کیا۔ فیسٹول کے تینوں دن کتابوں کی نمائش و فروخت اور خطاطی کے اسٹال لگائے گئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 اپریل 2025

شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی میں خصوصی لیکچر

نئی دهلی: شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی، (ڈی یو) میں آئین ہند کی 75 ویں سالگرہ کے موقعے پر 16 اپریل کو ایک خصوصی لیکچر بعنوان 'آئین ہند: ہمارے حقوق و فرائض' منعقد ہوا جس میں معروف قانون داں ڈاکٹر نریندر نگروال نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ صدر شعبہ پروفیسر سید حسنین اختر نے افتتاحی کلمات میں آئین کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے طلبہ کو ان کے حقوق و فرائض سے واقف کرانے کی ضرورت پر زور دیا۔ ڈاکٹر نگروال نے اپنے خطاب میں آئین کی روح، جمہوری اقدار، سیکولرزم اور اقلیتوں کے تحفظ جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے اور جمہوریت کے لیے ضروری ہے کہ آزادی بھی ہو، بغیر آزادی کے جمہوریت ممکن نہیں ہے۔ اس سے قبل سابق صدر شعبہ پروفیسر نعیم الحسن نے ڈاکٹر نریندر نگروال کا تعارف پیش کیا اور کہا کہ ڈاکٹر نگروال قانون اور آئین ہند کے باب میں ایک نہایت معتبر نام ہے۔ پروگرام میں ڈاکٹر رنبیر سنگھ (آئی اے ایس) اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پروفیسر اسد ملک نے بھی شرکت کی اور آئینی شعور کی بیداری پر زور دیا۔ نظامت ڈاکٹر مجیب اختر اور شکریہ کی رسم ڈاکٹر محمد اکرم نے انجام دی۔ پروگرام میں شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبہ و طالبات اور اسکالرز موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اپریل 2025

ذاکر حسین دہلی کالج میں اردو و عربی شعبوں میں دو علمی تقریبات

نئی دهلی: دہلی یونیورسٹی کے ذاکر حسین دہلی کالج میں شعبۂ اردو اور شعبۂ عربی کے زیر اہتمام دو اہم علمی و تخلیقی پروگرام منعقد کیے گئے، جن میں طلبہ و طالبات کی بھرپور شرکت اور علمی جوش و خروش قابل دید رہا۔ شعبۂ اردو نے ریختہ فاؤنڈیشن کے اشتراک سے ایک غزل ورکشاپ کا انعقاد کیا جس میں معروف نوجوان شاعر مہندر کمار ثانی اور ادیبہ عاطفہ ہارون نے شرکت کی۔ ورکشاپ میں غزل کے فنی پہلوؤں، بحر، ردیف، قافیہ اور تقطیع جیسے موضوعات پر رہنمائی دی گئی۔ طلبہ نے دیے گئے مصرعے پر گرہیں لگا کر اپنی تخلیقی صاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ورکشاپ کی صدارت کالج کے پرنسپل پروفیسر نریندر سنگھ نے جب کہ نظامت ڈاکٹر محمد مستمر نے کی۔ وہیں شعبۂ عربی نے 'عربی زبان اور طبی سیاحت' کے موضوع پر ایک خصوصی لیکچر منعقد کیا جس میں مہمان مقرر ڈاکٹر محمد افضل صدیقی نے طبی سیاحت میں عربی زبان کے کردار پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ عربی زبان و ادب کے اسکالرز کے لیے یہ شعبہ ملازمت اور قومی خدمت کا بہترین میدان بن سکتا ہے۔ اس موقعے پر کالج اور مرلن میڈیکل اسسٹینس کے درمیان تربیتی معاہدے کی تجویز بھی پیش کی گئی۔ دونوں تقریبات میں متعدد اساتذہ، طلبہ و طلبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اپریل 2025

مصنف سے ملاقات

نئی دهلی: ساہتیہ اکیڈمی نے اپنے مشہور پروگرام 'مصنف سے ملاقات' کے تحت معروف انگریزی مصنف اور سابق سفارت کار نوتیج سرنہ کو مدعو کیا جہاں انھوں نے اپنے ادبی سفر اور تخلیقی تجربات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ یہ نشست انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں منعقد ہوئی، جس میں مختلف مصنفین، سفارت کار، پبلشرز اور صحافیوں نے شرکت کی۔ نوتیج سرنہ نے اپنی گفتگو کے دوران بتایا کہ ان کے سفر نے ان کے لکھنے کے عمل پر گہرا اثر ڈالا۔ انھوں نے کہا کہ ادب فرد کے ذاتی مزاج سے جنم لیتا ہے، لیکن اس کو لکھنے کا فن ہی اسے قابل مطالعہ اور اہم بناتا ہے۔ سرنہ نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کالج میگزین اور اخبارات میں لکھ کر کیا، اور بتایا کہ ان کا پہلا مضمون 1970 میں 'ہندوستان ٹائمز' کے ہفتہ وار ضمیمہ میں شائع ہوا تھا، جس میں انھوں نے کیفے ہاؤس کی ثقافت پر لکھا تھا۔ انھوں نے اپنے والدین اور ان کی کتابوں کا شکریہ ادا کیا، جو ہمیشہ ان کے گھر میں دستیاب رہتی تھیں۔ نوتیج سرنہ نے اپنی سفارتی خدمات کے دوران سیاست اور پالیسی سے ہٹ کر کہانیاں لکھنا شروع کیں، جس سے ان کا ادبی کام ان کی ذاتی زندگی سے مختلف رہا۔ انھوں نے اپنے مشہور ناول 'دی ایگزیل' پر بات کرتے ہوئے کہا کہ یہ ناول مہاراجہ دلیپ سنگھ کی زندگی پر مبنی ہے، جس کے لیے انھوں نے لاہور اور پیرس کے کئی سفر کیے۔ پروگرام کی ابتدا میں ساہتیہ اکیڈمی کے صدر مادھو کاشک نے نوتیج سرنہ اور مالاشری لال کا خیرمقدم کیا اور انھیں کتب اور شال پیش کی۔ اکیڈمی کے سکریٹری کے سرینواس راؤ نے خیرمقدمی خطاب پیش کیا۔ پروگرام کے اختتام پر نوتیج سرنہ نے حاضرین کے سوالات کا جواب دیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 اپریل 2025

'بزمِ تحقیق' کے زیر اہتمام خطبہ

نئی دهلی: مطالعات اسلامی میں بین المضامین تحقیق وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ریسرچ اسکالرز متعین شدہ موضوع کے لیے اصل ماخذ کی طرف رجوع کریں، نیز انھیں اس سلسلے میں متعلقہ ماہرین سے تبادلۂ خیال کرنا چاہیے تاکہ وہ تحقیق کے حقیقی نتائج کو حاصل کرسکیں۔ ان خیالات

کا اظہار پروفیسر ڈاکٹر محمد فہیم اختر نے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ میں 'بزمِ تحقیق' کی جانب سے منعقد پہلے خطبہ بہ عنوان 'مطالعاتِ اسلامی میں بین المضامین تحقیق کا طریقہ: ایک جائزہ' میں کیا۔ انھوں نے ریسرچ اسکالرز کو تحقیق کے اصولوں سے واقف کراتے ہوئے کہا کہ بنیادی طور پر تخلیق، تحقیق، تنقید، تدوین اور ترتیب میں فرق ہے، آپ کو ان اصطلاحات سے واقفیت ہونی چاہیے تاکہ آپ کی تحقیق ان اصولوں کے مطابق ہو۔ ڈاکٹر محمد خالد خان مشیر بزم تحقیق نے خطبۂ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ریسرچ اسکالرز کی 'بزم تحقیق' ابتدا سے ہی علمی وفکری اور تحقیقی سرگرمیوں میں نمایاں اور فعال رہی ہے۔ پروفیسر سید شاہد علی سابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹیڈیز نے پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ تحقیق دراصل تعبیر نو، توسیع، تصحیح اور تصدیق کا نام ہے اور سلوکِ تحقیق میں ایک اسکالر کو تین مراحل میں سب سے پہلے حیرت پھر علمی غرور اور اس کے بعد لاعلمی یا جہالت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، چنانچہ کامیاب اسکالر وہی ہے جو ان تمام مراحل کا سامنا کرسکے۔ پروگرام کی نظامت ملک محمود نے کی اور کلمات تشکر محمد ثاقب نے ادا کیے۔ اس پروگرام میں ریسرچ اسکالرز، ایم اے اور بی اے کے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 اپریل 2025

جگن ناتھ آزاد: شخصیت اور فن

نئی دہلی: جگن ناتھ آزاد احترام آدمیت کے علمبردار شاعر، دقیقہ سنج نقاد اور ہندو مسلم ہم آہنگی کے ترجمان تھے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار معروف دانشور اور معالج ڈاکٹر سید تقی عابدی نے دی پین فاؤنڈیشن اور شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد 'جگن ناتھ آزاد: شخصیت اور فن' میں اپنے کلیدی خطبے کے دوران کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم نے جگن ناتھ آزاد کی اقبال شناسی کو دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا، یہ ہماری کوتاہی ہے، ہمیں اس کا کفارہ ادا کرنا چاہیے۔ پروگرام کا انعقاد خواجہ احمد فاروقی میموریل لائبریری شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں کیا گیا جس کی صدارت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پدم شری سید عین الحسن نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر وجے ناتھ مشرا جب کہ مہمان اعزازی کے طور پر جگن ناتھ آزاد کی صاحب زادی اور مصنفہ مکتا لال نے شرکت کی۔ دی پین فاؤنڈیشن کے چیئرمین آصف اعظمی نے مہمانوں کا استقبال اور تعارف کرایا۔ اظہار تشکر صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ابوبکر عباد نے اور نظامت معین شاداب نے کی۔

صدارتی خطاب میں پروفیسر عین الحسن نے کہا کہ جگن ناتھ آزاد کی استادانہ مہارت اس قدر تھی کہ وہ چلتے پھرتے ایک لفظ بدل کر شعر درست کردیا کرتے تھے۔ یہ آزاد صاحب کا حق ہے کہ ہم ان کے لیے جتنی بھی کانفرنسیں کرسکیں، جتنے سمینار کرسکیں، کریں۔ مہمان خصوصی وجے ناتھ مشرا نے کہا کہ جگن ناتھ آزاد کی صاحب زادی کو دیکھ کر ہی ان کی مثالی تربیت اولاد کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہم اردو بولتے نہیں بلکہ اردو جیتے ہیں۔ مکتا لال نے کہا کہ والد صاحب کی زندگی کتابوں اور اردو مشاعروں کے لیے وقف رہی۔ ایک عظیم باپ کی بیٹی ہونا فخر کا احساس ہے۔ پروگرام میں شہر کی معزز شخصیات کے علاوہ ہندی اور اردو کے ریسرچ اسکالر اور طلبہ وطالبات موجود تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 مئی 2025

غالب انسٹی ٹیوٹ میں آن لائن اردو، فارسی اور موسیقی کلاسز کا آغاز

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے زیر اہتمام یکم مئی سے آن لائن اردو، فارسی اور موسیقی کلاسز کے

نئے سیشن کا آغاز ہوگیا۔ افتتاحی تقریب ایوان غالب میں منعقد ہوئی جس کا باقاعدہ افتتاح انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر قدوائی نے کہا کہ زبان صرف اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک سماجی ضرورت بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں پیشے سے استاد ہوں اور اگر مجھے اس زبان پر مہارت حاصل نہ ہو جس میں مجھے پڑھانا ہے یا بات پہنچانی ہے تو میں اپنے پیشے کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ اردو فارسی اور موسیقی کی تعلیم غالب انسٹی ٹیوٹ کی روایت کا حصہ رہی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ سابقہ سیشن میں طلبہ کی دلچسپی اور سیکھنے کے عمل نے نہ صرف خوشی دی بلکہ حوصلہ بھی بڑھایا۔ اردو فارسی کے استاد طاہر الحسن نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو ایک شیریں اور دل کو چھو لینے والی زبان ہے، اور فارسی کے ساتھ اس کی تعلیم سے زبان کی باریکیوں کو سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔ موسیقی کے استاد عبدالرحمٰن خاں نے اردو اور موسیقی کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہماری کئی مشہور غزلیں اور گیت مخصوص راگوں پر مبنی ہوتے ہیں، جن سے عوام واقف نہیں ہوتے، ان کلاسز کی مدد سے سیکھنے والوں کو راگوں کی بنیادی شناخت حاصل ہوگی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 مئی 2025

نکڑ ناٹک فیسٹول

نئی دہلی: اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے سرگرم غالب انسٹی ٹیوٹ کی ذیلی شاخ 'ہم سب ڈرامہ گروپ' کے زیر اہتمام ایوان غالب میں ایک روزہ 'نکڑ ناٹک فیسٹول' کا انعقاد کیا گیا۔ اس ثقافتی جشن میں دہلی کی

خبر نامہ

مختلف معروف یونیورسٹی و کالجوں کے ڈرامہ گروپس نے شرکت کی اور سماجی موضوعات پر مبنی نکڑ ناٹک پیش کیے، جنھیں حاضرین نے خوب سراہا۔ اس فیسٹول میں ماتا سندری کالج فار ویمن کے گروپ 'پرندے' نے 'اپرادھ کا جنم' جامعہ ملیہ اسلامیہ 'ڈرامہ کلب' نے 'خاموشی'، دیش بندھو کالج کی 'ڈرامیٹک سوسائٹی' نے 'اَن دیکھی اَن سنی' اور رام لال آنند کالج کے گروپ 'حسرتیں' نے 'میں نہ سہتا' جیسے فکر انگیز ڈرامے پیش کیے۔ ان تمام نکڑ ناٹکوں میں معاشرتی ناہمواری، ناانصافی اور انسانی حقوق جیسے حساس موضوعات کو مؤثر انداز میں اجاگر کیا گیا۔ اس موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے شرکا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم سب ڈرامہ گروپ اردو میں تھیٹر اور نکڑ ناٹک کی روایت کو زندہ رکھنے اور اسے فروغ دینے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ انھوں نے تمام فنکاروں اور ان کے سرپرستوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس امید کا اظہار کیا کہ انھی نوجوان فنکاروں میں سے مستقبل کے بڑے نام ابھریں گے جو ملک اور اردو زبان کا نام روشن کریں گے۔ فیسٹول کے اختتام پر پروفیسر محمد کاظم نے کہا کہ نکڑ ناٹک ایک چیلینجنگ فن ہے کیونکہ اس میں فنکاروں کو خود ناظرین تک پہنچنا ہوتا ہے۔ انھوں نے تقریب کی کامیابی پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اسے ایک یادگار موقع قرار دیا۔ بعد ازاں غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے شریک تمام ٹیموں کو اعزازی مومنٹو پیش کیے گئے اور ان کی کارکردگی کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اس طرح یہ فیسٹول اردو تھیٹر کے فروغ کی ایک خوبصورت کوشش کے طور پر اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم مئی 2025

پروفیسر خالد جاوید کی الوداعی تقریب

نئی دہلی: ممتاز فکشن نگار پروفیسر خالد جاوید کی سبک دوشی

کے موقع پر شعبے کی جانب سے ایک یادگار اور نہایت ہی جذباتی الوداعی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر صدر شعبہ نے شعبے کی جانب سے پروفیسر خالد جاوید کا استقبال کرتے ہوئے ان کی شال پوشی بھی کی۔ نیز ان کی خدمت میں ایک دیدہ زیب مظفر، نفیس میمینٹو، خوب صورت ڈائری اور قلم اور جاذب نظر ٹرالی بطور تحفہ پیش کی۔ صدارتی خطاب میں صدر شعبہ پروفیسر کوثر مظہری نے اپنی دیرینہ رفاقتوں اور خالد جاوید کی علم و دانش سے معمور زندگی پر والہانہ جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خالد جاوید نے جس خوب صورتی سے اپنا تدریسی سفر طے کیا ہے وہ ایک مسرت بخش پہلو ہے۔ نظم و ضبط کی پابندی ان کی ایک نمایاں صفت رہی ہے۔ خالد جاوید کی حیثیت شعبے میں ایک روشن تدریسی باب کی تھی۔ اس حسرت خیز فضا میں مزید محزونی اس وقت بڑھ گئی جب پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ ہم خالد جاوید کی ایک ایک ادا کو مدتوں یاد کریں گے۔ ان کا فن، ان کی فکر، ان کی شخصیت اور ان کی زندگی، یہ سب کچھ ہم آمیز ہو کر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی امتیازی شان کی شناخت بن گیا ہے۔ خالد جاوید کو الوداع کہتے ہوئے پروفیسر احمد محفوظ نے ان سے اپنے دیرینہ تعلقات کو یاد کیا اور کہا کہ مغربی فلسفوں پر وہ غائر نظر بھی رکھتے ہیں اور ادب کو فلسفے سے ہم رشتہ بھی کرتے ہیں۔ پروفیسر ندیم احمد نے یہ امید ظاہر کی کہ وہ مستقبل میں ادب کے مزید بڑے ایوارڈ سے سرفراز ہوں گے اور ہمارے شعبے کا نام مزید تابناک ہوگا۔ پروفیسر عمران احمد عندلیب نے اپنے مخصوص باغ و بہار طرز خطاب میں کہا کہ ہم جیسوں کی علمی، تحقیقی، تخلیقی کوتاہیوں کا کفارہ اکیلے خالد جاوید صاحب ادا کر دیتے ہیں۔ پروفیسر سرور الہدیٰ نے کہا کہ خالد جاوید کی گفتگو، ان کے فکری ارتعاشات، ان کا رویہ اور ان کے ردعمل کو میں سرتاپا فکشن کے طور پر دیکھتا ہوں۔ شعبے کے استاد ڈاکٹر شاہ عالم نے خالد جاوید کے ساتھ بیتے خوش گوار لمحات اور واقعات کا ذکر کرتے ہوئے انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ ڈاکٹر خالد مبشر نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے بحیثیت شاگرد خالد جاوید کی معلمانہ عظمتوں پر مبنی ایک مختصر تحریر میں کہا کہ خالد جاوید مختلف علوم و فنون کا سررشتہ ادب سے اس طور پر قائم کرتے ہیں کہ فکر و نظر کے نئے دریچے وا ہو جاتے ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر مشیر احمد نے کہا کہ خالد جاوید ہم سب سے خوش خلقی کے ساتھ پیش آتے۔ انھوں نے کبھی کسی قسم کی سیاست سے دلچسپی نہیں لی۔ محبت و شفقت ان کا شیوہ رہا۔ ڈاکٹر سید تنویر حسین نے ابن صفی پر کام سے متعلق ان کی اولیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ابن صفی کا ادبی مقام و مرتبہ متعین کرنے میں پروفیسر خالد جاوید کو اولیت اور امتیاز حاصل ہے۔ اس پروگرام میں اساتذہ کے علاوہ بڑی تعداد میں شعبے کے ریسرچ اسکالر اور طلبہ و طالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اپریل 2025

اتر پردیش

پروفیسر محمود الٰہی: حیات اور کارنامے

گورکھپور: یاسمین شریف ویلفیئر سوسائٹی بہ اشتراک اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، شہر کے ایم ایس آئی انٹر کالج، بخشی پور گورکھپور میں ایک 'کلیدی خطبہ' بعنوان پروفیسر محمود الٰہی زخمی گورکھپوری' حیات اور کارنامے اور شعری

نشست کا اہتمام کیا۔ پروفیسر محمود الٰہی کی شخصیت اس لیے بھی غیر معمولی تھی کیونکہ وہ صدر شعبہ اردو، ڈین فیکلٹی آف آرٹس، ایکٹنگ شیخ الجامعہ، تین بار چیئر مین اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ رہے۔ استقبالیہ کلمات ایم ایس آئی انٹر کالج کے منیجر محبوب سعید حارث نے ادا کیا جس میں انھوں نے پروفیسر محمود الٰہی سے اپنے گھریلو مراسم کا ذکر بڑی محبتوں سے کیا اور تعارفی کلمات سوسائٹی کے سکریٹری ڈاکٹر اشفاق احمد عمر نے ادا کیے۔ پروفیسر عباس رضا نیر نے کلیدی خطبے میں کہا کہ قصیدہ پر ان کی کتاب کے بغیر اردو قصیدہ کا کوئی نصاب یا پرچہ نہیں بن سکتا۔ اردو اکادمی کے چیرمین شپ کے دوران انھوں نے جو کتابیں تیار کیں وہ آج ہر یونیورسٹی کے نصاب کا حصہ ہے میں انھیں اردو زبان و ادب کا گل سرسبد تسلیم کرتا ہوں۔ پروفیسر پونم ٹنڈن نے کہا کہ اردو محبت کی زبان ہے۔ ہر زبان کے ساتھ تہذیب کا ایک رشتہ ہوتا ہے ہندوستان کی خوبصورتی اسی میں ہے کہ جس طرح ہم سب آپس میں مل جل کر رہتے ہیں اسی طرح مختلف زبانوں کے استعمال سے خوبصورتی کا

رنگ مزید بڑھ جاتا ہے۔ الٰہی صاحب کا رشتہ ہماری یونیورسٹی سے رہا ہے میں اس پروگرام کو اپنے گولڈن جبلی کا ایک اہم حصہ سمجھتی ہوں۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر نزہت فاطمہ نے کہا کہ گورکھپور زرخیز علاقہ ہے جہاں سے پروفیسر محمود الٰہی جیسی نابغہ روزگار شخصیت ابھر کر سامنے آئی یہ الگ بات ہے کہ ان کی جائے پیدائش ٹانڈہ رہی لیکن شخصیت سازی میں اسی شہر نے کلیدی رول ادا کیا۔ پروفیسر چترنجن نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ مبارک باد دیتا ہوں سوسائٹی کے لوگوں کو اور یہ بتانا چاہتا ہوں کہ منشی پریم چند کی کہانی عیدگاہ میں جو کام دادی آمنہ کے لیے پوتے حمید نے کیا تھا جب کہ چمٹا دادی کو لانا چاہیے تھا آج وہی کام آج اشفاق عمر کر رہے ہیں جب کہ یہ کام یہاں کے شعبہ میں ہونا چاہیے کیونکہ الٰہی صاحب اس شعبے میں لمبے وقت تک رہے۔

پروگرام کے پہلے سیشن کے بعد ایک شعری نشست کا بھی اہتمام کیا گیا۔ جس میں شہر کے مشہور و معروف شاعروں نے اپنے خوبصورت کلام پیش کیے۔

پریس ریلیز: اشفاق احمد عمر، گورکھپوری، 28 اپریل 2025

ادبی تقریب

نگینہ (بجنور): اردو کا رسم الخط ہی اردو کا لباس ہے۔ اردو کا مستقبل درخشاں اور تابناک ہے۔ ان خیالات کا اظہار عالمی اردو ٹرسٹ دہلی کے چیرمین اور مشہور ادیب

اے رحمٰن ایڈووکیٹ نے نگینہ ایجوکیشنل اینڈ سوشل ٹرسٹ کی جانب سے منعقد ادبی تقریب کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس موقعے پر ان کو اقبال میموریل ایجوکیشنل سوسائٹی کی جانب سے نامور ادیب 'نشتر خانقاہی ایوارڈ' سے بھی سرفراز کیا گیا۔ مشہور عالم دین مفتی اویس اکرم کی صدارت اور معروف نقاد ڈاکٹر شیخ نگینوی کی نظامت میں راقم منزل پر منعقد پروگرام میں اے رحمان نے کہا کہ ایسے وقت میں کہ جب معاشرہ پوری طرح بکھر چکا ہے، اخلاقی قدریں پامال ہو چکی ہیں۔ اساتذہ کرام کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں اور صحت مند معاشرے کی تعمیر کریں۔ انھوں نے اردو رسم الخط کا دفاع کیا، اور کہا کہ رسم الخط کو ترک کر دینے کے بعد اردو زبان کو نسلوں تک منتقل نہیں کیا جا سکتا اور اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو ہم ترکی زبان کا دیکھ چکے ہیں۔

تقریب میں ڈاکٹر شیخ نگینوی نے اے رحمٰن کے ذریعے سرسید احمد خاں کے افکار و خیالات کی 25 جلدوں کی اشاعت کو علیگ دنیا کا منفرد اور غیر معمولی کارنامہ بتایا اور کہا کہ عالمی جائزہ کے ابن صفی نمبر کی اشاعت بھی کسی کارنامے سے کم نہیں۔ اس موقعے پر اقبال میموریل ایجوکیشنل سوسائٹی کی جانب سے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو نشتر خانقاہی ایوارڈ، توصیفی سند اور دوشالے سے نوازا گیا، ساتھ ہی عالمی جائزہ کے ابن صفی نمبر کی رونمائی مفتی اویس اکرم، طفیل احمد ایڈووکیٹ، پرویز عادل ماحی، معروف سماجی کارکن تنویر اختر، قومی اردو شکشک سنگھ کے صوبائی صدر تنویر احمد، شاعر اطہر شکیل، ڈاکٹر عالم گیر کاظمی کے بدست عمل میں آئی۔

شیخ نگینوی، نگینہ، 28 اپریل 2025

اعزاز و اکرام

ذکی طارق بارہ بنکوی

لکھنؤ: 15 ویں راشٹریہ پسماندہ کنونشن کے دوران مومن انصار سبھا نے ممتاز شاعر و ادیب ذکی طارق بارہ بنکوی کو ان کی غیر معمولی ادبی خدمات اور سماجی اثرات کے اعتراف میں ایک معزز اعزاز سے سرفراز کیا۔ یہ اعزاز اتر پردیش حکومت کے وزیر مملکت برائے اقلیتی فلاح، مسلم وقف اور حج، دانش آزاد انصاری کی جانب سے پیش کیا گیا۔ دانش آزاد انصاری نے اپنے خطاب میں کہا، ذکی طارق بارہ بنکوی ایک ایسی شخصیت ہیں جنھوں نے اردو ادب اور صحافت کے میدان میں بے مثال کارکردگی دکھائی ہے۔ اکرم انصاری نے ذکی طارق بارہ بنکوی کی شاعری اور سماجی خدمات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا، کہ ذکی طارق بارہ بنکوی نے اپنی شاعری کے ذریعے ادب کو نئی روشنی دی اور سماج کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ ان کی شاعری نے نہ صرف اہل ادب کو متاثر کیا بلکہ عوامی سطح پر بھی شعور بیدار کیا۔ ہم ان کی خدمات کو سراہتے ہیں اور ان کے اس اعزاز پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 29 اپریل 2025

ونود کمار شکلا

نئی دہلی: ہندی کے مشہور شاعر اور معروف کہانی کار ونود کمار شکلا کو 59 ویں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازے

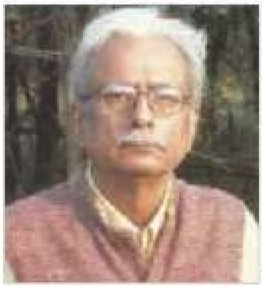

جانے کا اعلان کیا گیا۔ مشہور ناول 'نوکروں کی قمیص' اور شعری مجموعہ 'وہ آدمی نیا گرم کوٹ پہن کر چلا گیا وچار کی طرح' کے تخلیق کار 88 سالہ مصنف مسٹر شکلا کو ان کی زندگی بھر کی تحریر کے لیے دیا جا رہا ہے۔ گیان پیٹھ سلیکشن کمیٹی کی میٹنگ کے بعد جاری کردہ ایک سرکاری بیان میں کہا گیا ہے کہ اس ایوارڈ کے تحت مسٹر شکلا کو 11 لاکھ روپے کی نقد رقم، یادگار، توصیف سند اور واگ دیوی کا مجسمہ دیا جائے گا۔ رائے پور، چھتیس گڑھ کے اگریکلچر کالج سے ریٹائر ہونے والے مسٹر شکلا کو ان کے دوسرے ناول دیوار میں کھڑکی رہا کرتی تھی کے لیے 1999 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔ مسٹر شکلا نے ستر کی دہائی میں اپنے تحریری کیریئر کا آغاز کیا اور ہندی میں اپنے پہلے شعری مجموعہ 'وہ آدمی نیا گرم کوٹ پہن کر چلا گیا وچار کی طرح' سے مشہور ہوئے۔ اس سے قبل 1971 میں ان کی شاعری کی کتاب 'تقریباً جئے ہند' شائع ہوئی تھی جسے اشوک واجپائی نے ایڈٹ کیا تھا۔ مسٹر شکلا 1981 میں شائع ہونے والے ناول 'نوکر کی کمی' کے ساتھ ادب کی دنیا میں داخل ہوئے۔ اس ناول پر فلم بھی بنی ہے۔ یکم جنوری 1937 کو راج نندگاؤں (اب چھتیس گڑھ) میں پیدا ہوئے، مسٹر شکلا نے جبل پور سے زرعی سائنس میں پوسٹ گریجویٹ کی ڈگری حاصل کی اور رائے پور میں پڑھانا شروع کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 مارچ 2025

معروف ادبی شخصیات کو ایوارڈ

گورکھپور: ادبی تنظیم دائرہ ادب گورکھپور کی جانب سے ایک اعزازی پروگرام بعنوان 'ایک ادبی پروگرام اردو اہل قلم کے نام' این ٹی چلڈرین اکیڈمی محلّہ ابو بازار انچوا میں منعقد کیا گیا جس میں معروف اسلامی

اسکالرڈاکٹر سراج احمد قادری کو نعتیہ ادب کے فروغ وارتقا میں نمایاں کردار ادا کرنے کے اعتراف میں فخر گورکھپور مسلم انصاری ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا جب کہ ہمہ جہت ادبی شخصیت الحاج ڈاکٹر عبیداللہ چودھری کو احمد صدیقی مجنوں گورکھپوری ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں سند توصیف اور مومنٹو پیش کیا گیا۔ تاجور ویلفیئر فاؤنڈیشن گورکھپور کے زیراہتمام منعقد دوحصوں میں مشتمل اس پروگرام کی صدارت ادارے کے سرپرست الحاج ارشد جمال سامانی نے کی۔ اس بزم کی سرپرستی ونگرانی بالترتیب ادب نواز الحاج محمد افراہیم اور صدر ادارہ عاصم گونڈوی نے کی۔ اس موقعے پر ناظم مجلس حافظ ناصرالدین نے مہمان اعزازی ڈاکٹر سراج احمد قادری اور ڈاکٹر عبیداللہ چودھری کے ادبی کارناموں پر بھرپور روشنی ڈالی اور انھیں بہترین انداز میں خراج تحسین پیش کیا۔ (بعدہ ایک شعری) نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں مختلف شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ آخر میں این ٹی چلڈرین اکیڈمی کے منیجر اور میزبان قاضی سلیم اللہ نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ سرپرست اعلیٰ الحاج محمد افراہیم صاحب کے ستائشی کلمات کے ساتھ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

پریس ریلیز: فیضان سرور، گورکھپوری، 17 اپریل 2025

رسم اجرا

زندگی کا بونس

نئی دہلی: اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے

سرگرم تنظیم 'انڈین ڈیولپمنٹ اینڈ ایجوکیشنل ایسوسی ایٹس' ('آئیڈیا کمیونٹی کیشنز') اور 'وجیہ بکس' کے اشتراک سے اردو گھر میں ادبی تقریب کا انعقاد ہوا۔ تقریب کا مرکز ڈاکٹر سچیدانند جوشی کی مشہور کتاب 'زندگی کا بونس' کے اردو ترجمے کا اجرا تھا، جسے ابوہریرہ نے اردو قالب میں ڈھالا ہے۔

تقریب کی صدارت ملک کے معروف دانشور اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے نائب صدر و پدم شری پروفیسر اخترالواسع نے کی جبکہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مظہر آصف مہمانِ خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ این پی سنگھ (ریٹائرڈ آئی اے ایس)، صدر بھارتیہ شکشا بورڈ اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری اطہر فاروقی مہمان اعزازی کی حیثیت موجود رہے۔

صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی پروفیسر ابوبکر عباد نے کتاب پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر جوشی اپنی تحریروں میں زندگی کے عام واقعات سے مثبت پہلو تلاش کرکے قاری کو نئی توانائی بخشتے ہیں۔ اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر اخترالواسع نے کہا کہ سچیدانند جوشی نے اپنی کہانیوں کے ذریعے انسانی تعمیر اور مثبت فکر کو خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے اور یہ کتاب اردو ادب میں ایک خوش آئند اضافہ ہے۔ پروفیسر مظہر آصف نے کہا کہ اردو اور ہندی کے درمیان ادبی مکالمہ وقت کی اہم ضرورت ہے اور 'زندگی کا بونس' اس سمت میں ایک اہم قدم ہے۔ ڈاکٹر این پی سنگھ نے کہا کہ جوشی کی تحریریں ہندوستانی تہذیب کی عکاسی کرتی ہیں اور سماجی ہم آہنگی کو فروغ دیتی ہیں۔ گجانند پی شرما (ڈائریکٹر، آئیڈیا کمیونٹی کیشنز) نے مہمانوں اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی۔ اس موقعے پر ادبی، تعلیمی اور تھیٹر سے وابستہ کئی معزز شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 اپریل 2025

روش روش نشتر

دربھنگہ: مفتی آفتاب عالم غازی کے شعری مجموعہ 'روش روش نشتر' کی رسم اجرا شہر کے چیدہ اہل علم و ادب کی موجودگی میں شہر کی مشہور ادبی انجمن بزم رہبر کی 173 ویں شعری نشست کے موقعے سے ہوئی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر مجیر احمد آزاد نے کہا کہ 'روش روش نشتر میں' زبان کے سلسلے میں بڑی محنت کی ہے اور

شاعری کو فن کے طور پر لیا ہے، ان کے یہاں پابند نظمیں کافی متاثر کرتی ہیں۔ روزنامہ 'انقلاب' کے احتشام الحق نے کہا کہ ہر دور میں شعرا سے یہ امید کی جاتی ہے کہ اپنے عہد کو اپنی شاعری میں بیان کریں گے اور اسی طرح کی شاعری سماج میں صحیح جگہ بنا پاتی ہے، مفتی عباداللہ قاسمی نے بھی اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

مفتی محمد صابر قاسمی نے بزم رہبر کی ادبی خدمات، معہد الطیبات کی تعلیمی خدمات اور مفتی آفتاب غازی کے مجموعہ روش روش نشتر کی اشاعت اور اہل ادب کی قدردانی پر مبارکباد پیش کی، ڈاکٹر جسیم الدین قاسمی (اردو مترجم) نے آفتاب غازی کے زمانہ طالب علمی میں ان کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کی تفصیلات پیش کیں۔ صدر محفل ڈاکٹر عطا عابدی نے کہا کہ شاعری ایک ذمے داری اور شعری صلاحیت ایک امانت ہے۔ ہمیں اپنی شاعری میں وہ افکار لانے چاہئیں جن سے ہماری نئی نسل کو فائدہ پہنچے، صدر صاحب نے 'روش روش نشتر' کے اجرا پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ آفتاب صاحب علم وادب کے سنگم ہیں اور انھوں نے بامقصد شاعری کی ہے۔ ہندی سماج منچ سے ابھا جھا سنہا جی نے آفتاب غازی کے مجموعے کی اشاعت پر مبارکباد پیش کی اور اپنے اشعار سنائے، ہندی سماج منچ کے جناب اکھلیش کمار چودھری نے 'روش روش نشتر' کی اشاعت پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آفتاب صاحب کے اشعار سے انسانیت اور وطن سے محبت کا پیغام ملتا ہے۔ اس موقعے پر دیگر شخصیات نے اپنے خیالات سے قارئین کو روشناس کرایا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 اپریل 2025

'عالمی جائزہ' کا ابن صفی نمبر

نئی دہلی: عالمی اردو ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کے زیر اہتمام عالمی جائزہ کے خصوصی شمارے ابن صفی نمبر کی رسم اجرا

کی تقریب غالب انسٹی ٹیوٹ کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی، جس میں ممتاز دانشوروں، صحافیوں اور قلمکاروں سمیت علم وادب سے محبت رکھنے والے سامعین وحاضرین نے شرکت کی اور اردو زبان کے مشہور ومعروف ناول نگار اور شاعر ابن صفی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی خدمات کا احاطہ کیا۔ تقریب کے روح رواں اے رحمان ایڈووکیٹ (مدیر: عالمی جائزہ اور چیئرمین، عالمی اردو ٹرسٹ، رجسٹرڈ) نے تمام شرکا کا تعارف پیش کیا اور ابن صفی کی حیات وخدمات کے حوالے سے گفت وشنید میں کہا کہ ابن صفی اردو جاسوسی ادب کا درخشاں ستارہ ہیں۔ ابن صفی نہ صرف اردو کے پہلے مکمل جاسوسی ناول نگار تھے بلکہ انھوں نے اس صنف کو وہ معیار دیا جو آج تک قائم ہے۔ مہمان خصوصی کے طور پر آن لائن شریک ہوئے، ابن صفی کے صاحبزادے احمد صفی (لاہور، پاکستان) نے اپنے والد گرامی کے حوالے سے گفتگو کی، ساتھ ہی عالمی اردو ٹرسٹ سمیت تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے کہا کہ ابن صفی کو جاسوسی ادب میں نئی جہتیں متعارف کرانے کا سہرا حاصل ہے، وہ 'عمران سیریز' اور 'جاسوسی دنیا' جیسے بے حد مقبول سلسلوں کے خالق ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ابن صفی کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو ادب کو تفریح، سنسنی اور ادبی معیار کا حسین امتزاج عطا کیا، ان کی تحریریں محض کہانیاں نہیں بلکہ ایک عہد کی جھلک پیش کرتی ہیں۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ ابن صفی نے اردو ادب کو ایسی تخلیقات دی ہیں جو آج بھی زندہ دلوں کو ہنسانے، سوچنے اور حیرت میں ڈالنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، وہ بلاشبہ اردو کے کلاسیکی ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ہندی روزنامہ 'ہندوستان' کے مینیجنگ ڈائرکٹر پرتاپ سوم ونشی نے کہا کہ ابن صفی کی تحریر کا سب سے بڑا کمال ان کا سادہ مگر دلکش انداز ہے۔ ہندی روزنامہ 'امر اجالا' کے گروپ ایڈیٹر وایڈوائزر یشونت ویاس نے کہا کہ ابن صفی نہ صرف ایک کامیاب مصنف تھے بلکہ اردو ادب کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' کے گروپ ایڈیٹر عبدالماجد نظامی نے اپنے خطاب میں عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ ابن صفی وہ قلمکار ہیں جنھوں نے ادب کو عوام سے جوڑا، ان کی تخلیقات میں نہ صرف، تجسس تھا بلکہ شائستگی، زبان کی نفاست اور معاشرتی اقدار کی جھلک بھی نمایاں تھی۔ نظامت کرتے ہوئے پروفیسر شاہینہ تبسم کا کہنا تھا کہ ابن صفی نے اردو ادب کو ایک نیا ذائقہ دیا، ان کی تخلیقات نے قاری کو سوچنے، محظوظ ہونے اور تجسس سے بھرپور کہانیوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا۔ لہٰذا ان کی تحریریں آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ بنی رہیں گی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 اپریل 2025

باب علم

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سرسید ہال (نارتھ) نے اپنے تعلیمی اور ثقافتی عروج کے چالیس

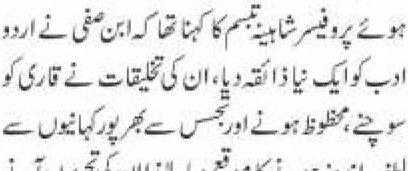

سالہ سفر کو اپنی سالانہ ہال میگزین 'باب علم' کی رونمائی کے ساتھ منایا، جو 1984 سے 2024 تک کے اس کے سفر کو اجاگر کرتی ہے۔ بطور مہمان خصوصی رسم اجرا کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے پرووائس چانسلر پروفیسر محسن خان نے ایڈیٹوریل ٹیم کو مبارکباد پیش کی اور اس اقدام کو اے ایم یو کی ادبی اور تعلیمی روایات میں ایک اہم اضافہ قرار دیا۔ مہمان ذی وقار یونیورسٹی لائبریرین پروفیسر نشاط فاطمہ نے میگزین کی ادارتی بصیرت کی تعریف کی۔ ایک اور مہمان ذی وقار دفتر رابطہ عامہ کے ممبر انچارج اور ڈپٹی ڈی ایس ڈبلیو پروفیسر وبھا شرما نے مدیر نوید عالم کی قیادت اور بصیرت کی تعریف کی جنھوں نے اس ایڈیشن کو کامیابی کے ساتھ تکمیل تک پہنچایا۔ ہال کے پرووسٹ پروفیسر آدم ملک خان نے اس اشاعت کو سراہا جو ہال کی تعلیمی زندگی اور ثقافتی اہمیت کی عکاسی کرتی ہے۔ میگزین کے ایڈیٹر ان چیف، جناب نوید عالم نے ایڈیٹوریل سفر پر روشنی ڈالی اور ایڈیٹوریل بورڈ اور ہال انتظامیہ کی محنت کو سراہا۔ انھوں نے بتایا کہ 'باب علم' اپنی نوعیت کا پہلا ایسا اشاعتی رسالہ ہے جو سرسید ہال (نارتھ) کی جامع تاریخ کو دستاویزی شکل دیتا ہے، 'باب علم' کا آغاز سرسید احمد خاں کے عہد سے ہوا جو اے ایم یو کے بانی تھے، اور یہ میگزین اپنے مواد کی بنیاد پر اسم بامسمی ہے۔ ڈاکٹر عرفات ظفر (سینئر) نے کہا کہ باب علم سرسید ہال (نارتھ) کی فکری روح، وراثت اور ہال کمیونٹی کی علمی بصیرت کی عکاسی کرتا ہے۔ ڈاکٹر ریاض احمد (رہائشی وارڈن) اور ایڈیٹوریل بورڈ کے اراکین فیض الرحمٰن شیروان اور ابوداؤد بھی اس موقعے پر موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 24 اپریل 2025

پروفیسر فاروق بخشی: شخص اور عکس

نئی دہلی: سچا شاعر اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کی شاعری اپنے عہد کے مسائل کو اپنے الفاظ میں سمیٹے ہوئے ہوتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر خالد محمود نے پروفیسر فاروق بخشی کے ادبی کارناموں پر مشتمل کتاب 'فاروق بخشی: شخص اور عکس' کی رسم اجرا کی تقریب میں کیا۔ جامعہ نگر کے تسمیہ آڈیٹوریم میں منعقد اس تقریب میں پروفیسر خالد محمود نے فاروق بخشی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مزید کہا کہ فاروق بخشی نے اپنی چالیس سالہ تدریسی زندگی میں تین دانش گاہوں میں طلبہ کو فیضیاب کیا۔ رسم اجرا کی اس تقریب کا آغاز کتاب کے مرتب ڈاکٹر ظفر گلزار

کے استقبالیہ کلمات سے ہوا۔ انھوں نے فاروق بخشی سے اپنے دیرینہ مراسم کا ذکر کرتے ہوئے اس کتاب کی تدوین کے محرکات پر بھرپور روشنی ڈالی۔ اس کتاب کی اشاعت ایم آر پبلی کیشنز کے زیر اہتمام ہوئی ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر ندیم احمد نے کہا کہ فارق بخشی سابقہ چار دہائیوں سے شعر و ادب کی دنیا میں سرگرم ہیں اور ادبی حلقوں میں انھیں ادب و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

دہلی یونیورسٹی کے استاد پروفیسر محمد کاظم نے کہا کہ فارق بخشی کا کلام کلاسیکی قدروں کا ترجمان بھی ہے، جدید عہد کے مسائل بھی ان کے اشعار میں بیان ہوئے ہیں۔ ذاکرہ ڈاکٹر آل طہٰ نقوی فاروق بخشی کی ہم جماعت رہی ہیں۔ انھوں نے اپنی طالب علمی کے کئی قصے سنا کر محفل کو خوشگوار ماحول میں پہنچا دیا۔ اس پروقار تقریب کی صدارت ڈاکٹر سید سجاد نے کی۔ نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 اپریل 2025

حادثوں کے درمیاں

نئی دہلی: امام مظہر عالم کی شاعری دراصل ان کی زندگی کا ہی آئینہ ہے اور یہ مجموعہ 'حادثوں کے درمیاں' اسم بامسمّیٰ ہے۔ ان کے بعض اشعار اس قدر پختہ، کلاسیکی رچاؤ کے حامل اور آفاقیت سے معمور ہیں کہ انھیں اعلیٰ اشعار کی مثالوں میں بلاخوفِ تردید پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز ادیب پروفیسر خالد محمود نے دی ونگس فاؤنڈیشن اور ڈائنامک انگلش اکیڈمی کے زیر اہتمام، ڈائنامک انگلش اکیڈمی، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی میں ماسٹر امام مظہر عالم مرحوم کے شعری مجموعے 'حادثوں کے درمیاں' کی تقریب رونمائی میں صدارتی کے دوران کیا۔ مہمان خصوصی سید محب الحق سکریٹری، بہار مدرسہ بورڈ ٹھکیھک سنگھ) نے اظہارِ مسرت کرتے ہوئے کہا کہ بہار مدرسہ بورڈ سے وابستہ استاذ کا ایسا خوب صورت کلام کتابی صورت میں شائع ہونا ہمارے لیے باعثِ افتخار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ امام مظہر عالم کی شاعری سے دیگر تخلیق کار اساتذہ کو ترغیب ملے گی۔ مہمان اعزازی صاحب طرز نثر نگار حقانی القاسمی نے کہا کہ امام مظہر عالم کی شاعری ان کے جذبات و احساسات کا نگارخانہ ہے۔ ان کی زندگی کے تجربات و حوادث شعری سانچوں میں ڈھل گئے ہیں۔ یہ شاعری انفرادی و اجتماعی واردات کا پراثر شعری بیانیہ ہے۔ اس موقعے پر ممبئی کے مشہور صحافی اختر کاظمی نے کہا کہ شہر سے دور حاشیائی علاقوں میں اب بھی ایسے فن کار موجود ہیں جن کی طرف مرکز میں بیٹھے نقادوں کی نگاہ نہیں پہنچتی۔ مہمان اعزازی ممبئی میں مقیم مشہور ادیبہ شمع اختر کاظمی نے کہا کہ گمنام اور نظرانداز شدہ ادیبوں پر توجہ کرنا بھی ادب دوستی ہے اور اس محفل میں یہ فریضہ انجام دیا جانا لائق تحسین ہے۔ ماہنامہ یوجنا کے مدیر عبدالمنان نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے مرحوم امام مظہر عالم کے سوانحی کوائف تفصیل سے بیان کیے، جس سے اندازہ ہوا کہ ان کی زندگی سانحات کے ایک دل دوز سلسلے سے عبارت ہے۔ افتخارالزماں نے ان کی شاعری کو سیمانچل کی زندگی، سماج، تہذیب اور تاریخ کی ایک

شعری دستاویز قرار دیتے ہوئے کہا کہ ایسی شاعری ہمیں اپنی مٹی اور اپنی جڑوں سے وابستہ کرتی ہے۔ جے این یو کے استاذ ڈاکٹر محمد اجمل نے ان کی شاعری کا محاکمہ کرتے ہوئے کہا کہ امام مظہر عالم کا کلام دلوں کو چھونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر نعمان قیصر نے کہا کہ ماسٹر امام مظہر عالم مرحوم ہمارے دیار کے بزرگ شاعر تھے۔ ان کی شاعری ہماری روح کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ دی ونگس فاؤنڈیشن اور ڈائنامک انگلش اکیڈمی کے بانی ڈاکٹر انوارالحق نے کہا کہ امام مظہر عالم کی شاعری میں جو سادگی، سلاست اور فطری پن ہے وہ نہایت متاثر کن ہے۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے ڈاکٹر خالد مبشر نے کہا کہ ماسٹر امام مظہر عالم مرحوم ایک مثالی معلم، صاحب دل صوفی، مخلص سماجی خادم، ولولہ انگیز مقرر اور سچے جذبات کے شاعر تھے۔ ان کی تخلیقی شخصیت بیگنائی تہذیب کے خمیر سے تشکیل پذیر ہوئی تھی۔ موقعے کی مناسبت سے عبدالرحمٰن، سید تجمل اسلام اور محمد ذیشان نے ماسٹر امام مظہر عالم مرحوم کی غزلیں ترنم سے پیش کیں۔ ڈاکٹر انوارالحق کے اظہار تشکر پر اس پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 اپریل 2025

رنگِ خوشبو صبا

علی گڑھ: علی گڑھ میں بزم نوید سخن علی گڑھ کی جانب سے ایک پروقار ادبی تقریب میں ڈاکٹر سید بصیرالحسن وفا نقوی کے مجموعہ کلام 'رنگ خوشبو صبا' کی رسم اجرا زیر سرپرستی استاذ الشعرا ڈاکٹر الیاس نوید گنوری عمل میں آئی جس میں مقامی و بیرونی شعرا و ادبا نے شرکت کی اور ڈاکٹر سید بصیرالحسن وفا نقوی کی شاعری پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر الیاس نوید گنوری نے مجموعۂ کلام کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ مجموعہ بہترین غزلوں سے مزین ہے۔ اس میں شامل غزلیں اپنے معیار اور اسلوب کے باعث انفرادیت کی متحمل ہیں۔ پروگرام کے مہمان خصوصی طرب نیازی نے کہا کہ ڈاکٹر سید بصیرالحسن وفا نقوی اردو ادب کی غزل میں سادگی و سلاست کے ساتھ گہرائی و گیرائی پائی جاتی ہے۔'' انجم بدایونی نے کہا کہ 'رنگ خوشبو صبا' میں بہترین غزلیں دیکھنے کو ملتی ہیں، اس میں جہاں انسانی جذبات کی بہترین عکاسی نظر آتی ہے وہیں تصوف کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔'' منصور ادب پہاسوی نے کہا کہ ڈاکٹر وفا نقوی کا اسلوب نہایت منفرد اور دل کو متاثر کرنے والا ہے۔ محمد عادل فراز نے کہا کہ یہ مجموعہ عصر حاضر کے ادبی تقاضوں پر کھرا اترتا ہے اور اس میں جتنی غزلیں ملتی ہیں ان میں کوئی نہ کوئی شعر ایسا ضرور ملتا ہے جو سہل ممتنع کا رنگ اختیار کیے ہوئے ہے۔ اس موقعے پر ایک شعری نشست کا انعقاد بھی عمل میں آیا جس کی نظامت ڈاکٹر سید بصیرالحسن وفا نقوی نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 9 اپریل 2025

ہم اپنے تماشائی

ممبئی: معروف اردو شاعر ادیب مصور اور افسانچہ نگار جناب رؤف صادق کی کتاب ہم اپنے تماشائی (افسانچے) کی رسم اجرا 20 اپریل 2025 کی آٹھ بجے شب بزم شمس رمزی

کے زیر اہتمام ملت اردو ہائی اسکول مالونی ملاڈ ممبئی میں جناب اطہر اعظمی کی صدارت میں ممتاز فکشن رائٹر ڈاکٹر سلیم خان کے ہاتھوں انجام پائی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سلیم خان نے کہا رؤف صادق نے شاعری کے بعد فکشن میں اپنی اختصار نویسی کا پرچم بلند کیا ہے۔ جس میں وہ کامیاب ہیں۔ انھوں نے کہا رؤف صادق کو اپنے قاری کی ذہانت پر اعتماد ہے اس لیے وہ ہر بات کو کھول کر بیان کرنے کے بجائے اپنے افسانچہ کو ایسے موڑ پر ختم کر دیتے ہیں جہاں سے آگے قاری اس کو اختتام تک پہنچاتا ہے۔ جناب اطہر اعظمی نے اپنی صدارتی تقریر میں رؤف صادق کے فکر و فن کو عہد حاضر سے ہم آہنگ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کے افسانچوں میں دردمندی فکری پختگی اور زوال پذیر معاشرے کی عکاسی نمایاں ہے، ڈاکٹر محمد کلیم ضیا نے رؤف صادق کو انوکھے اور قابل توجہ افسانچے رقم کرنے پر مبارکباد پیش کی اور اپنی ایک نظم سنائی جس میں رؤف صادق کے افسانچوں کے مزاج کی جھلکیاں محسوس کی جاسکتی ہیں۔ جناب شجاع الدین شاہد نے رؤف صادق کے فن افسانچہ پر بھرپور روشنی ڈالی اور کہا کہ ان کے افسانچے فکر انگیز ہیں جس میں ندرت اور عمدگی ہے ڈاکٹر وسیم عقیل شاہ نے رؤف صادق کے افسانچوں کا موضوعاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے ان کے افسانچوں کو کثیر رنگی قرار دیا، جناب علیم الدین علیم نے رؤف صادق کا دلچسپ تعارفی خاکہ پیش کیا۔ تقریب رسم اجرا کے کنوینر جناب شاذ رمزی نے نظامت کے فرائض بہ حسن و خوبی انجام دیے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر غضنفر اقبال، گلبرگہ، 22 اپریل 2025

آتماؤں کے سراب

لکھنؤ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن لکھنؤ کی کاروان ادب مہم اور ادبی سنستھان کے باہمی اشتراک

سے ممتاز اردو ادیب اور افسانہ نگار راجیو پرکاش ساحر کے ناول 'آتماؤں کے سراب' کی رسم اجرا کا انعقاد 5 مئی کو یوپی پریس کلب میں زیر صدارت پروفیسر شافع قدوائی، پروفیسر صغیر افراہیم سابق صدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ڈاکٹر پروین شجاعت و پروفیسر ریشماں پروین ہوا۔ نظامت کے فرائض پرویز ملک زادہ نے ادا کیے۔ استقبالیہ خطاب اموبا کے صدر سید محمد شعیب، اور تعارفی کلمات آتماؤں کے سراب کے مصنف راجیو پرکاش ساحر نے ادا کیے۔ اس موقعے پر پروفیسر شافع قدوائی نے کہا راجیو پرکاش ساحر کا ناول حقیقت کے بہت قریب ہے جب کہ عام طور سے لکھے گئے ناول پوری طرح فکشن اور غیر یقینی حالات پر مبنی ہوتے ہیں۔ جو حالات حاضرہ کی عکاسی کرتے ہیں۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ فنکار نے ناول کو شعور اور لاشعور کی یادوں میں اس طرح سجایا ہے کہ ایک بڑے زمانی یعنی مسافات کے اسفار کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ مہمان ذی وقار پروفیسر ریشماں پروین نے کہا راجیو پرکاش ساحر کی تحریر حقیقت کی عکاسی ہے۔ ناول کی زبان عہد حاضر کی وہ زبان ہے جس میں اردو کے ساتھ انگلش ہندی، اودھی الفاظ بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر پروین شجاعت نے کہا کہ راجیو پرکاش ساحر کے ناول 'آتماؤں کے سراب' کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس ناول میں انھوں نے مختلف موضوعات نظریات اور زبانیں بولنے والے لوگوں کی زندگی کے حالات پیش کیے ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر شکیل احمد قدوائی، امیر مہندی، سہیل کاکوروی، طارق سعید، دلشاد مسعود، ترن پرکاش سریواستو نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں کاروان ادب مہم کے کنوینر انور حبیب علوی نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'قومی خبریں' لکھنؤ، 2025

وفیات

پروفیسر شمس الحق عثمانی

نئی دہلی: اردو کے ممتاز فکشن نقاد اور منٹو و بیدی کے اداشناس پروفیسر شمس الحق عثمانی کا 22 اپریل 2025 دوپہر میں انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین دلی گیٹ قبرستان

میں ہوئی جہاں ان کے احباب، شاگردوں اور ان سے محبت کرنے والوں نے نم آنکھوں کے ساتھ انھیں الوداع کہا۔ پروفیسر عثمانی شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اکتوبر 1989 میں وابستہ ہوئے تھے اور فروری 2013 میں وظیفہ یاب ہوئے۔ شعبے کی مختلف ذمے داریاں انھوں نے انجام دیں۔ بطور صدر شعبہ بھی انھوں نے اپنی ذمے داری نبھائی۔ شعبہ کے اہم اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ فکشن مطالعات ان کا خاص میدان تھا۔ چند روز پہلے وہ بیمار ہوئے تو انھیں ہاسپٹل لایا گیا مگر علاج کارگر نہ ہوسکا اور آج وہ دوپہر میں عالم فانی سے کوچ کر گئے۔ پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹا اور بیٹی ہیں۔

پروفیسر شمس الحق عثمانی 15 فروری 1948 کو دیو بند سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ ابھی چار برس کے تھے کہ والد کے ساتھ دلی آگئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول سے ہائر سیکنڈری کی تعلیم مکمل کی۔ ذاکر حسین کالج سے بی اے کیا۔ ایم اے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو سے حاصل کی۔ راجیندر سنگھ بیدی کی شخصیت اور فن پر انھوں نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا تھا جو بیدی نامہ کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو کر مقبول ہوا۔

پروفیسر شمس الحق عثمانی کا شمار اردو کے اہم قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے قلم سے دو درجن سے زائد کتابیں نکلیں۔ ترتیب و تدوین کے ساتھ ساتھ ان کے مضامین کے متعدد مجموعے جن میں دراصل، درحقیقت، فسانہ و شعر کا بلاوا، غالب اور منٹو، شامل ہیں مقبول ہوئے۔ ابوالفضل صدیقی شخص اور فن کی تفہیم، باقیات

بیدی اور آئنوں کی نگری ان کے افسانوی پرکھ کی آئینہ دار کہی جاسکتی ہیں۔ رسالہ جامعہ کی ستر سالہ تحریروں کا چار جلدوں میں انتخاب بھی انھوں نے کیا۔ پورا منٹو دراصل یہ منٹو کی کلیات ہے جس کی چار جلدیں آکسفورڈ پریس کراچی سے شائع ہوچکی ہیں مزید منتظر اشاعت ہیں۔ نظیر اکبرآبادی سے متعلق تمام تحریروں کو انھوں نے دو جلدوں میں نہایت سلیقے کے ساتھ مرتب کر کے 'نظیر فہمی' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں جہاں ان کی متعدد کتابوں کو ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا وہیں غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے ان کی مجموعی ادبی خدمات پر غالب انعام (2014) سے سرفراز کیا تھا۔ دلی اردو اکیڈمی نے ان کی تنقیدی خدمات کے اعتراف میں انھیں ایوارڈ سے سرفراز کیا تھا۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام، 23 اپریل 2025

وجے رائے

نوئیڈا: ہندی روزنامہ راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر ڈاکٹر وجے رائے کا 4 مئی کی علی الصبح دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ 58 سالہ ڈاکٹر رائے گزشتہ

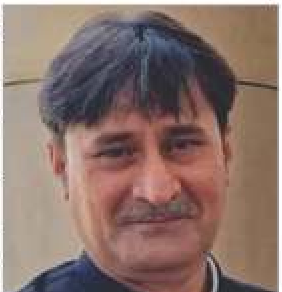

چند ماہ سے بیمار تھے۔ ان کے انتقال کی اطلاع ملتے ہی صحافیوں، سیاست دانوں، افسران، وکلا اور دیگر معززین کی بڑی تعداد خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے پہنچ گئی۔ ڈاکٹر رائے کا نوئیڈا اسیکٹر 94 میں واقع ان کی رہائش گاہ پر شام 4 بجے آخری رسومات ادا کی گئیں۔ ان کے چھوٹے بھائی ونے رائے نے انھیں مکھا گنی دی۔ وہاں موجود لوگوں کی بڑی تعداد نے ڈاکٹر رائے کو نم آنکھوں سے الوداع کیا۔ ڈاکٹر رائے نے اپنا کریئر 27 سال قبل راشٹریہ سہارا کے نیشنل بیورو میں نامہ نگار کے طور پر شروع کیا تھا۔ اپنی ذہانت، انکساری اور حسن سلوک کی وجہ سے وہ کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے۔ پہلے وہ راشٹریہ سہارا کے نیشنل بیورو چیف بنے، اس کے بعد انھیں سہارا سے، ٹی وی نیوز نیٹ ورک اور راشٹریہ سہارا کی مشترکہ رپورٹنگ ٹیم، سہارا نیوز بیورو کے ایڈیٹر کی ذمے داری سونپی گئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر وجے رائے راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر بنے۔ ڈاکٹر رائے کے انتقال پر راشٹریہ سہارا کے نوئیڈا میں واقع ہیڈکوارٹر، لکھنؤ، گورکھپور، وارانسی، کانپور، دہرادون، اور پٹنہ یونٹس میں تعزیتی اجلاس منعقد کر کے ساتھیوں نے نم آنکھوں سے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 مئی 2025

شگفتہ سہسرامی

پٹنہ: منفرد لب و لہجے کے مشہور شاعر حضرت شگفتہ سہسرامی کا 29 اپریل کو مختصر علالت کے بعد سہسرام میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 78 برس تھی۔ پسماندگان

میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ ان کی اہلیہ کا پہلے ہی انتقال ہوچکا ہے۔ شگفتہ سہسرامی کے بھائی اور مشہور شاعر شکیل سہسرامی کے مطابق شگفتہ سہسرامی کی نماز جنازہ سہسرام میں عصر کی نماز کے بعد ادا کی گئی۔ حاجی حرمین قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ مختار احمد خان شگفتہ سہسرامی، شیر شاہ کی نگری سہسرام (روہتاس) کے کرنسرائے میں 10 فروری 1947 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا عبدالوحید خاں غازی شمسی جید عالم دین تھے۔ شگفتہ سہسرامی نے گریجویشن کرنے کے بعد اردو ادب میں ایم اے کیا اور پھر درس و تدریس سے وابستہ ہوگئے۔ ان کی غزلیات اور قطعات کا مجموعہ 'جستجو' 2008 میں اور نظموں کا مجموعہ 'شانتی' 2018 میں منظر عام پر آیا۔ ان کی مطبوعات میں نعتیہ کلام کا مجموعہ 'یا صاحب الجمال' بھی شامل ہے۔

روزنامہ 'تصدیق' پٹنہ، 30 اپریل 2025

حافظ شمیم امروہوی

امروہہ: شہر کے مشہور نعت گو شاعر اور مسلم کمیٹی امروہہ کے اہم ستون حافظ شمیم امروہوی کا پاکبڑا کے ایک نجی ہسپتال میں دوران علاج انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین بعد نماز ظہر کیلسہ روڈ پر واقع ان کے آبائی قبرستان میں ہوئی۔ حافظ شمیم امروہوی بے حد خوش گلو بچپن سے ہی نابینا تھے لیکن لوگوں کی آواز سے شناخت ایک دم درست تھی وہ شاعر جن کی شہرت صرف امروہہ میں ہی نہیں پورے ملک اور بیرون ممالک میں بھی تھی شہر کی بے شمار محفلوں میں ان کی حاضری رہتی تھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 اپریل 2025

حافظ محمد اسلام انجم

سہارنپور: مغربی یوپی کے معروف خوش نویس اور شاعر حافظ محمد اسلام انجم کا فیمس اسپتال سہارنپور میں

انتقال ہوگیا۔ ان کے گلے میں کینسر تھا جس کی وجہ سے گلہ بند ہوگیا تھا۔ مرحوم ممتاز خوش نویس ظہیرالاسلام اسعدی کے شاگرد تھے۔ اوائل عمر میں جامعہ اسلامیہ ریڑھی تاجپورہ سے حفظ کرنے کے بعد کتابت کے فن سے وابستہ ہوگئے تھے۔ وہ مرحوم ظہیرالاسلام کے شاگرد ہوگئے تھے۔ عمر 50 سال خوش نویسی میں گذارے جب کہ طغریٰ نویسی کا بھی فن آپ کو خوب آتا تھا۔ شاعر کی حیثیت سے بھی ادبی اور شعری حلقوں میں ان کی خاصی پہچان تھی۔ نظمیں زیادہ کہتے تھے۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر 72 سال تھی، پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین لڑکے ہیں جو برسر روزگار ہیں ایک لڑکا سرکاری ٹیچر ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 مارچ 2025

اثر بہرائچی

بہرائچ: ہندوستان سے امریکہ تک ادبی دنیا میں

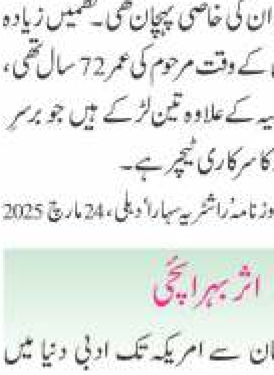

اپنے مخصوص لب ولہجہ اور مترنم آواز کی بنا پر اپنا منفرد مقام بنانے والے شاعر سید مبشر حسین 'اثر بہرائچی' کا تقریباً 80 سال کی

عمر میں 22 مارچ بروز سنیچر انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی نماز جنازہ بعد نماز عشا شہر کے محلّہ چکی میں واقع خانقاہ چھوٹی تکیہ سے متصل مدرسہ کے کیمپس میں پڑھی گئی اور تدفین چھوٹی تکیہ واقع قبرستان میں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر کافی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ مرحوم سید مبشر حسین 'اثر بہرائچی' کی تین کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ مرحوم ضلع کلکٹریٹ میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ سمیت دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ان کے انتقال پر معزز شخصیات نے خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 مارچ 2025

■

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

240 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................... بتاریخ.................................... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/240 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:magazines@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

قیام امن: ایک جستجو

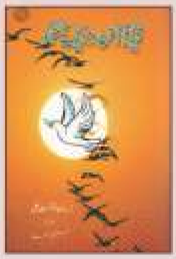

مصنف: زینت شوکت علی، مترجم: نسیم احمد

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 586+xxii

قیمت: 310 روپے

پریم چند: مطالعے کی نئی جہتیں

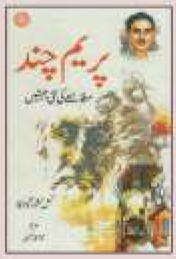

مصنف: کمل کشور گوینکا، مترجم: محمد صغیر حسین

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 283

قیمت: 165 روپے

سوانح عمری: حاجی محمد سمیع اللہ خان بہادر سی ایم جی

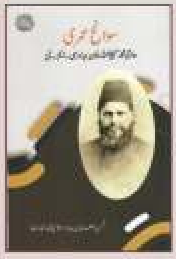

مصنف: شمس العلما خان بہادر مولوی محمد ذکاءاللہ

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 172+xii (حصہ اوّل)، 72+5 (دوم)

قیمت: 160 روپے

تنویر احمد علوی (مونوگراف)

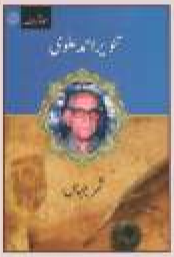

مصنف: ثمر جہاں

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 170

قیمت: 120 روپے

انسانی دماغ: کمپیوٹر اور تعلیم

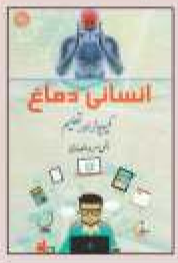

مولف: انس مسرور انصاری

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 100

قیمت: 35 روپے

کلیات سعادت حسن منٹو (جلد اوّل)

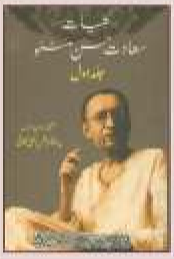

تحقیق، تدوین و ترتیب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

تیسرا ایڈیشن: 2025

صفحات: 596

قیمت: 330 روپے

سفینۃ الاولیا

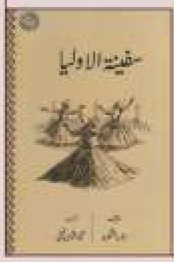

تالیف: داراشکوہ، ترجمہ: محمد عثمان غنی

پہلی اشاعت: 2025

صفحات: 280

قیمت: 195 روپے

تلفظ

مصنف: شکیل حسن شمسی

دوسرا ایڈیشن: 2025

صفحات: 184+xxiv

قیمت: 135 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, जून–2025,वर्ष:27, अंक:06
URDU DUNIYA Monthly, June-2025, Vol.27, Issue:06
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/05/2025
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in، پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6